خسرو نمبر

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم
خسرو
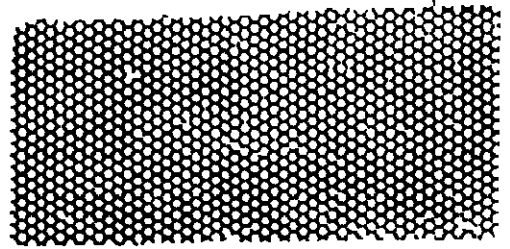
شبیہ حضرت امیر خسرو

دانی کہ بستم در جہان من خسرو شیریں بیان
گر نائی از بہر دلم بہر زبان من بیا
(خسرو)

حضرت امیر خسرو کا مزار

پس منظر میں امیر خسرو کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار پر انوار

حضرت امیر خسرو کے ہمعصر سات بادشاہ
سلطان جلال الدین محمد فیروز خلجی
سلطان غیاث الدین تغلق
قطب الدین مبارک شاہ خلجی
سلطان علاؤ الدین خلجی
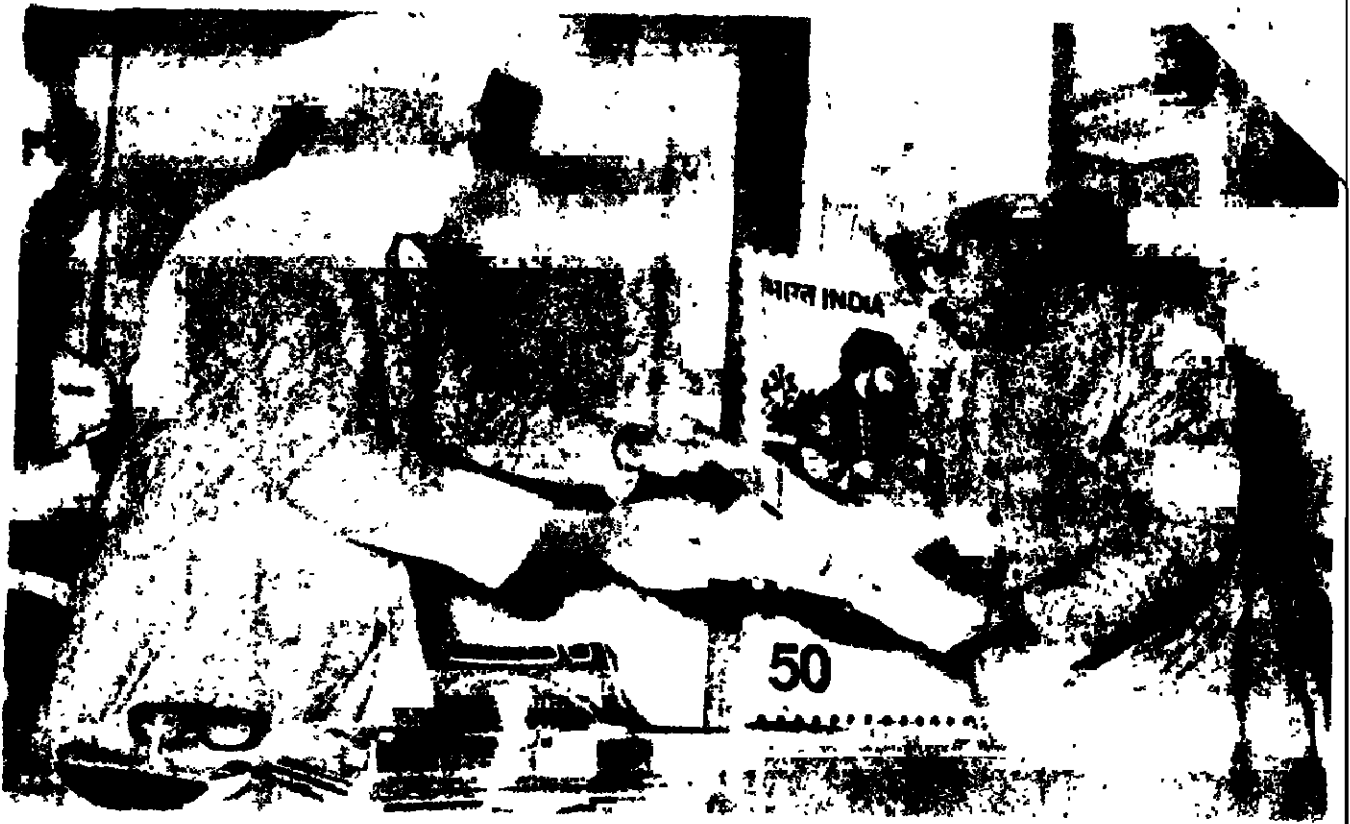
عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریۂ ہند امیر خسرو یادگاری ٹکٹ کی رسم اجرا انجام دے رہے ہیں
شری شنکر دیال شرما وزیر مواصلات ٹکٹ کا البم پیش کر رہے ہیں۔

عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریۂ ہند جو قومی تقاریب کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ ہیں امیر خسرو یادگاری جلد کو ملاحظہ فرما رہے ہیں۔
تصویر میں نواب علی یاور جنگ صدر کمیٹی اور حسن الدین احمد جنرل سکریٹری بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

امیر خسروؒ کے عرس میں شرکت کیلئے آنیوالے پاکستانی زائرین کا پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے واگہ سرحد پر استقبال

تصویر میں پاکستانی زائرین کے قائد اور چودھری طیب حسین خاں ایم۔پی چیرمین پنجاب وقف بورڈ

نیچے:

مولانا خلیل الرحمٰن ممبر پنجاب وقف بورڈ۔ غضنفر علی خاں صاحب ایڈیشنل سکریٹری۔ جی اے، ٹو ڈپٹی کمشنر امرتسر
پاکستانی زائرین کا استقبال کر رہے ہیں۔

حضرت امیر خسرو کی سات سو سالہ تقاریب کمیٹی کے زیرِ اہتمام ۲۳۔۲۴۔۲۵ جنوری ۱۹۷۶ء کو وگیان بھون میں

حضرت امیر خسرو پر بین الاقوامی سمینار کا انعقاد

حضرت امیر خسرو پر بین الاقوامی سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے عالی جناب فخر الدین علی احمد صاحب صدر جمہوریۂ ہند جناب بی۔ ڈی جتی نائب صدر جمہوریۂ ہند۔ دوسرے غیر ملکی معزز شرکاء کے ہمراہ تشریف فرما ہیں۔
جناب علی یاور جنگ صدر امیر خسرو قومی تقریب کمیٹی استقبالیہ کلمات فرما رہے ہیں

تصویر میں۔ امیر خسرو قومی تقریب کمیٹی کے اراکین۔ جناب بی۔ ڈی جتی نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ کشمیر سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ جناب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر۔ جناب پروفیسر نور الحسن وزیر تعلیم حکومت ہند جناب یونس سلیم ایم۔ پی جناب حسن الدین احمد بھی موجود ہیں۔

یکے از مطبوعات پنجاب وقف بورڈ
سہ ماہی
اوقاف
مدیر
حکیم اجمل خان
جلد ـــــ (۴)
شمارہ ـــــ (۱)
جنوری، مارچ ۱۹۷۶ء
اس شمارہ کی قیمت - ۶ روپے
مجلس ادارت
مولانا سعید احمد اکبرآبادی
پروفیسر عبدالمجید خاں
بیگم صالحہ عابد حسین
مولانا عبدالحمید رحمانی
ڈاکٹر قیام الدین احمد
مولانا خلیل الرحمان
اشتراکات:
سالانہ: ۱۲ روپے
فی شمارہ: ۳ روپے
ترسیل زر کا پتہ:
سکریٹری پنجاب وقف بورڈ (میگزین)
۵۰ سردار پٹیل مارگ، انبالہ کینٹ
خط و کتابت کا پتہ:
"اوقاف میگزین"
۵۰ سردار پٹیل مارگ، انبالہ کینٹ

خسرویات

مقالات

نظمیں

صفحہ ۱۱۹ سے لے کر ۱۳۰ تک۔

ماہر القادری	سید غلام سمنانی	شہباز صدیقی امروہوی
جمیل مظہری	غلام محی شہری	معتور سبزواری
مائز نظامی	[illegible]	مرغوب امین کاظمی
مظفر الدین خان	بشیر النساء بیگم بشیر	قمر سیوہاروی
جگن ناتھ آزاد	[illegible]	

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر حکیم اجمل خاں نے پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر ۵ سردار پٹیل مارگ دہلی کینٹ سے شائع کیا۔

مدیر

ہندوستانی عوام اور حکومت کے لئے یہ باعثِ صد افتخار ہے۔ کہ اس سال فارسی زبان کے سب سے بڑے ہندوستانی شاعر حضرت ابوالحسن یمین الدین امیر خسروؒ کی سات صد سالہ یادگار تقریبات نہایت اہتمام سے منائی جا رہی ہیں۔ تقریبات کے انعقاد و اہتمام اور خسرویات کی ترتیب و اشاعت میں جو اہلِ فن اور دانشور شرکت فرما رہے ہیں مبارک کے مستحق ہیں۔

سات صد سالہ یادگار تقریبات کے سلسلے میں اب تک جو پروگرام اور کوششیں سامنے آچکی ہیں۔ ان میں سب سے اہم چیز قومی سطح پر حضرت امیر خسرو تقریبات کمیٹی کا قیام ہے۔ عزت مآب جناب فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند اس کے سرپرست اعلیٰ اور جناب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر صدر ہیں نیز ممتاز قومی رہنما، اربابِ نظر، ادیب و دانشور کمیٹی کے عہدیدار و رکن ہیں۔ حضرت امیر خسرو کی شخصیت، فن، اور تعلیمات پر روشنی ڈالنے کے لئے کمیٹی کے سامنے وسیع المقاصد پروگرام ہیں جنھیں تدریجی طور پر بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ جو مساعی اب تک سامنے آچکی ہیں۔ ان میں حکومت ہند کی وزارتِ مواصلات کی جانب سے حضرت امیر خسرو کی یاد میں یادگاری ٹکٹ جاری کیا جا چکا ہے۔ وزارت اطلاعات و نشریات کے "ڈی، اے، وی، پی" نے ہندی، اردو، اور انگریزی میں شاندار باتصویر بروشر شائع کیا ہے، ترقی اردو بورڈ کی "امیر خسرو شناسی یادگاری مضامین کا مجموعہ" مرتبہ ظ، انصاری و ابوالفیض سحر، اور پبلیکیشنز ڈویژن کی جانب سے امیر خسرو پر انگریزی مجموعہ مضامین کی اشاعت خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

نیشنل آرکائز آف انڈیا، اور نیشنل میوزیم نے امیر خسرو کی کتابیں و مخطوطات کی نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ ڈاکٹر ملک محمد کی کتاب "امیر خسرو" (ہندی) جناب ڈاکٹر ظ، انصاری کی کتاب "امیر خسرو، احوال و آثار" جناب سلیم احمد صاحب کی کتاب "عہدِ خسرو" اور ایس۔ ایس لانبہ صاحب کی کتاب "نذرِ خسرو" بھی خسرویات میں شاندار اور قابل قدر اضافہ ہیں۔

ہمارے قومی جرائد نے اس موقعہ پر اپنے خصوصی نمبر شائع کئے جن میں ماہنامہ آجکل نئی دہلی، نیا دور یوپی لکھنؤ، قومی راج مہاراشٹر بمبئی اور برگ آوارہ حیدرآباد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان اشاعتوں میں حضرت امیر خسرو کی زندگی اور فن پر مختلف محققین نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ امسال حضرت امیر خسرو کے سالانہ عرس کی تقریبات حضرت نظام الدین دہلی میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئیں۔ ممتاز ادبا، شعرا، اور رہنمایانِ کرام نے شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ پاکستانی زائرین بھی عرس کی تقریبات میں شریک ہوئے جن کا پرتپاک خیر مقدم پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے واگہ بارڈر پر کیا گیا تھا۔

پنجاب وقف بورڈ نے حضرت امیر خسرو کے مشہور دیوان "بقیہ نقیہ" مرتبہ جناب حنا، اشاہ القادری کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ نیز اپنے جریدہ اوقاف میگزین کی اس خصوصی اشاعت کو حضرت امیر خسرو سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

اوقاف میگزین کی خصوصی اشاعت کی ترتیب میں یہ ملحوظ رہا ہے۔ کہ حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور فن کے تمام روشن پہلو قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔

چنانچہ حیاتِ خسرو کے عنوان سے علامہ شبلی مرحوم کا ایک طویل مگر تحقیقی مقالہ شریکِ اشاعت ہے حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور علامہ مرحوم کا قلم دونوں ہی منفرد ہیں۔

ممتاز قومی سکالر جناب ڈاکٹر تارا چند آنجہانی جو گلزارِ سعدی، حافظ، اور فردوسی کی سرزمین میں قیام پذیر رہ چکے ہیں، نے حضرت امیر خسرو کی ہندوستانیت، حب الوطنی، وفاداری، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔

ہمارے دوسرے لکھنے والوں میں ڈاکٹر خلیق احمد نظامی، جناب صباح الدین عبدالرحمان، جناب نثار احمد فاروقی، جناب حسن الدین احمد، جناب عتیق صفی، جناب صفاؔ، جناب محمد عمر جیسے مورخ، نقاد، محقق، مقالہ نگار، ادیب، و فن کار شریک ہیں۔ ان مقتدر شرکاء نے اپنے مقالات میں حضرت امیر خسرو کی شخصیت، فن، اور کردار کے مختلف گوشوں پر اچھی اور تحقیقی بحث کی ہے۔ جسے آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

حصۂ نظم میں جناب ماہرالقادری، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری، جمیل مظہری، سید غلام سمنانی، جگن ناتھ آزاد، شمیم کرہانی، مظفرالدین احمد جیسے ممتاز شعرائے کرام شریک ہیں نیز حضرت امیر خسرو کی تقریبات کے سلسلے کی تعداد بھی شامل کی جا رہی ہیں۔

حضرت امیر خسرو یقیناً اپنے عہد کی بے مثال اور عظیم شخصیت تھے جنھیں انسانیت اور فن میں کمال حاصل تھا۔ آپ ایک طرف حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے ہم نشین تھے۔ اور دوسری طرف اپنے ہم عصر شہنشاہوں کے درباری بھی، فارسی کے شاعر بھی اور ہندوی کے بھی۔ موسیقار بھی تھے اور نغمہ گو بھی۔ مرثیہ خواں بھی تھے، اور مثنوی نگار بھی! آپ کی انسانیت، اسلامیت، اور کمال فن کا اعتراف حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس طرح فرمایا ہے:

جو پوچھے گا خدا روزِ جزا، لایا ہے کیا تحفہ
تو کہہ دوں گا یہ خسرو ہے مرے اعمال کا ثمرہ

فن درباداری میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ سیرالاولیاء میں امیر خورد نے آپ کے کمال فن کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔

میں نے اپنے والد سے یہ بھی سنا ہے۔ کہ سلطان جلال الدین خلجی اپنے عہد دولت میں چاہتا تھا۔ کہ شیخ کبیر حضرت نظام الدین اولیاء سے ملے لیکن باوجود اس خواہش کے اجازت نہ ملی۔ آخر میں اس نے امیر خسرو سے جو اس کے مصحف دار تھے خفیہ طور سے یہ طے کیا کہ بغیر اجازت آپکی خدمت میں آتے۔ امیر خسرو نے یہ مناسب سمجھا کہ اس بات کو اپنے مرشد سے عرض کر دینا چاہئے۔ بادشاہ نے ان سے ایک بات خفیہ کہی تھی لیکن آپ کو خوف تھا۔ کہ آپ نے یہ بات شیخ کبیر سے چھپائی۔ تو وہ آپ سے رنجیدہ ہو جائیں گے کہ تم کو معلوم تھا تم نے مجھے کیوں نہیں آگاہ کیا۔ اس لئے امیر خسرو نے اپنی جان پر کھیل کر شیخ کبیر کو اطلاع دی۔ کہ کل بادشاہ آپ سے ملنے آئے گا۔ حضور فوراً اجودھن شیخ فرید کی زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب بادشاہ نے یہ سنا۔ تو امیر خسرو سے رنجیدہ ہوا۔ کہ تم نے میرے بھید کو کیوں ظاہر کر دیا۔ اور مجھے سعادت پائے بوسی سے محروم رکھا۔ امیر خسرو نے جواب دیا کہ بادشاہ کی خفگی سے خوف جان ہے۔ لیکن شیخ کی خفگی سے ایمان ضائع ہونے کا خوف ہے۔ بادشاہ مرد دانا تھا اس نے اس جواب کی تعریف کی۔"

قصیدہ گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا جس کی مثال ملک علاء الدین کشلی خاں عرف ملک چھجو کی شان میں لکھا گیا یہ مشہور قصیدہ ہے۔

چرخ را گفتم کہ خورشیدت کجاست   آسماں روئے ملک چھجو نمود

آپ انتہائی پُردرد، اور پُرسوز مرثیہ نگار تھے۔ سلطان محمد کی شہادت پر آپ نے ایک مرثیہ اسپ نامہ مرتب کر کے سنایا۔ جسے سن کر سامعین ہوش و حواس گم کر بیٹھے۔ ہندوستان کی فارسی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اتنا مقبول مرثیہ نہیں لکھا گیا۔

شہ دریں تدبیر و آگہ نے کہ تقدیر خدا   صفحۂ تدبیر را خط مشیت در کشید

اسی مرثیہ کے بعد آپکی غیر معمولی مقبولیت شروع ہوتی۔ پھر قرآن السعدین لکھی تو ملک الشعراء بن گئے۔ اور جب جلال الدین خلجی کے کارناموں پر مفتاح الفتوح ترتیب دی تو امیر کا خطاب مل گیا۔ ایک اندازے کے مطابق حضرت امیر خسرو نے چار لاکھ اشعار کہے ہیں۔ اشعار کی اتنی بڑی تعداد ایرانی شعرا کے ہاں بھی نہیں ملتی پھر اشعار بھی ہر قسم کے، جن سے مورخین تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ ادیب فن کی باریکیاں نکالتے ہیں۔ صوفیا سلوک کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ موسیقار سُروں کے انداز تلاشتے ہیں۔ اور انگشت بدنداں رہتے ہیں

دانی کہ ہستم در جہاں، من خسرو شیریں بیاں
گر نائی از بہر دلم، بہر زبانِ من بیا

امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کے صدر، اور اراکین اس بات کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی اس عظیم شخصیت حضرت امیر خسرو کی حیات اور فن پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمنار کے انعقاد کا اہتمام وگیان بھون نئی دہلی میں کیا جس میں سینکڑوں ملکی و غیر ملکی ادیب، دانشور اور رہنما شریک ہوئے کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ عزت مآب فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند نے اس سیمنار کا افتتاح فرمایا جو بہت کامیاب رہا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم اس سیمنار کے مبارک موقعہ پر اوقاف کی اس اشاعت خاص کو قارئین کرام اور سیمنار کے شرکاء کی خدمت میں پیش کر سکیں گے مگر افسوس اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔

میں جناب حسن الدین احمد صاحب سکریٹری حضرت امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کا شکر گذار ہوں۔ کہ آپ نے اوقاف کی خصوصی اشاعت حضرت امیر خسرو نمبر کے لئے ہمیں متوجہ کیا۔ اور اس کے لئے مضامین و تصاویر کا انتخاب و اہتمام بھی فرمایا۔

اوقاف میگزین کی یہ اشاعت خاص اپنے موضوع پر ہرگز کوئی معرکہ نہیں ہے۔ لیکن نشانِ راہ کا کام ضرور دے سکتی ہے۔ امید ہے کہ شائقین ہماری اس حقیر پیشکش کو قبول فرمائیں گے۔

ولادت و تعلیم

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے۔ حضرت امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں۔ ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے۔ ترکستان میں ایک شہر کش ہے۔ وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ فرشتہ۔ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ بلخ کے امرا میں سے تھے۔ چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو... سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوئے۔ محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا۔ ایک مہم میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے۔

لیکن صاحب بہارستان سخن۔ تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں۔

> پس آنچہ دولت شاہ در تذکرۂ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را از رحق دے قصائد فرا است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادۂ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بعلت اشتراک رسمی محمد تغلق خیال کردہ۔

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے۔ اعزالدین علی شاہ حسام الدین اور امیر خسرو۔ سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر صاحب کی عمر ۷ برس کی تھی۔ امیر صاحب کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اور دس ہزار فوج کے افسر تھے۔ امیر صاحب ۶۵۰ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا۔ مجذوب صاحب کے کمالات کا ہم انکار نہیں کرتے۔ لیکن ان کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے۔ خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت۔

جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر صاحب کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی۔ جو کچھ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے۔ اور وصلیوں پر اسی کی مشق کرتے تھے۔ خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے۔ وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کو بلا لیا کرتے تھے۔ ایک دن بلایا تو امیر صاحب بھی ساتھ گئے۔ خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزالدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ موزوں کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے کہ نہیں؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سن لیجئے۔ خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ امیر صاحب کو دی کہ کوئی شعر پڑھو۔ امیر صاحب نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا۔ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور سب نے بے انتہا تحسین کی۔ ان کے استاد نے کہا شعر گوئی میں امتحان لیجئے۔ خواجہ عزالدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو۔ مو۔ بیضہ۔ تیر۔ خربزہ۔ امیر صاحب نے برجستہ کہا۔

> ہر موئے کہ در دو زلف آن صنم است
> صد بیضۂ عنبریں بر آن موئے ضم است
> چون تیر بدان راس دلش را زیرا کہ
> چون خربزہ دندانش درون شکم است

---

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں امیر خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے یہ تمام واقعات تاریخ سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زا ہیں لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا۔ اب ایٹہ ہے کسی زمانہ میں دریائے گنگ اسکے نیچے بہتا تھا لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے۔ یہاں اب اسٹیشن بھی ہے۔

[3] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔

خواجہ عزالدین کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا خسرو۔ باپ کا نام پوچھا انھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا یعنی لاچین۔ خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی "چین نہیں" پھر کہا "ترک خطاست" یعنی ان کو ترک کہنا خطا ہے؟ انھوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا "بے خطا ترک است" یعنی قطعاً وہ ترک ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا چوں کہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے اس لئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہئے۔ چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔[1]

امیر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵ یا ۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے۔

درباری تعلقات

امیر خسرو صاحب سن رشد کو پہونچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن مسند نشین تھا۔ جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا۔ اس کے امرائے دربار میں سے کشلو خاں معروف بہ چھجو[2] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا وہ سلطان کا بھتیجا اور باربکی کے عہدے پر مامور تھا۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ اور مصر۔ شام۔ روم۔ بغداد عراق خراسان ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا۔ یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

امیر صاحب کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ سب سے پہلے اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں۔

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح   ہمدمی با د عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است   آسماں روئے ملک چھجو نمود

امیر صاحب نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے۔

ز شاہاں کسے کاو دلم کرد یاد   معزالدنیا بود شہ کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا۔ کشلو خاں امرا میں سے تھا۔ بادشاہ نہ تھا بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر صاحب کی قدر دانی کی وہ معزالدین کیقباد تھا۔ امیر صاحب اکثر کشلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لے جاتے اور مجلس گرم کرتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے شمس الدین دبیر۔ اور قاضی اثیر جو مشہور شعراء میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے۔ امیر صاحب نے اپنی زمزمہ سنجی سے وہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا۔ اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپے دیئے۔ کشلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستہ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوتے۔ امیر صاحب نے اس کے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی لیکن کشلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی۔

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا۔ امیر صاحب نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا۔ بغرا خاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم خاص بنایا اسی زمانہ یعنی ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔ بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا۔ امیر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دہلی واپس آیا اور بنگال کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی۔ امیر صاحب کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا۔ دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے۔ لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ رخصت لے کر دلی میں آئے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا۔ وہ نہایت قابل۔ صاحب علم۔ فیاض اور قدر دان علم و فن تھا تہذیب و متانت کا یہ حال تھا۔ کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ۔ دیوان خاقانی۔ انوری۔ خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بیاض جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کئے تھے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے[3] ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے۔ یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دفاتر

---

[1] یہ تمام حالات اپنے امیر صاحب نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں۔ [2] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں۔ امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خاں عرف چھجو کے دربار میں پہونچا اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں (بدایونی صفحہ ۸۵ جلد اول) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ اور سلطان معزالدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد بن ابزالدین سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا۔ سلطان نے اس کو باربک مقرر کرکے خان اعظم کشلی خاں کا خطاب دیا۔ بدایونی ص ۱۴۲ میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ اس کو کشلو خاں خطاب ملا تھا۔ ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین کشلو خاں چھجو ایک ہی شخص ہیں۔

[3] یہ تمام حالات خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ [4] تاریخ فرشتہ [5] امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے۔ اور ایک سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ بہت غلط اور بہ کچھ بالکل مسخ ہے۔

ہوا اور امیر علی نمودی۔ امیر علی کے بعد امیر صاحب کے ہاتھ آئی۔[1] اب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے۔ (تاریخ فرشتہ)

امیر صاحب کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا۔ سلطان محمد نے اُن کو بلا کر شعرا کے زمرہ میں داخل کیا۔ اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو گیا تو ان کو اور ان کے ساتھ خواجہ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خاں ایران کا حکمران تھا۔ اس کے امرا میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لے کر لاہور اور دیبال پور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا۔ سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکل کر تیمور خاں کو شکست دی لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ ایک تالاب کے کنارے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا۔ موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا۔ سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور چار بار ان کو شکستیں دیں۔ لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھا کر مر گیا۔[2]

امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے چنانچہ تاتاری ان کو گرفتار کر کے بلخ لے گئے۔ یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا۔ امیر صاحب نے نہایت پُر اثر مرثیے لکھے اور دلی بھیجے۔ مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر توجہ کرتے تھے۔ چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید ... آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ زا ... رخنۂ کامال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل زباد ... برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلق شد رواں در چار سو ... ہیچ آبے دیگر اندر ملتاں آمد پدید
جمع شد سیارہ در چشم مگر طوفاں شود ... چوں بہ برج آبی انجم را قراں آمد پدید
من نجاہم جز بہ جاں جمعیت دایں کے شود ... خود محال ست ایں بنات النعش پروین شود
تا چہ ساعت بود کہ شاہ از ملتاں لشکر کشید ... تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید
آنچہ حاضر بود لشکر بے لشکر دیگر بجست ... زانکہ رستم را نشاید منت لشکر کشید
چوں جگر بندش از دشمن بداں قوت کہ داشت ... بے محابا چشم در سر کرد و درایت بر کشید
یک شش از ملتان فتح تا بہ لاہور اوفتاد ... یعنی اندر عہد من کافر تو اندر سر کشید
آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خون شاں ... کز زمیں باید شفق را گونۂ احمر کشید
بعد ازیں تدبیر و آگہ نے کہ تدبیر فلک ... صفوۂ تدبیر را خط مشیت در کشید

تا چہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
میگذشتند جوق جوق از آب ناگہ در کشید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے۔ اخیر کے بند۔ جہاں شاہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پر اثر ہیں۔

دو برس کے بعد امیر صاحب نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی اور دلی میں آئے۔ خان شہید کے مرنے پر جو نوحہ لکھا تھا غیاث الدین بلبن کے دربار میں جا کر پڑھا۔ دربار میں کہرام پڑ گیا کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ سلطان اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا۔

امیر دلی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلاف وصیت۔ اس کے پوتے کیقباد کو جو بغرا خاں کا بیٹا تھا تخت نشین کیا۔

کیقباد نے امیر صاحب کو دربار میں طلب کیا۔ لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ امیر صاحب سے صاف نہ تھا۔ امیر صاحب نے تعلق پسند نہ کیا اور خان جہاں جو امرائے شاہی میں تھا۔ اس کی ملازمت اختیار کی خان جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر صاحب کو ساتھ لے گیا چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں۔

خان جہاں حاتم مفلس نواز ... گشت باقطاع اودھ سرفراز
من کہ بدم چاکر اوپیش ازاں ... کرد کرم آنچہ کہ بد بیش ازاں
تا زچناں بخشش خاطر فریب ... بندہ شدہ لازمۂ آں رکیب
در اودم بردہ ز لطف چناں ... کیست کہ از لطف بتابد عناں
در اودھ از بخشش او تا دو سال ... ہیچ غم و نالہ نبود از منال

دو برس تک اودھ میں رہے۔ ان کی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی وہ دلی میں تھیں۔ اور ان کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ امیر صاحب کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے۔ ماں نے گلے سے لگایا۔ اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے

مادرم آں خستۂ تیمار من ... چوں نظر افگند بہ دیدار من
پرده ز روئے شفقت برگرفت ... اشک فشاناں بہ درم درگرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی۔ اس کا باپ بغرا خاں بنگال میں تھا۔ یہ حالت سن کر بنگال سے روانہ ہوا۔ کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کر کے دلی سے روانہ ہوا۔ راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے۔ آخر صلح پر خاتمہ ہوا اور کیقباد دلی کو واپس گیا۔

امیر صاحب نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد ... زہے عہد خوش چوں دو جہاں یکے شد
پسر بادشاہے۔ پدر نیز سلطاں ... کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد
ز مہر جہانداری و بادشاہی ... جہاں رادہ شاہ جہاناں یکے شد
یکے ناصر عہد محمود سلطاں ... کہ فرمانش در چار ارکاں یکے شد
دگر شہ معز جہاں کیقبادے ... کہ در ضبطش ایران و توراں یکے شد

---

[1] تاریخ فرشتہ [2] بدایونی صفحہ ۱۲۱

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں۔ امیر صاحب کو بلا کر خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ امیر صاحب نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی۔ جس میں باپ بیٹے کی مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس وقت امیر صاحب کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور ۶۸۸ھ تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

ساختہ گشت از روش خامۂ　　از پس شش ماہ چنیں نامۂ
در رمضاں شد بسعادت تمام　　یافت قران نامۂ سعدین نام
آنچہ بتاریخ زہجرت گزشت　　بود پس شش صد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بر رسی　　راست بگویم ہمہ شش بود و سی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مر گیا یا مارا گیا اس کے بعد اس کا خرد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا وہ بالکل بچہ تھا تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اتار کر قید کر دیا۔ اب خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا۔ اس لئے ترکی امرائے درباریں سے ملک فیروز شایستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔ اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا۔ تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ بڑے عظمت و اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی نہایت صاحب مذاق۔ رنگین طبع۔ خوش صحبت تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں۔

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم　　داں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بلے پیر سند خواہم یک شب بکنار آئی　　ہاں بانگ بلندست ایں پوشیدہ نمی خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے۔ سب قابل۔ اہل فن موزوں طبع اور رنگین مزاج تھے۔ مثلاً ملک تاج الدین کرجی۔ ملک فخر الدین۔ ملک اعز الدین۔ ملک قرابیگ۔ ملک نصرت ملک صبیب۔ ملک کمال الدین۔ ابو المعالی۔ ملک نصیر الدین کرانی۔ ملک سعد الدین۔ انیس اور ہم صحبت تھے۔

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے۔ چنانچہ تاج الدین عراقی۔ خواجہ حسن دہلوی۔ مؤید جاجرمی۔ مؤید دیوانہ۔ امیر۔ ارسلاں۔ اختیار الدین باقی۔ ندمائے خاص میں تھے۔ ساقی۔ مغنی۔ اور مطرب بھی وہ لوگ تھے مثلاً امیر خاصہ۔ حمید۔ راجہ۔ نظام۔ محمد شاہ۔ نصیرخاں۔ بہروز۔

ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر صاحب سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا وہ عالم بھی تھے۔ فاضل بھی۔ مغنی بھی۔ مطرب بھی۔ اور شاعر تو تھے ہی۔ معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا اسی وقت اس نے امیر صاحب کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کر کے خاص اپنا لباس عنایت کیا تھا تخت پر بیٹھا تو امیر صاحب کو ندیم خاص بنایا اور مصحف داری[2] اور عمارت کا عہدہ دیا۔ اس کے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا ان کے لئے مقرر کیا۔ امیر صاحب امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

امیر صاحب نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے اور تاج الفتوح نام رکھا۔ اس کی تفصیلی کیفیت آگے آئے گی۔ جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرا دیا۔ اور خود تخت نشین ہوا۔ سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اس کی طینت کا جوہر تھا۔ تاہم بہت بڑے عزم و استقلال۔ شوکت و شان کا فرمانروا گذرا ہے تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ اس کا دربار فقرا۔ علماء۔ فضلاء۔ شعرا سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں[3]۔

قاضی فخر الدین ناقلہ۔ قاضی فخر الدین کرمانی۔ مولانا نصیر الدین غنی مولانا تاج الدین مقدم۔ قاضی ضیاء الدین۔ مولانا ظہیر الدین لنگ۔ مولانا ظہیر الدین بھکری قاضی زین الدین ناقلہ۔ مولانا شرکتی۔ مولانا نصیر الدین رازی۔ مولانا علاء الدین صدر شریف۔ مولانا ہیراں بابک کلہ۔ مولانا نجیب الدین سیانوی۔ مولانا شمس الدین۔ مولانا صدر الدین۔ مولانا علاء الدین لاہوری۔ قاضی شمس الدین کازرونی۔ مولانا شمس الدین یحییٰ۔ مولانا شمس الدین۔ مولانا صدر الدین بادہ۔ مولانا معین الدین لوی۔ مولانا افتخار الدین رازی۔ مولانا میر الدین اندرپتی۔ مولانا نجم الدین۔ مولانا حمید الدین بلورمی۔ مولانا علاء الدین کرک۔ مولانا حسام الدین سادہ۔ محی الدین کاشانی۔ مولانا کمال الدین کولوی۔ مولانا وجیہ الدین کابلی۔ مولانا منہاج الدین۔ مولانا نظام الدین کلاتی۔ مولانا نصیر الدین کرسی۔ مولانا نصیر الدین یحییٰ۔ مولانا علاء الدین تاجر۔ مولانا کریم الدین جوہری۔ مولانا محب ملتانی۔ مولانا حمید الدین۔ مولانا برہان الدین بھکری مولانا افتخار الدین۔ مولانا حمید الدین ملتانی۔ مولانا گل محمد شیرازی۔ مولانا حسام الدین سرخ۔ مولانا شہاب الدین ملتانی۔ مولانا فخر الدین نسوی۔ مولانا فخر الدین شقاقلی۔ مولانا علیم الدین۔

قراء مولانا شاطی۔ مولانا علاء الدین مقری۔ خواجہ زکی۔

واعظین مولانا حسام الدین درویش۔ مولانا شہاب الدین۔ مولانا کریم۔

شعراء خواجہ حسن دہلوی۔ صدر الدین عالی۔ فخر الدین قواس۔ حمید الدین راجہ۔ مولانا عارف عبد الحکیم۔ شہاب الدین۔ لیکن امیر صاحب کے آفتاب کمال نے ان ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر صاحب کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں وہ بھی امیر صاحب ہی کا فیض ہے۔ علاء الدین نے امیر صاحب کا ایک ہزار سالانہ تنکہ[4] مقرر کیا تھا۔ امیر صاحب نے سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا جس کا نام خزائن الفتوح ہے تفصیل آگے آئے گی۔

۶۹۸ھ میں امیر صاحب کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال

---

[1] تاریخ فرشتہ　[2] جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اس کو مصحف دار کہتے تھے۔　[3] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے　[4] تاریخ فرشتہ۔ غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا۔

کیا۔ لیلیٰ مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُردرد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے۔ نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا۔ چنانچہ ہر کتاب سلطان علاؤ الدین کے نام سے صاحب سے آخری مثنوی ہشت بہشت ہے جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی۔

اسی زمانہ میں امیر صاحب نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے ہاتھ پر بیعت کی تفصیل آگے آئے گی۔ سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین (مدت حکومت ۳۵ دن) اور اس کے بعد ۷۱۶ھ میں قطب الدین مبارک بن علاء الدین خلجی بادشاہ ہوا۔ وہ اگرچہ نہایت عیاش بے مغز اور سبک سر تھا۔ لیکن امیر صاحب کی قدر دانی سب سے بڑھ کر کی۔ چنانچہ امیر صاحب نے جب ۷۱۸ھ میں اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپیہ دیئے۔ خود امیر صاحب قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں۔

بتاریخ ہم چوں من اسکندرے   کند ہر کہ آرایش دفترے
ز گنج گراں مایۂ بے شمار   دہم بار پیلش نہ آں پیل بار
مرا خود دریں رہ پدر شد دلیل   کہ میداد زر ہم ترازوے پیل
ثنا سد کسے کش خرد رہنمون   کہ از پیل بارست ارزش فزون
چو میراث شد پیل زر داد نم   نہ زیباست زیں اہل تر داد کم
شہا گنج بخشا کرم گسترا   معانی شناسا سخن داد را
چنیں بخششے کز تو جم یافتم   دلا ماہ پشینہ کم یافتم
کنوں لا بد از سحر سنج چو من   بہ اندازہ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دے کر قلمدان وزارت عطا کیا تھا۔ اس نے ۷۲۰ھ میں قطب الدین کو قتل کر کے خود تخت حکومت پر جلوس کیا۔ چوں کہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کئے۔ امراء نے بغاوت کی۔ چنانچہ چار مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۰ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے (جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی۔) دربار میں پکار کر کہا کہ مجھ کو تخت سلطنت کی آرزو نہیں۔ خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن چوں کہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا۔ اس لئے سب نے بہ اتفاق اسی کو بادشاہ بنایا۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں۔ تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے۔ امیر صاحب کی اس نے نہایت قدر دانی کی اور ان کو مال و دولت سے نہال کر دیا۔ امیر صاحب نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا۔ چنانچہ اس کے نام پر تغلق نامہ لکھا۔ جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے۔

وفات، اعزہ و اولاد

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر صاحب ساتھ گئے۔ تغلق واپس آیا لیکن امیر صاحب وہیں رہ گئے۔ اسی اثنا میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے انتقال کیا۔ امیر صاحب یلغار کرتے ہوئے دلی میں آئے۔ اور جو کچھ زر و مال پاس تھا خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر دیا۔ اور سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے۔ چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا۔ خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا۔ لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنی چاہی۔ لیکن ایک خواجہ سرا نے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا۔ غرض خواجہ صاحب کی پائنتی دفن کیا۔ اور اس سے بڑھ کر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔ ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امراء میں سے تھا تعمیر کرایا اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ لکھ کر لوح پر کندہ کرائی۔

شد عدیم المثل یک تاریخ او   واں دگر شد طوطی شکر مقال

امیر صاحب کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی۔ ان کے صاحبزادے کا نام ملک احمد ہے۔ وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے۔ ان کی شاعری نے چنداں فروغ نہیں حاصل کیا لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے۔ اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے۔ اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اس کو تسلیم کرتے تھے۔ ظہیر کا شعر ہے۔

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ   ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب چست ہو گئی۔ بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے۔

ایں سہل سہل بود کہ گر در بر خوانت   گر نان خواجہ خواستی آں را چہ کردمے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی۔

ایں سہل سہل بود کہ آب حیات خواست   گر نان خواجہ خواستی آں را چہ کہ

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا۔ ایک اور شعر تھا۔

گر شک خواند خاک درت را فلک مرنج   زیرا کہ سر بہ طعن خریدار افگند

ملک موصوف نے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا۔

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر صاحب کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے یہ لکھا کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اس لئے بادشاہ اور درباری ان کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے۔

امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا۔ جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں۔

اے زعفت فگندہ برقع نور   ہم عفیفہ بنام و ہم مستور
کاش ماہ تو ہم پسر بودے   در رحم طفل ہشت مہ بودے
نیک چوں دادہ خدا انکار است   با خدا دادگاں ستیزہ خطاست

من پذیرفتم آنچہ یزداں داد　　کانچہ او داد باز نتواں داد
پدرم ہم ز مادر است آخر　　مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم پیدا نہ ہوتیں۔ یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیئے کو کون ٹال سکتا ہے۔ اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا۔ اور میری ماں بھی تو آخر عورت تھی۔

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی حالت بہت پست تھی۔ امیر صاحب اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے۔ لیکن بیٹی سے کہتے تھے کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا۔ اور کبھی کوٹھے سے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر نہ جھانکنا۔

دوک دسوزن گذاشتن نہ فن است　　کالت پردہ پوشی بدن است
پا بداماں عافیت سر کن　　رو بدیوار و پشت بر در کن
ور تماشائے روزنت ہوس است　　روزنت چشم سوزن تو بس است

امیر صاحب کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ بڑی عمر کو بھی پہونچ کر وہ اس جوش محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں اودھ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلّی میں تھیں اور اُن کو یاد کیا کرتی تھیں۔ اودھ سے جب دلّی میں آتے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے۔

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے۔ چنانچہ دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں ۶۹۸ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔ یلی مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے۔

امسال دو نور ز اخترم رفت　　ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من　　گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد بیم　　چرخ از دو طمانچہ کرد بیم
ماتم دو شد و غم دو افتاد　　فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چوں منے را　　یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دو بار برنگیرد　　یک سر دو خمار برنگیرد
چوں مادر من بزیر خاک است　　گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر　　روئے از چہ نمی نمائی آخر
خنداں ز دل زمین بروں آئے　　بر گریہ زار من ببخشائے
ہر جا کہ ز پائے تو غباریست　　ما را ز بہشت یادگاریست
ذات تو کہ حفظ جان من بود　　پشت من و پشتبان من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود　　پند تو صلاح کار من بود
امروز منم بہ مہر پیوند　　خاموشی تو ہمی دہد پند

فقر وتصوف

اڑتالیس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے۔ اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خون جگر سے رنگین ہیں۔

امیر صاحب اگرچہ خاندان کے اثر سے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے لیکن یہ امر اُن کی اصل فطرت کے خلاف تھا درباداری۔ خوشامد اور شخص پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے۔ لیلےٰ مجنوں ۶۹۰ھ میں لکھی تھی۔ جب ان کو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

شب تا سحر و ز صبح تا شام　　در گوشۂ غم نگیرم آرام
با شحنۂ زبر لے نفس خود را　　پیش چو خودے ستادہ برپائے

اس پر مزید یہ ہوا کہ ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لئے بیعت کرادی تھی۔ حضرت خواجہ کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی۔ امیر صاحب کی طبیعت میں عشق ومحبت کا مادہ بھی ازلی تھا۔ وہ سرتاپا عشق تھے۔ اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی۔ آخر یہ نوبت پہونچی کہ ۷۱۲ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی۔ اور مریدان خاص میں داخل کیا۔ نعمت اللہ قدرت نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹا دیا اور پابدامن ہو کے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب سے امیر صاحب کی ارادت اور عقیدت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی۔ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کردوں گا۔ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے۔ الٰہی! بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو صاحب بھی حاضر تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو!

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر صاحب نے اُس کی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا۔

ما قبلہ راست کردیم بر طرف کجکلاہے

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے۔ میں نے اس کا شان نزول پوچھا۔ ملا علی احمد مہرکن نے واقعہ بیان کیا۔ مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ غش کھا کر گرے، دیکھا تو دم نہ تھا[1]

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۸۱۔ مطبوعہ علی گڈھ۔

خواجہ صاحب نے امیر صاحب کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا۔ اور اسی لقب سے پکارتے تھے۔ امیر صاحب نے جا بجا اس پر فخر کیا ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں۔

برزبانت چو رفت خطابے بندہ ترک اللہ نوشت   دست ترک اللہ بگیر و ہم ہو ایش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا۔

امیر صاحب نے تصوف میں جو مدارج حاصل کئے اُن کو نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر صاحب کا ہر شعر جو جلیاں گراتا ہے وہ آتش وادیٔ ایمن کی شرر باریاں ہیں۔

امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نانبائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر صاحب کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گزرے۔ آفتاب حسن کی شعاعیں ان پر بھی پڑیں۔ وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو۔ حسن نے کہا کہ ایک پلڑے پر روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے میں سونا رکھے۔ سونے کا پلڑا جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں۔ امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو۔ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد اور نیاز لیتا ہوں۔ اس انداز گفتگو نے امیر صاحب کو اور بھی بے اختیار کر دیا۔ فوراً نظام الدین اولیاء کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ حسن نے گو ناز دلبرانہ کی تھی لیکن خود بھی شکار ہو گئے۔ اسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اپنے دل دادہ (امیر خسرو) سے ملے۔ اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے [۱]

امیر صاحب سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے۔ امیر صاحب نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے۔ چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو امیر صاحب کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی امیر صاحب نے اس واقعہ پر غزل لکھی۔

زیں دل خود کام کار من برسوائی کشید   خسروا فرمان دل بردن نمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر صاحب کے ملنے سے منع کر دیا۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے۔ حسن سیدھے امیر صاحب کے پاس گئے۔ خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا۔ نہایت متحیر ہوا اور امیر صاحب کو بلوا بھیجا۔ آئے تو کہا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہاتھ نکال کر دکھایا اور کہا۔

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں امیر صاحب کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے [۲]

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے۔ اور صنف غزل پر ان کا خاص احسان ہے۔ اس لئے ان کے شیدائی۔ امیر صاحب ہی کے تذکرہ میں ان کے اشعار درج کرتے ہیں۔

خلق گویند۔ دل از صبر۔ بجا آور باز   ایدل۔ از صبر نشانے وہ اگر جائے ہست
اے کہ نظارۂ دیوانہ نگردی ہرگز   قدمے رنجہ کن ایں سوئے کہ سودائے ہست

ہر چوں تو کسے دگر گزیدن   کارے دگر ست کار من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من   ایں از فلک است از حسن نیست

باز ایں دلم بسوئے دلارام میرود   از دام جست۔ باز سوئے دام میرود
ایام در نیامدہ باما بدوستی   واں شوخ ہم بہ سیرت ایام میرود

اے خواجہ در محلہ تقوی قیام گیر   در کوئے عاشقی تو حسن نیکنام شد
عقلم کہ زیں ہر ابلق ایام می نہاد   آخر بتازیانہ عشق تو رام شد

طرفہ سروکار است کہ با دعدۂ معشوق   صابر نتواں بود و تقاضا نتواں کرد

از حسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست   ایں سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

دوسہ بار بالگفتم کہ مرا ببیچ بستان   نہ شد اتفاق۔ شاید کہ باایں بہا نگیری

منع کردم جانیاں را خواب   زاں دعا کہ مستجاب نبود
اے حسن یار گر خطائے کرد   ہم شکایت ازو صواب نبود

بہ تقوائے نام نیکو بردہ بودم   نکو رویاں۔ مرا بدنام کردند
گفتی کہ چرا حال دل خویش نگوئی   من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند؟

---

[۱] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے۔ لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی "بقیاس چناں در می آید کہ حسن را بسبب امیر خسرو گو نہ تقدم باشد۔ چہ میر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن قصائد غراست و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کتر بتواں یافت"۔

[۲] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں۔ لیکن آخر کا واقعہ آج کل کون تسلیم کرے گا۔

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز ۔ اور جذب و اثر ان کے کلام میں موجود ہے ۔ ان کے کشتۂ محبت (امیر صاحب) میں بھی نہیں ۔

جامعیت کمالات

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا ۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ۔ ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے ۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے ۔ فردوسی ۔ سعدی ۔ انوری ۔ حافظ ۔ عرفی ۔ نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں ۔ لیکن ان کی حدود حکومت ۔ ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی ۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے ۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا ۔ حافظ عرفی ۔ نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے ۔ لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل مثنوی قصیدہ ۔ رباعی سب کچھ داخل ہے ۔ اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تنقیص ۔ مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں ۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا ۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے ۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہے ہیں ۔ لیکن امیر صاحب کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں ۔ اکثر تذکروں میں خود امیر صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے ۔ لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے ۔ امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورے میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جابجا نظر آتی ہیں کہ اس قدر .... مبین ہیں ۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر صاحب کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے ۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں ۔

مختلف زبانوں کی زباں دانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے عربی میں اہل عرب کے ہمسر ہیں ۔ سنسکرت کے ماہر ہیں ۔ چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے ۔

من قدرے بر سر این کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے ۔ اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے ۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی ۔ اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر لگا دیا ۔ لیکن ان کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے ۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ۔ ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا چنانچہ اس کی تفصیل مستقل عنوان میں آئی ہے ۔

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا ۔

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا ۔ تو سخت حیرت ہوتی ہے ۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباریوں میں تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی یہ کام جو سپرد تھا ۔ وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اشغال تھے ۔ لیلےٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں ۔

مسکین من مستمند مدہوش | از سوختگی چو دیگ پر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رائے | پیش چو خودے ستادہ بر پائے

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں ۔

تا خون نہ رود ز پائے تا سر | دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا ۔ کھانا کھانے کو نہیں ملتا ۔

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا ۔

کمال موسیقی

امیر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا ۔ ان کے زمانہ کا مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا نایک گوپال تھا ۔ اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح اٹھا کر لے چلتے تھے ۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا ۔ امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں ۔ نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کی جائے ۔ نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا ۔ ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے ۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا ۔ ان سے گانے کی فرمائش کی ۔ امیر صاحب نے کہا مغل ہوں ۔ ہندوستانی گانا یوں ہی سا جانتا ہوں ۔ پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا ۔

گوپال نے گانا شروع کیا ۔ امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں ۔ پھر خود اس کو ادا کیا ۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا ۔ امیر صاحب نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں ۔ غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا امیر صاحب اس کو اپنا ایجاد ثابت کر جاتے تھے ۔ بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے ۔ اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں ۔ پھر جو گانا شروع کیا تو گوپال .... مبہوت ہو کر ....

موسیقی

امیر صاحب چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے واقف تھے اس لئے انہوں نے دونوں موسیقی کو ترغیب دے کر ایک نیا علم پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان کے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[1]

نام راگہائے مخترعہ امیر خسرو کن راگوں سے مرکب ہے۔

مجیر — غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے

سازگری — پوربی۔ گورا۔ کنگلی۔ ایک فارسی راگ قرآن السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نوزمہ سازگری در عراق کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق

ایمن — ہنڈول اور نیریز

عشاق — سارنگ اور بسنت اور نوا

موافق — ٹوڑی و مالری و دوگاہ و حسینی

غنم — پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے۔

نیلف — کھٹ راگ میں سے ناز کو ملایا ہے۔

فرغنہ — کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے۔

سرپردہ — سارنگ۔ بلاول۔ اور راست کو ترکیب دیا ہے۔

باخرز — دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے۔

فردوست یا پھردو — کانہڑا۔ گوری۔ پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

منم — کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے۔

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری۔ باخرز عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے۔ باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کر کے دوسرا نام رکھ دیا ہے۔ قول۔ ترانہ۔ خیال۔ نقش۔ نگار۔ بسیط۔ تلانہ۔ سوہلے۔ یہ سب بھی امیر صاحب کی ایجاد ہیں۔ ان میں سے بعض خاص ان کی ایجاد ہیں۔ بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے۔ امیر صاحب نے ان میں کچھ تصرف کر کے نام بدل دیا۔

تصانیف جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ امیر صاحب نے خود کسی کتاب میں تحریر کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔

امیر صاحب کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن بیانات بالا مبالغہ سے خالی نہیں۔ چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے۔ اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے۔ اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴ - ۵ لاکھ سطریں ہوں۔ تو چنداں تعجب نہیں لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھ دیا۔ ہندی کلام مدون نہیں ہوا۔ اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے۔ بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دیوان تحفۃ الصغر[2] — اس کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔

دیوان وسط الحیات — اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۲ یا ۳۴ برس تک کلام ہے۔ اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید کو خان وغیرہ کی مدح میں ہیں۔

غرۃ الکمال — یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا ہے۔ ۳۴ برس کی عمر یعنی ۵ھ سے تقریباً ۶۹۰ھ تک کا کلام ہے دیباچہ میں مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے۔ سلطان معز الدین اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں۔ دو برس میں اس کی ترتیب دی اور دیباچہ لکھا۔

بقیہ نقیہ — بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اس لئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے۔

نہایۃ الکمال — پانچواں دیوان ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ

---

[1] عالمگیری علماء میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خان تھا۔ ایک مشہور امیر تھا۔ ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے رگفتگو ئے طوطی از آئینہ می خیزد مگر نباشد سیف خان۔ رافضی نیست۔ وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل تھی فقیر اللہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بہت سے فوائد اضافہ کئے اور اس کا نام راگ درپن رکھا چنانچہ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۴۰۹ مطبوعہ کلکتہ میں تفصیل مذکور ہے۔ اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی نسخہ سے لئے ہیں۔

[2] راگ درپن کے وہ نسخہ جو میرے استعمال میں ہیں دونوں غلط ہیں اس لئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے۔ اس لئے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے۔

[3] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اور دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں لیکن اس وقت سامنے نہیں۔ اس لئے ان کی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر بورڈ آر۔ آئی۔ ای۔ ڈی) کے اس ریویو سے ماخوذ ہے جو انہوں نے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے کی فہرست میں لکھے ہیں۔ اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبد القادر پروفیسر پٹنہ کالج کا ممنون ہوں۔

مرثیہ اور اس کے ولیعہد کی مدحیں ہیں۔ ایک قطعہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن میں جناب امیر خسرو نے انتقال کیا ہے۔

قران السعدین — سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جب مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی۔ کیقباد اور بغراخاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے۔

مطلع الانوار — مخزن الاسرار کا جواب ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی۔ ۳۳۱۰ شعر ہیں۔ دو ہفتہ میں تمام ہوئی۔ سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے

شیریں خسرو — جب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی۔ ۴۱۲۴ شعر ہیں سکندر نامہ کا جواب ہے۔ سال اختتام ۶۹۹ھ ہے۔ اشعار کی تعداد ۴۵۰۰ ہے۔

لیلیٰ مجنوں — ۲۶۶۴ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔

ہشت بہشت — سلسلہ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے۔ ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے۔ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں۔

پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں۔ خمسہ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں۔ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت تمام ہوئیں۔

تاج الفتوح — سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں۔ اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی۔ مطلع یہ ہے۔

سخن برنام شاہے کردم آغاز

نہ سپہر — قطب الدین خلجی کے نام پر ہے۔ نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی۔ ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی۔

دول رانی اور خضر خاں — دول رانی۔ گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی خضر خاں سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا۔ وہ دیول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے اس کی فرمائش سے امیر صاحب نے اس کو نظم کا لباس پہنایا اور عشقیہ نام رکھا۔ چار مہینے میں تمام ہوئی۔ ۴۲۰۰ شعر تھے۔ خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔

افضل الفوائد — خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں۔

اعجاز خسروی — نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں۔ ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی۔ تین جلدوں میں ہے۔

تغلق نامہ — غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں

خزائن الفتوح — سلطان علاء الدین کے فتوحات ہیں۔

مناقب ہند — تاریخ ہند

ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب۔ اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں۔

شاعری

امیر صاحب اگرچہ ہندی نژاد تھے لیکن ایرانی شعراء کو بھی ان کی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا طوطی ہند جو ان کا خطاب تھا۔ ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں۔

عرفی

بروح خسرو ازیں پارسی شکر دادم — کہ کام طوطی ہندوستان شود شیریں

خواجہ حافظ

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دہلی میں آئے۔ اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں۔ اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔ تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا۔ اور اس قدر تو تمام تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انھوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں ان کی تربیت کی جائے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ برس سے زائد تھی۔

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے۔ جیسا ایک شاعر جو امیر کا معاصر ہے کہتا ہے۔

غلط افتاد خسرو راز خامی — کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

امیر صاحب کی شاعری قدرتی تھی۔ وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے ان کے باپ دادا۔ شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے۔ تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ ان کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے۔ دیباچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

ہ دوراں صغر سن کہ دنداں می افتاد سخن می گفتم بگو ہرازد ہانم می ریخت "

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ۔

ہ چوں مرا اُستادے سرآمد برسر بیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے

دانہ دئے عنکبا رقلم را از سواد خطا باز آوردے "

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے ۔ استاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے تھے ۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے ۔ خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا ۔ اس کے الفاظ حل کئے ۔ لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہو سکا ۔ پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہے ۔ امیر صاحب اس کو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے ۔ لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہو گئے ۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے ۔ شہاب کی پہلے نہایت تعریف کر کے پھر لکھتے ہیں ۔

من بد و عرضہ کردہ نامۂ خویش او باصلاح راند خامۂ خویش

دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم رنج بر خود نہاد و منت ہم

نظرے تیز کرد موئے شگاف نے بہ عمیا نظارۂ بگذاف

ایں دقائق کہ شد مقرش پوست مو بمو شعر بیز کردۂ اوست

شمع من یافتہ ضیا از وے مس من گشتہ کیمیا از وے

ہرچہ او گفت من نہادم گوش برکشیدم مگس ز شربت نوش

وانچہ بنمود و من نہ جستم پے عیب آں بر من ست نہ بر وے

یارب او چوں بہ ہیچ نامۂ من گرد بیروں خطائے خامۂ من

نامۂ او کہ حرز جانش باد در قیامت خطا امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر صاحب نرے مقلد نہ تھے جہاں اُن کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے ۔ گو ادب کا پاس اب بھی محفوظ رکھتے تھے ۔

عیب آں بر من ست نہ بر وے

کیا عجیب بات ہے ۔ وہ اُستاد جس کے دامن تربیت میں آپ جیسا شخص پل کر بڑا ہو ۔ آج اس کا نام و نشان تک معلوم نہیں ۔

معاصر استادوں کے علاوہ امیر صاحب نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے وہ اُن کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے اور اسی طرح اُس سے فائدہ اٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے ۔ اسی بنا پر لیلےٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں ۔

زندہ است بمعنی اوستادم در نیست منش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں ۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بو

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ امیر صاحب جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے ۔ چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا ۔

کوکبۂ خسرویم شد بلند زلزلہ در گور نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی اور خسرو کی طرف بڑھی ۔ خسرو نے خواجہ نظام الدین اولیا کا نام لیا ۔ دفعتہً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آستین تلوار کے سامنے کر دی تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی ۔ واللہ اعلم ۔[1]

خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے ۔ اس وقت اُن کی عمر ۴۷ برس کی ہو چکی تھی ۔ یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے ۔ شباب کے زمانہ میں انھوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اُس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں ۔

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اُس میں لکھتے ہیں ۔

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر وز دُرِ او سربسر آفاق پُر

پختہ از و شد چو معانی تمام خام بود پختن سودائے خام

بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست دیں رہ باریک بپائے تو نیست

کالبدے داری و جاں اندر است ہرچہ تو دانی بہ از آں اندر است

تا بود ایں سکہ بعالم درست بر تو نگوئے بود ایں شقہ چست

مثنوی او راست ثنائے بگوئے بشنویش از در دعائے بگوئے

ایں ہمہ انصاف نگر ز در نیست گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں ۔

زندہ است بمعنی اوستادم در نیست منش حیات دادم

غرض امیر صاحب نے کبھی اساتذہ کی اُستادی سے انکار نہیں کیا ۔ وہ تمام اوستادوں کا نہایت ادب کرتے تھے مطلع الانوار میں جو کہہ دیا ہے وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی ۔

خود اپنی شاعری کی نسبت اظہار رائے

امیر صاحب کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں ۔ اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ اُن کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزاد رائے نہیں دے سکتا ۔ قران السعدین میں انھوں نے کیقباد اور بغرا خاں کا حال لکھا ہے لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے ۔ اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں ۔

وصف بر اں گونہ فرو راندہ ام کز غرض قصہ فرو ماندہ ام

---

[1] یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اُسی قدر تاریخ کے بھی خلاف ہے ۔

عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام	کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چوں منم اندر طلب کان خویش	معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب یکے نیست کہ جویند باز	چوں ہمہ عیب است چہ گویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعری کی تین قسمیں ہیں۔ اُستادِ تمام جو کسی طرزِ خاص کا موجد ہو جیسے حکیم سنائی۔ انوری۔ ظہیر۔ نظامی۔ اُستادِ نیم تمام جو خود کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں۔ لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اُس میں کمال بہم پہنچایا ہے سارق جو اوروں کے مضامین چراتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اُستادی کی چار شرطیں ہیں۔ طرزِ خاص کا موجد ہو۔ اس کا کلام شعراء کے انداز پر ہو صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو۔ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ درحقیقت اُستاد نہیں۔ اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ دوسرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں لیکن دو شرطیں پائی جاتی۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

بندہ را ازاں چہار شرط اُستادی کہ گفتہ شد۔ اول شرطے کہ یک طرز
ست بر حکم ماجرائے کہ در مجرائے قلم جریاں یافت کہ چندیں استادرا
متابع کلمات بودہ ام۔

چوں پس رو طرز ہر سوادم	پس شاگردم نہ اوستادم

شرط دوم آں کہ در نافہ سوادِ بوے خطا نباشد ازاں نیز دم توانم زد
کہ نظم بندہ اگرچہ بیشتر رواں است۔ اما جا بجا در غزل و نغز لغزیدنی ہم ست
دریں دو شرط معترفم کہ از لافِ اُستادی قرعہ بر فال توانم غلطانید۔

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے۔ امیر صاحب کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے۔

امیر صاحب نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں تفصیل اس کی یہ ہے۔

غزل	سعدی	مثنوی	نظامی
مواعظ و حکم	سنائی و خاقانی	قصائد۔ رضی الدین نیشاپوری و کمال الدین اسمٰعیل خلاق المعانی

لیکن لغزشیں کون بتلائے ؟ یہ کس کا منہ ہے۔ ہم ادبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قران السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر صاحب نے شعر و شاعری کے متعلق دیوان کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے۔ فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں۔

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں۔ تو کلام ناموزوں ہو جائے اس سے ثابت ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذراسی کمی بیشی برداشت نہیں کر

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد مرادف الفاظ ہیں اس لئے شاعری آسان ہے۔ ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں باوجود اس کے فارسی شعراء پر میدان شاعری تنگ نہیں۔

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں۔ لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے۔ ردیف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ نرے قافیہ پر مدار ہے۔ جس قدر قافیہ ملتے جائیں کہتے جاؤ۔ ان سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے لیکن زبان دانی میں عرب ادبا سے کم نہ تھے۔ فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے۔

خصوصیات شاعری

امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایران میں جس قدر شعراء گذرے ہیں۔ خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی و نظامی مثنوی میں۔ انوری اور کمال قصائد میں۔ سعدی اور حافظ غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پیچھے پڑ جاتے ہیں بخلاف اس کے امیر صاحب قصائد مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا۔ غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے مقابلہ کرکے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں۔ مثلاً قلم۔ کاغذ۔ کشتی۔ دریا۔ شمع۔ صراحی جام۔ خاص خاص میووں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں۔ جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ امیر صاحب نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا۔ انھوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ اور اس کتاب سے اُن کا بڑا مقصد اس قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

بود در اندیشۂ من چند گاہ	کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم	مجمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشِ نو دہم	سکۂ آں ملک بہ خسرو دہم

خود زیں فن اندیشہ زائے تا نہ نشانم نہ نشینم زپائے

زباں گو بہ شد از دل بروں کاں دگرے بادل آید کہ چوں

شاعری کا نام امیر صاحب نے وصف نگاری رکھا۔ اور یہ نہایت موزوں نام ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے ان میں سحر کا پورا رنگ نہیں آیا اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھایا ہے تاہم جس قدر ہے غنیمت ہے۔

کاغذ کی تعریف

کاغذ شامی نسب و صبح وام آں کہ شد آرایش صبحش ز شام

جامۂ تیرے ورے املش ز خویش با قصب و زرشدہ پیوند خویش

جامے تریرِ آمدہ انار نور و طرز تریرے کہ تواں جز دکرد

گندہ اجزا اش فراہم ز آبے لیک پراگندگیش ہم ز آب

بسکہ شد از کاوش بسیار پشت پشت دو تا گردش از یک شکست

گہ بود از دستہ تنش گذر گہ دہد از تیغ بہ مقراض سر

گہ خلد سوزن مسطر کشد گہ کششِ رشتۂ دفتر کشد

حرف بحرف از قلم آرد سخن لیک بہ و پیچد ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں ہم نے قلم انداز کر دیئے۔

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمت کار آگہاں خانہ گردندہ بہ گرد جہاں

نادرۂ حکم صدائے حکیم خانہ رواں خانگیانش مقیم

اہل سفر را ہمہ بر دے گذر ہمرہ او ساکن و اد در سفر

چاریۂ ہند ز بانش سلیم حامل چندیں بچہ لیکن عقیم

بیشتر از مرغ پرد در کشاد پیشتر از باد رود۔ روز باد

رفتہ دو منزل بہ رہے یل دو چند با رسن و سلسلہ و تختہ بند

ہمچو کلنگاں بہ ہوا سر فراز پرچو حواصل ز دو سو کردہ باز

ہر قدمش رہ بہ شتاب دگر ہر قدمش بر سر آب دگر

گرچہ بہ دریا گذر د بیش و کم آب نباشد مگرش تا شکم

دست چو در آب فراز افگند آب بدست آرد و باز افگند

لطمہ زدہ بر رخ دریا بہ زور آب از آں لطمہ بہ فریاد و شور

ورنہ بے آب تواند شدن کیست کہ بے آب تواند شدن

(۲) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے۔ لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں۔ امیر صاحب نے بہت سی نئی تشبیہیں پیدا کیں چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

تشبیہات تو بیا راست ایں مجمل جلہ را تحمل نتواند کرد۔ اما دو سہ نظیر برائے یادکرد ن گردشدہ۔

اس کے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں۔

ز انتظار رو د ماہی ساق تو صد چشم بزیر ہر موے دارم چو دام ماہی گیر

مژہ ہائے کثر دل آویز ت کیز ہائے دوکان قصاب است

زہے خرامش آں نازنین بہ عیاری کبوترے بہ نشاط آمد ست پنداری

امیر صاحب چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اس لئے تشبیہات میں ان کو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی۔ آخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے۔ ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے۔ لیکن کبوتر مستی کی حالت جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے۔

قصیدہ۔ مثنوی۔ غزل میں انھوں نے جو جدتیں پیدا کیں ان کی تفصیل علیحدہ علیحدہ عنوان میں آگے آتی ہے۔

مثنوی

مثنوی میں جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔ نظامی کے پیرو ہیں۔ نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں۔ رزمیہ۔ عشقیہ۔ صوفیانہ امیر صاحب نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہے البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قران السعدین یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی۔ اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے۔ لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند اور برجستہ ہے۔ مثنوی کا قصہ نہایت بے ہودہ تھا یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط و کتابت اور حملہ کی تیاری۔ بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا اور اسی کی فرمایش سے یہ مثنوی لکھی گئی۔ بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا مفصل اور آب و رنگ کے ساتھ لکھی جائیں۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے۔ اس جھوٹی منطق کو امیر صاحب نے جہاں تک ہو سکا۔ خوب نباہا ہے۔ چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں۔

گرچہ پسر تاج ستان تو ام عیب مکن گوہر کان تو ام

در ہوس تاج تو اندر سر است من گہرم تاج مرا در خور است

۱؎ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا۔

۲؎ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے۔ پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا۔

چوں سرم از بخت سیاہ از گشت　　تاج تو بر تارک من باز گشت
تخت جہاں بہر تو برپائے کرد　　لیک براں تخت مرا جائے کرد
ملک بمیراث نیابد کسے　　تانہ زند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نام پدر روشن است　　خطبۂ پدر بس کہ بنام من است
ہر دو جوانیم من و بخت من　　باد دو جز این چو بہم در مزن
گرچہ برویت نہ کشم در ستیز　　از پئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کین آورم　　شیر فلک را بہ زمیں آورم
جز تو کسے گردم از یں در نزدے　　سرز نش تیغ منش سرز دے
لیک تو نی چوں بہ چنیں ایں سریر　　من ندہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح۔ حرف حرف۔ پدرانہ محبت کے نشے سے چور ہے۔

اے ز نسب گشتہ سزائے سریر　　وز پسری ہیچ پدر بے نظیر
گرچہ غبار است ز کار توام　　سرمۂ چشم است غبار توام
تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے　　از پئے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ توانم ز تو ایں پایہ برد　　از تو ستانم بکہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو　　ہم ز تو نام من از نام تو
باش بہ کام کہ بکام توام　　زندہ و نا زندہ بنام توام
خواہمت از جان کہ بخواہی مرا　　در تو بہ خواہی و نہ خواہی مرا
جز بہ تمنائے تو سودام نیست　　بہتر از یں ہیچ تمنام نیست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک　　تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دور م ز تو اے نیک بخت　　نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت
بخت من از پائے بر افلاک سود　　با تو چو یک دم بہ نشینم چہ شود

ان خارا گداز۔ الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا۔ اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور نیازمندانہ جوش محبت میں کہتا ہے۔

من کہ گلے رستہ باغ توام　　پرتوے از نور چراغ توام
گر ہمہ بر ماہ رسد افسرم　　ہم بہ تہ پائے تو باشد سرم
زاہر و خود کن تو اشارت کہ ہیں　　من سر خاقان فگنم بر زمیں
تاج ز من سر ز تو افراختن　　تاج ز تو۔ تخت ز من ساختن
در بہ ملاقات رہی رائے تست　　افسر من خدمتی پائے تست
نیست مرا آں محل و آں شکوہ　　کز سر خود سایہ نشانم بکوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا۔ باپ کو دیکھ کر بے اختیار تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا۔ باپ نے چھاتی سے لگایا دیر تک دونوں جوش محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ پھر بیٹے نے باپ کو لے جاکر تخت پر بٹھایا۔

گرم ز و جست ز تخت بلند　　کرد بہ آغوش تن ارجمند
داشت بہ آغوش خودش تا بدیر　　سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر

با خودش از فرش بہ اورنگ برد　　تخت کیاں ہا ز کیاں واسپرد
گاہ ز دیدہ بہ نثارش گرفت　　گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت
گاہ نظر بر رخ زیباش کرد　　گاہ دل از مہر شکیباش کرد
پرسش از اندازہ ز غایت گذشت　　حد نوازش ز عنایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اس طرح کی کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار۔ شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ آئینہ اسکندری۔ ہشت بہشت۔

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ یہی ان کی تصنیف کی ترتیب ہے۔ چنانچہ امیر صاحب نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے۔ ان پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے! اور یہ قادر الکلامی اور پُرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے ان میں نسبتاً امیر صاحب کا خمسہ سب سے بہتر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر صاحب کے دل میں بے اطمینانی تھی۔ آئینہ اسکندری میں لکھتے ہیں۔

دگر بازگیری تو پیوند خویش　　مرا خود عزیز است فرزند خویش
سزد گرچہ آواز فرخندہ را　　بود از طوطی گوشش خریندہ را
بر و باد بخشایش داد گر　　کہ بر من بہ بخشش گماید نظر
ہنر جوئے در عیب جوئی مکوش　　ترا نیز عیبے ست بر خود بپوش

نظامی کے پرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں ان کے زور طبع کا یہ نمونہ ہے۔

بہ گردوں شد از نائے زریں خروش　　بہ دریائے لشکر در افتاد جوش
ہزاہز در آمد بہ ہر دو سپاہ　　رنا رود در آمد بخورشید و ماہ
علم سر ز فیوق برتر کشید　　سنان چشم سیارہ بر سر کشید
بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت　　جہانے پر از شیر و شمشیر گشت
غبار زمیں کلہ بر ماہ بست　　نفس را درون گلو راہ بست
چناں گشت روے ہوا گردناک　　کہ سیارہ گم کرد خود را بخاک
سپاہ از زرہ موج زن تا بہ اوج　　چو دریا کہ بادش در آرد بموج
بہ دریائے آہن جہاں گشتہ غرق　　ہوا پر ز میغ و زمیں پر ز برق
ز بانگ ہیونان گیتی نورد　　خشد پر صدا گنبد لاجورد
عرق کردن توسناں در شتاب　　ز دریائے آتش برانگیخت آب
شرارہ کہ زد نعل ہنگام لغز　　ستارہ برون ریخت از ماہ نو
نفیرہ از چاشنی کماں　　شدہ چاشنی بخش جاں ہر زماں
گرہ بر گرہ دشت پیکاں زناں　　زرہ بر زرہ پشت رویں تناں

بزیر سپر تیغ رخشاں ز تاب   چناں کزنہ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں۔ مثنوی امیر صاحب کا اصلی مذاق نہیں سلاطین کی فرمایش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی۔ میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے۔

مسکین من مستمند بے ہوش   از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام   در گوشہ غم نگیرم آرام
با شمع برابر نفس خود رانے   پیش چو خودے ستادہ بر پائے
تا خون نہ رود ز پائے تا سر   دستم نہ شود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب ان کے خاص مذاق کی ہے یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی انھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے۔

میدان چو نظم نامہ را ہیچ   باقی نہ گذاشت بہر ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں۔ اور ان کا کمال دکھایا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں۔

آتش زدہ گشتہ کوہ و کاں ہم   تفسیدہ زمین و آسماں ہم
جائے نہ کہ دیدہ را برد خواب   ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب
مرغان چمن خزیدہ در شاخ   در رفتہ چرندگاں بہ سوراخ
ریگ از تف پختہ در گرانی   چوں ماہ بہ روز میہمانی
از گرمی ریگہائے گرداں   پر آبلہ پائے رہ نوردان

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھ کر کون سا موقع مل سکتا تھا۔

اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پر درد غزل ہے سگ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعراء نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے۔ امیر صاحب نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے۔ مجنوں کتے سے خطاب کرتا ہے۔

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد   لیکن تو بہ نالہ و من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے   برخاک درش ز من نمی روے
بر خس کہ برو گذاشت گامے   از من بر سانیش سلامے
بر جا کہ نہاد پائے روشن   زنہار بوسی از لب من
خواہد چو ترا درون دہلیز   یادش دہی از سگ دگر نیز
زنجیر خودت نہد چو بر دوش   از گردن من مکن فراموش

اس پیرایہ ادا کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھ کو ڈیوڑھی کے اندر بلاتے تو ایک اور پہرہ دار کو یاد دلا دینا۔ جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھ میری گردن کو بھول دے جاتا۔

عاشق کا پیغام و سلام سب لکھتے ہیں۔ لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے۔ نہایت نازک مقام ہے۔ دیکھو امیر صاحب اس نازک موقع کو کیوں کر نباہتے ہیں لیلیٰ مجنوں کو لکھتی ہے۔

اے عاشق دور ماندہ چونی   وے شمع ز نور ماندہ چونی
معذرت دانم کہ شب نخفتی است   شبہائے سیاہ بر چہ سان است
از من بکہ ہے بری حکایت   با خود ز کہ می کنی شکایت
در گوشش کہ ؟ نالہ می رسانی   در پائے کہ ؟ قطرہ می فشانی
بازار تو در کدام سوئی است   سیلاب تو در کدام جوئی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور درد دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا اب اس کی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے کس سے درد دل بیان کرتا ہے؟ کس کے آگے میرا نام لیتا ہے۔ یہ باتیں نو رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں ان کے کچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

آئینہ اسکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں ان کے مذاق کا جو میدان ہے اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں۔ نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے۔ خاص اس موقع پر خوب زور طبع دکھایا ہے جہاں وہ دل ربا سکندر کی ایک ایک بات پہ اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے۔

امیر صاحب نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے اور اسی طرح بت چینی کا فخریہ لکھا ہے نظامی کے فخریہ سے ملا کر دیکھو معشوق چینی کس طرح سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے۔

مشعبد کہ راند جہاں سوختن   ز من بایدش بازی آموختن
ہمہ خون خوبان کش می خورم   دلے نوش بادم کہ خوش میخورم
رخ ہر صنم ناپدید از من است   صنم خانہ را کلید از من است
سپہر آفتاب زمیں خواندم   دگر ماہ بیند ہمیں خواندم
سکندر کہ گرد آب حیواں ہوس   نظیر منش بود مقصود و بس
گر او ہست کیخسرو جام جوے   مرا جام گیتی نمائیست روے
گر از مجلس او سمن مے دمد   مرا لالہ و گل ز تن مے دمد
گر او راست بر تخت جائے نشست   مرا در دل او ہست جائے نشست
گر از تاج خواہد ز شاہاں خراج   من از سروراں سر ستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت ورا یاور اند   مرا ہر دو چوں کمتریں چاکر اند
گر از دشمناں را بخوں خوردن است   مرا خون صد دوست بر گردن است
گر او را یک آئینہ بر کف نشست   دو آئینہ دارم من از پشت دست
کماں وے از صد شکار افگند   یک ابروئے من صد ہزار افگند
کمندوے از صید بندد مدام   من آنم کہ صیاد گیرد بدام
گر او را کلاہے است بر آسماں   مرا صد کلاہ است بر آستاں

ہشت بہشت۔ یہ سب سے آخر مثنوی ہے اور امیر صاحب کی شاعری اس میں پختگی اور پرکاری کی آخیر حد تک پہنچ گئی ہے۔ خاص خوبی اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے۔ ساری کتاب میں ضمنی حکایتیں لکھی ہیں لیکن یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جاتا ہے اُس کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوتی جاتی ہے۔ ادا کئے جائیں۔

تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا۔ اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا۔ حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا۔ جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منہ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے۔ اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے۔ چیونٹی تار کو لئے اوپر چڑھتی چلی گئی۔ حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لے کر اُس سے رسی بٹی۔ اور پھر ایک خاص تدبیر سے اسی کے سہارے نیچے اترا۔ تمام قصہ بہت لمبا ہے۔ ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں۔

چوں نگہ کرد خواجہ از بالا   کہ زنش در رسید با کالا

داوش آموز گفت بر سر تار   پارۂ قند کن بزودی یار

دہ بمورے کہ می رود بر میل   تا ببالاش می برد تعجیل

رشتۂ راز دو زدودی کن باز   کز نشیب آورد بہ سوئے فراز

ہم چناں کرد زن کہ او فرمود   داد رشتہ بمور و مور ربود

راند بالائے میل تار کشاں   رسن فتنہ بر حصار کشاں

چوں بہ نزدیک رخنہ رفت بزور   ریسماں را ربود خواجہ ز مور

قصائد

قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے۔ کمال۔ اسمٰعیل۔ خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں۔ اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں۔ اس کا تتبع کرتے ہیں۔ خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے۔

مجلس دو آتش دادہ۔ برایں از نجرداں باز جو   ایں کرد نقل را مقرر واں جام را جادشتہ

اس کے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے۔ وہی انداز۔ وہی ترکیبیں وہی استعارے ہیں۔ اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے۔ اس لئے ۱۰۷ شعر کہہ کر دم لیا ہے۔ اس میں واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے۔ عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے۔

ہر سو جوانان نو سلب بر سو عروساں در قصب   طفلاں ز تحفۂ از طرب دیدہ بہ فردا داشتہ

از شیر و خرما مرد و زن در شیر خواری تن بہ تن   چوں شیر خوراں در دہن پستان خرما داشتہ

خورشید چوں سر بر زدہ ہر کس بجائے در شدہ   ایں ریلبوی میکدہ او در مصلا داشتہ

فاسق کرے نا خوردہ گہ در عیدگہ سو دردہ   سر بر بساط سجدہ گہ دل سوئے صہبا داشتہ

دارندے ملول ست مے بل جاں ملول ست ہے   خورشید مخزول است مے در طاس مینا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے اُن کو پسند نہیں۔ صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں۔ اس لئے قصیدہ میں اور مضامین کو لیتے ہیں اور اُن میں زور طبع دکھاتے ہیں مثلاً بہار کا سماں۔ برسات کی رُت۔ صبح و شام کی کیفیت۔ ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔

ابر بارید و ہمہ روئے زمیں را تر کرد   خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستاں فرمود   بشا طاخاک زمین باد پر نیاں فرمود

چو روئے نازک گل تاب آفتاب نداشت   زمانہ بر سرش از ابر سایہ باں فرمود

ز لالہ خواست چمن ساغرے بیک خشید   ز ابر خواست زمیں شربت ارغواں فرمود

ہر آنچہ در ورق خویش غنچہ مشکل داشت   بنفشہ گوش نہاد و صبا بیاں فرمود

صبح کا سماں

سپیدہ دم کہ فلک روشنی بہ گیہاں داد   نسیم غالیہ در دامن گلستاں داد

چو چرخ پیر بہ رخ زد سپیدی و سرخی   بدستش آئینہ داد آفتاب و خنداں داد

درست مغربی آفتاب را کہ فلک   نہاد زیر زمیں بامداد تاباں داد

ستارہ را زچہ شد دیدہ خیرہ از خورشید   چو شب زحقہ میناش سرمہ چنداں داد

غلام باد صبا ام کہ بامداد پگاہ   صلائے عیش بہ عشرت سرائے مستاں داد

باغ

نو بہار است و چمن جلوہ چو حورا کردہ   ابر بارید تنی لولو لالا کردہ

گرہ طرۂ سنبل کہ صبا باز شدہ   دامن لالہ پر از عنبر سارا کردہ

بر گل و لالہ سرود آنکہ قمری   پائے آلودہ بخوں باتچہ بالا کردہ

عاشقاں رفتہ بگلزار و دل سوختہ را   بہ تکلف زگل و لالہ شکیبا کردہ

نو بہار امسال ما را روزہ فرماید ہمی   گل چناں تر دامن از مے لب نیالاید ہمی

بر دہان غنچہ گہ گہ می زند بوسہ نسیم   کاں شکر لب جز بہ بوسہ روزہ نکشاید ہمی

باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد   گل بخندہ گفت ارے ایں چنیں باید ہمی

نرگس رعنا قدح بردست و چشم اندر ہوا   گو تبا می خوارہ ماہ عید را باید ہمی

(گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈتا ہے)

برسات

ہوائے خرم است در طرف باراں ہمی بارد   نگویم قطرہ کز بالائے گل ریحاں ہمی بارد

نگوں سر شاخہائے سبز گوئی در ہمی چیند   ز بس کا بر دُر افشاں لولوی غلطاں ہمی بارد

ا؎ زداں فرمودن۔ فوراً حاضر کرنا۔

یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ ان کے رولنے کو جھکی ہیں۔

آں قطرہ زسرِ باغِ انار زر تو پنداری　　کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندر دہاں بہی بارد
بوقتِ آں دفینکہ مطرب در دہاں نیکواں بر خوش　　خرامان در میان سبزہ و باراں نمی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں۔ ان میں بحرالابرار جو بڑا ابیر حاصل قصیدہ ہے مشہور ہے۔ التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں بحوی اور اس کے ساتھ دلیل ہو۔

کاسۂ خالی حباب آمد غلغلش در دم است　　ہر کہ قانع شد بخشک و تر شہ بحر و بر است
عاشقی مشغلہ است و مرداں را لیسپ راحت است　　سلسلہ بند است و شیراں را بگردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلیف ہے۔ لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے۔ جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اس کا زیور ہے۔

خوش بہاں در کلیسے پادشاہ عالم است　　تیغ خفتہ در نیامے پاسبانِ کشور است
مرد چوں مردم پاکو شد مرید شہوت است　　بیوہ زن چوں رخ بیاراید بہ بند شوہر است
قص خاک نست ہر گز نور بالا بر تو تافت　　سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر تارک خور است
ابر انجا کن کہ تشویش است در محشر بسے　　آب زینجا بر کہ در دریسے شور و سر است
ناکس و کس ہر کہ حرص و مال دار دوزخی است　　عود و ہرگس ہر چہ در آتش فتد خاکستر است
اے برادر مادر و ہر از خور زخون مرنج　　چوں ترا خوں برادر بہ ز شیر مادر است
دہر خاکے را نمونہ میکند کیں مردم است　　بحر آبے را غلو میکند کیں گوہر است

اہلِ فن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدت طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے مخلص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں۔

برسات کے ذکر کے بعد

ہر آنہ ابر در بخشش و گردان پایہ در فلکد　　نگیرد ہیچ کس پیشش مگر شاہ جہاں گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل از کم عمر شد گو باش دانی　　کہ در خود کیست عمر جاوداں را
نہال باغ شاہی رکن حق آں کہ　　ز بزم اوست رونق بوستاں را
کشادہ چہرہ کہ ماہے شدم بر سنے زمیں　　در ملک بنود دم کہ آسماں ایں است

طلوع صبح کا بیان کر کے

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست　　آسماں روئے ملک بچو نمود

نہ از نہ روئے آں نازک زگرما ہیچ آسیبے　　مگر در سایۂ رایاتِ شاہ کامگار آمد

طلوع آفتاب کے بعد

خورشید جہانگیر پندار کہ در بزم　　شمشیر کشیدہ ملک آلشرق بر آمد

قصائد میں امیر صاحب نے جس قدر جدید مضامین۔ لطیف استعارات نئی نئی تشبیہیں۔ گوناگوں اسباب پیدا کئے اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر صاحب اس میں بھی سب سے الگ ہیں۔

بوستاں بشگفت در روئے لالہ خنداں گشت باز　　بر رخ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز
سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت　　بلبل آنگہ از خط قرباں غزل خواں گشت باز
خون لالہ گوئیا خواہد چکید از تیغ کوہ　　یا چکید آں خوں کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل

اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی۔ سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا۔ امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانہ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز ہو گئی ہے۔

غزل کی جان کیا ہے؟ درد سوز و گداز۔ جذبات۔ معاملات عشق و نیاز اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں، وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو۔ بے تکلف ہو۔ نرم ہو۔ لطیف ہو نیاز آمیز ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں۔ جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو۔ قریب الفہم خیالات ہوں۔ اس حد تک امیر صاحب شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیئے۔ یہ سب اجمال تھا تفصیل ذیل میں ہے۔

بحروں کی موزونی وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جس میں خواہ مخواہ بات کو صفائی۔ سادگی۔ اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے مثلاً۔

سرے دارم کہ ساماں نیست او را　　بہ دل دردے کہ درماں نیست او را
فراش کردم روز راز آں کہ　　شبے دارم کہ پایاں نیست او را
براہ انتظارم ہست چشمے　　کہ خوابے ہم پریشاں نیست او را

یار من دل ز دوستاں برداشت　　مہر دیرینہ از میاں برداشت
در دل او نہ کرد کار اچہ　　سنگ از نالہ ام فغاں برداشت
وے بہ تندی بلند کرد ابرو　　از پے کشتنم کماں برداشت

آں دوست کہ بود بر گراں شد　　واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر کردی اے دل　　دیدی کہ بعافیت ہماں شد
دل بر دگرے نہم و لیکن　　عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ بار کنید　　نام من بر سرش طراز کنید
گر شما دین عاشقاں دارید　　بعد ازیں پیش بت نماز کنید
گاہ مردن شنیدہ ام محمود　　گفت ردیم سوے ایاز کنید

دامن آں بت طرار زدہ دار　　پاسخے نیز دل تو از نہ داد

خواب مارا بہ بست و بالہ کرد   دل مارا ببرد و باز نہ داد

تو چہ دانی نیاز مندی چیست   چوں خدایت بہ کس نیاز نداد

سوز وگداز، سوز وگداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس میں بھی معشوق سے اپنا حال کہہ رہے ہیں کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ ان کو رحم آتا ہے۔

برائے دوست چہ پرسیدی کہ چوں بگذشت سالہا   اے سرنگردم چہ می پرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اس کو رونا آتا ہے۔ ٹھہر جاتا ہے۔ رو لیتا ہے۔ پھر آگے بڑھتا ہے اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔

خسرواست وشب افسانہ و باز د ہر بار   قدرے گریہ ولیس بر سر افسانہ رود

زانو شہ خسرو بہ زیر سر نہا نست   سر نہادہ بر سر زانو نخفت

اے آشنا کہ گر بہ کناں پند میدہی   آب از برون مریز کہ آتش بجاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہئے۔ پھر دل پر غصہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات نہیں ہو سکتی اُس کے کہنے سے کیا فائدہ۔ اس معاملہ کو یوں باندھتے ہیں۔

غصہ ام می کشد اے دل سخن صبر مگوئے   دہ چراگوئی از اں کار کہ نتوانی کرد

حسدی بردی اے دشمن با عقل و دانش خرد   بیا تا بر مراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج و غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔ عاشق جس کا فضل وکمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے، عاشق ہو کر تمام فضل وکمال اور عقل کھو چکا ہے۔ وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید برآئی۔ اس کو کس موثر طریقے سے ادا کیا ہے۔

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز   دردہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روئے خود بنمائیمت   این سخن بیگانہ را گو آشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند   ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے۔ اور غریبانہ مان تو فقیروں پر بھی "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے۔

کشتم از تیغ جفایش خویش را   بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریاد من   شب نمی خسپد کسے در کوئے تو

صبر طلب میکند از دل عاشق   بیخبر است کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول

لگایا جائے۔

اے دیدہ چہ ریزی از برون آب   کیں شعلہ بجاں گرفت ما را

اے خواب ! برو کہ باز امشب   سودائے فلاں گرفت ما را

اے عشق تا زتو چو من تا کسے فتاد   گویا کسے نماند جہان خراب را

دل ندارم غم جاناں بچہ بتوانم خورد   پیش ازیں گرچہ غمے بود و لے ہم بود است

کس چہ داند کہ چہ رفت از غم فرزند بمن   از شب تیرہ خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیا بہ دوستاں جاناں فنا کن   ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوئے آں بت بدخو چہ میرود   آں خو گرفتہ باز دراں کوچہ میرود

گر بہ بینی دل ویران مرا   گو نیا ہیچ گہ آباد نہ بود

کافرے رہتیا دلم غارت کرد   شہر اسلام دمرا داد نہ بود

______ میرا انصاف نہ کیا گیا

کرشمہ چند کنی بر من آفرایں جاں است   نمی رود ز زمین و صبا نمی آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد امیر نے یوں دست درازی کی۔

کرشمہ چند کنی بر من آفرایں جاں است   نمی رود ز زمین آسماں نمی بارد

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم   پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدت اسلوب۔ غزل کی ترقی کا نوروز۔ لطف ادا۔ اور جدت اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں۔ لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا۔ امیر صاحب کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دیئے۔ جو اگلوں کے خواب وخیال میں نہ آتے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم وستم کے ساتھ بھی محبوب ہے۔ یوں ادا کرتے ہیں۔

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز   دردہا دادی و درمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے۔ اسی مضمون کو دیکھو امیر صاحب نے کس انداز سے کہا ہے۔

مے حاجت نیست مستیم را   در چشم تو خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج وغم سے بے خبر ہونا۔ عام مضمون ہے اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے۔

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست   از ہمیں کار رنگ و بوئے دانم

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اس کو یوں باندھتے ہیں

فصاحت و دل بیار غارت کردنی دارد ۔۔۔ مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

وقتِ رخصت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا ۔

می روی و گریہ می آید مرا ۔۔۔ ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق ۔

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی ۔۔۔ از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر بکرد

سعدی کا شعر ہے ۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم ۔۔۔ باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

پہلو اگرچہ تغزل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجے کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہو سکتی تھی ۔ لیکن امیر صاحب نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا ۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی ۔۔۔ ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے ۔

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو ۔۔۔ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں ۔

بتے در آمد تقوی و آخر ایں نمیدانی ۔۔۔ کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے ۔ بجائے اس کے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے ۔ گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں ۔ بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے ۔

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں ۔

جاں نثار خراب و ناماوزاندہ پیش ۔۔۔ ما بوئے مست و ساقی میدہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا ۔

شراب لطف بدور جام میریزی و میترسم ۔۔۔ کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

اکثر جگہ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں

چشم بد دور از چناں روئے ۔۔۔ کہ از و چشم دور نتواں کرد

ہر زماں ور من دہیو شی من حیراں شد ۔۔۔ ہر دو آں کس کہ ترا بیند حیراں نشود

گفتیم با شوخی چرا ای خسروا ۔۔۔ چوں کنم آں فدواں مال خوش است

گفتم کہ ترا ہمیں غلام ۔۔۔ گر ہست گناہ من ہمیں است

دہنت ذرہ کم از ذرہ است ۔۔۔ رخ ز خورشید ذرہ کم نیست

ایہام ۔ یعنی ذو معنی الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں ۔

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم ۔۔۔ چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود ۔۔۔ کہ دلم ہیچ دلستاں نبرد

تو ببردی ہمہ یقین مرا ۔۔۔ بلا یقے کہ کس گماں نبرد

دی روئے تو دیدم و نہ مردم ۔۔۔ شرمندہ بماندہ ام ز زیست

دیگر اں نیست کہ من زہد فروشم ۔۔۔ ساقی قدحے بادہ کہ بر روے تو نوشم

اکثر جگہ جملہ معترضہ یا جملہ شرطیہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں اور یہ اُنہی کا خاص مذاق ہے ۔

بر روے باد ابوسہ زن بر آں پائے ۔۔۔ دگر چیزے نگوید بر دہاں ہم

غمزۂ تو بہ صف سلطاں زنہ ۔۔۔ ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

رشکم آید کہ برم پیش تو نام دگراں ۔۔۔ وگر انصاف بود پیش تو ہم نتواں گفت

کشتم از تیغ جفایت خویش را ۔۔۔ بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

نمے دارم کہ باد از دوستاں دور ۔۔۔ بحق دوستی کز دشمناں ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی

مولوی غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں ۔

مخفی نماند کہ جامہ ہائے سخن طرازی شیخ سعدی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت

دل و جانم بتو مشغول و نظر بچپ و راست ۔۔۔ تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

و اما ناسخ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردیدہ و اساس آں را بلند ساخت ۔"

عشق و ہوس بازی میں جو حالات پیش آتے ہیں ۔ اُن کے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں ۔ اہلِ لکھنؤ نے اس کا معاملہ بندی نام رکھا ہے ۔ بہرحال اس طرز ادا کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا امیر خسرو ہیں ۔

شرف قزوینی ۔ ولی دشت بیاضی ۔ اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہنچایا ۔ آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں ۔

خوش آں زماں کہ بپیش نظر نشستہ کنم ۔۔۔ چو سوئے من نگرد از نظر بگردانم

غلام آں نفسم کامدہ چو خانہ او ۔۔۔ بخشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بر در ش گفتا بیا ۔۔۔ در باں گفت ایں ہیں ۔۔۔ گرفتار است شاید کیں طرف بیاری آید

امیر صاحب کے کلام کے زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ہر قسم کے نازک و لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں ۔

چند گویند کہ کہہ بہ دلش میگذرد ۔۔۔ ایں حدیثے ست کہ بر دل مانیز گذرد

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بامراد کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے ۔ لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہہ دیا کرتے ہیں ۔ اس لئے کیوں کر اعتبار آئے ۔

جاناا اگر شبیت دہن بردہن نہم   خود را بخواب مانزوگلیں وہاں کیست
معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں بھی رات کو تیرے منہ پہ منہ رکھ دوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا
یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منہ ہے ۔

دل من مست بود و قصہ مرو ست   گہے ز انجام وگہ ز آغاز میگفت
اندک اندک گہے بابا ابرو ن خوش بود   درمیہ گرہ وم بیبادہ برد ن ہم خوش است
شیفتہ می نمائی بہ یکہ بوئی امشب   کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد
مست آں ذوقم کہ شب وکوی خویشم دید و گفت   کیست ایں ہ گفتند مسکینے گداتی میکند
جاں بادفدات آں دم کہ بعد دوسہ بوسہ   گویم کہ یکے دیگر ۔ گوئی کہ نہ توانم
وعدہ میخواہم ندہند وفا نیز نیسم   غرض آنست کہ بارے بہ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال

عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا تب عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہے جس کا نام علمی زبان ہے ۔

سعدی و نظامی وغیرہ کی زبان اگر بولنے کی قلم بند کی جاتی تو بوستاں اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی ۔ بلکہ آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں دقت ہو گی ۔ لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے ۔ بے شبہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہئے کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے ۔

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے ۔ سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی بستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا گر یہی ہے ۔

امیر صاحب کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف اور سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں ۔ اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں جو آج ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں ۔

دل بسے بردۂ نکو بشناس   آں کہ مجروح تر از اں من است
یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں ۔ خوب کر کے دیکھو ۔ جو بہت زخمی ہو وہ میرا دل ہے ۔
صبح روئے تو بدیناں کہ برآمد امروز   نیست امکاں کہ چو من سوختہ تا شام کشند[1]
لب و دہاں و رخت ہر یکے بلائے دل اند   یکے دلم چہ کند ۔ جانب کدام شود
یعنی تیرا لب و دہن اور چہرہ سب بلا ہیں میرا دل کیا کرے ۔ کدھر کدھر جائے
گفتم اے دل مرو آنجا اگر گرفتار شوی   عاقبت رفت ہماں گفتہ من پیش آمد[2]

خلقے براہ منتظر جاں بسپردن اند   اے ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر
ذرا باگ روکے ہوئے

بوسہ وگفت و زباں گرداند   خود ہمی گوید و مے گرداند
بوسہ دینے کو کہا ۔ اور پلٹ گیا ۔ آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے ۔
بوئے خوشم آید از تو در جیب   گل داری یا ہمیں ست بوئیت
تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے ۔ تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے ۔
خلک ما نیست دریں عہد وفا رائے اشک   زاں جوانی کہ تری آئی باراں چوں آ
اے گل دہن تنگت صد تنگ شکر چیزے   گل با تو نمی ماند در حسن مگر چیزے
گویم غم و درد رم ہیں گوئی کہ بتر خواہم   بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو بتر چیزے
چو سبزہ خویش را خط تر خوانا رجائے آں باشد   کہ گل از خندہ بر خاک او فتد غنچہ شکم گیرد
یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل جائیں ۔
دلم میخواستی بر ہم عفاک اللہ چناں دیگر   مرا میخواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد "

اے صبادی کہ ز فلانی چمن مے میخورد   ہیچ یاد من گرفتہ زندانی کرد
از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم   بوئے گل نیست کہ می آید ایں بوئے کسی ا
دل من دور رفت مست نمیدانم   باز جوئید ہمیں جاستہ کہ در کوی کسی است

خستہ می شوم قبلہ رویت چہ کنم ؟   کہ ز ابروے تو چشم بد بمحراب افتاد
تیرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ میں دھوکا سا ہوتا ہے   کیونکہ مجھ کو تیری ابروے دو محرابیں نظر آتی ہیں
رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو ببیں   زیں ذوق مست بیخبرم کاں سخن چہ بود
سب کو منہ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ   میں اس مزہ میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہی
ساکناں بر کوے تو نباشد بہوش   کاں زمینے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد
زچشمت کا رناں صبر من تاراج کار شد   مسلماناں کسے دیدست کاندر شہر راہ افتد
مسلمانوں کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے
بہ یاری ہمسے من آمد شوخی دل رعنا ستہ   بد گفتہ چہ خواہی کرد گفتا کار می آید
عام محاورہ بکار آید بہ بکار می آید ۔ امیر صاحب کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا ۔

حسن تو عالمے بجوابد سوخت   ہم ز رآغاز می تواں دانست
نرخ کردمی بہ بوسہ جانے   بندہ بخرید و رائیگاں دانست
(تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی   میں نے خرید ا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا)
از بہر آں کہ لاف جمال تو میزند   صد بار لالہ بر دہن یاسمیں زدست

ماجا بہ فدائے خنجر تسلیم کردہ ایم   خواہی بخش خواہ بکش رائے رائے تست

---

[1] تا شام کشند یعنی شام تک زندہ رہ جاتے   [2] یعنی وہی میرا کہنا سامنے آیا ۔

ساقی بیا بی کہ چناں سوخت دل زعشق   کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

راست کردی زابروان محراب   می نماید نماز خواہی کرد
(ابروؤں سے تو نے محراب درست کی ہے   معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے)
من آن ترک طناز را می شناسم   من آں مایۂ ناز را می شناسم
شبم تازہ شد جاں بہ دشنام مستی   تو بودی من آواز را می شناسم

باد صبا چو از رخ او زلف در ربود   ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد
تو حال من ہم ازیں رو تنے زردیدرو   کہ من بروے تو پیدا شدی توانم کرد

سالہا شد کہ نامم خبر دور کویت   دل دیراں شدہ را آیم وآباز کنم

صد بار سر زندہ گردم گر تو یار ایک سخن گوئی   تو میدانم نگوئی لیک من گفتار میگویم
مجھ کو معلوم ہے کہ تم نہ کہو گے لیکن میں بات کہتا ہوں
دعوائے خونبہائے دل خویش میکنم   یک بوسہ بر ہم زن و مالا کلام کن

امیر صاحب نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا اور اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے ۔ مثلاً

از کسے او چہ میرود
آواز کردن ۔ پکارنا ۔
گفتار میگویم ۔ یوں ہی اک بات کہتا ہوں ۔
مالا کلام کردن ۔ کسی کو ساکت اور بند کرنا ۔

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو ۔ لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقرا پر اعتماد نہیں ۔ اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے ۔

مسلسل غزلیں

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے ۔ قصائد کا موضوع مدح ہے ۔ مثنویاں قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں ۔ قطعات میں بھی اور ادنیٰ باتیں ہوتی ہیں ۔ عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرتے ہوں تو کیونکر کریں ۔ اس قسم کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے ۔ لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا رواج بہت کم ہوا ۔ امیر صاحب نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی ۔

مثلاً عاشق ۔ قاصد یا اپنے رازدار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے ؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے ؟ کیا کرتا ہے ؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں ؟ وغیرہ وغیرہ ۔

دیکھو کس اشتیاق کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں ۔

اے صبا باز بمن گوی کہ جاناں چوں است   آں گل تازہ و آں غنچۂ خنداں چوں ست
باکہ مے میخورد آں ظالم و در مے خوردن   آں رخ بر خوے و آں زلف پریشاں چوں ست
چشم بد خوش کہ ہشیار نبا شد مست است   چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چوں ست
روے و زلف بت عیار کہ آں ہر دو خوش اند   دل دیوانۂ من پہلوی ایشاں چوں ست
روز ہا شد کہ دلم رفت و دراں زلف بماند   یار سبا آں یوسف گم گشتہ بزنداں چوں ست

پوچھتے پوچھتے دفعتہً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلاف عاشقی ہے اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے ۔

ہم بجان و سر جاناں کہ کم و بیش مگوے   گو ہمیں یک سخن راست کہ جاناں چوں است

یعنی معشوق کی جان کی قسم ادھر ادھر کی باتیں نہ کہہ ۔ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے ۔

معشوق نے روزہ رکھا ہے ۔ اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں ان کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے ۔

ماہ من روزہ میاں شکرستاں دارد   اے خوش آں روزہ کہ جا در لب جاناں دارد
لب مے آلودہ دہاں پر شکر و نرگس مست   اے مسلماناں ہ کس روزہ بدینساں دارد
خضر گر بر لبش آید شکند روزۂ خویش   کاں پسر در تہ لب چشمۂ حیواں دارد
می خورد آخر زمنش پنہاں نیست   من گرفتم کہ خود او روزہ پنہاں دارد
جان من گر تو قدم رنجہ کنی بندۂ تو   قدرے آب در چشم و دل بریاں دارد

معشوق سر و ساماں کے ساتھ سوار آ رہا ہے ۔ عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے ؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے ؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آ رہی ہے ؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آ رہا ہے ۔ لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا ۔ اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہئے ۔ ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں ۔

کہ می آید چنیں یارب بانگرمہ بزمیں آمد   چو گرد است اینکہ میخیزد کہ با جانِ مشتاق آمد
کہ می راند چیست راکہ میان عنبرآگیں شد   کدامیں باد می جنبد کہ بوے یاسمیں آمد
بتے وآفتِ تقوی و آخر ایں نمی دانی   کہ در شہر مسلماں نیاید ایں چنیں آمد

بہار آتی ہے ۔ عاشق باغ میں جاتا ہے ۔ مجلس آرائی کے ساماں ساتھ ہیں ۔ قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے ۔ سبزۂ لب جو اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے ۔ قاصد سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ادھر ادھر کی باتوں میں ٹالنا چاہے تو نہ ماننا ۔ جس طرح ہو سکے ساتھ لانا ۔ اور اگر مستی میں ہو تو اسی طرح مست اٹھا لانا ۔ ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ۔

آمد بہار شد چمن و لالہ زار خوش   وقتے ست خوش بہار کہ وقت بہار خوش
در باغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا   مستی خوش ست و بادہ خوش ست و بہار خوش
ماییم و مطربے و شرابے و محرمے   جامے بزیر سایۂ شاخ چنار خوش
اے باد کاہلی مکن و زود تر رود   ما رابکن بہ آمدن آں نگار خوش
چیزے دگر مگوے ہمیں گو کہ در چمن   سبزہ خوش ست و آب خوش و جوئبار خوش

---

[1] پیدا کردن ۔ ظاہر کرنا ۔ [2] وقتت بے خوش بودن ۔ دعائیہ جملہ ہے ۔ یعنی خدا ان کو خوش و خرم رکھے ۔

گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گو و　　پیشش کن و بیار و مشو زینہار خوشش
ور پیشش کہ مست بو خفتنش مدہ　　ہم پیچ پانش مست بہ نزد من آر خوشش
می مست خوش حریفی اگر کہ آں حریف　　سر خوش خوش ست و مست خوش و ہوشیار خوشش
با اعتدال زماں کہ منشش راہ می دہد　　بازی خوش ست بوسہ خوش ست و کنار خوشش
پیمانہ خوش بود نہ اندر چمن و لیک　　آں سر دمن پیمانہ خوش ست و سحار خوشش

بہار میں کیا کیا چاہئے، اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

ہنگام گل ست بادہ باید　　ساقی و حریف ساختہ باید
گر غنچہ گرہ زابرو افگند　　پیشانی گل کشادہ باید
ساقی برخیز و از نیشاں　　کیں شستہ و آں ستادہ باید
واتگاہ حریف سادہ و مست　　در چنگ من اوفتادہ باید

بہار کا سامان

بوستاں جلوہ در گرفت اینک　　گل زرخ پردہ در گرفت اینک
آتش لالہ بر فروخت زباد　　دامن کوہ در گرفت اینک
بلبل آمد نشست بر سر گل　　بے نوا بود زر گرفت اینک
غنچہ در پیش فاختہ ہذا اصول　　سبقے تازہ بر گرفت اینک
ورق غنچہ را کہ تر شدہ بود　　در قش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے اس لیے چپک کر رہ گئے۔

آب را گرچہ چشم پاک است　　بوستاں را بہ بر گرفت اینک

یعنی پانی گو پاک نظر ہے تاہم اس نے باغ کو سینہ سے لپٹایا۔

خار چوں تیز کرد پیکاں را　　گل بعد نو سپر گرفت اینک
طوطی آغاز شور خسرو کرد　　روئے گل در شکر گرفت اینک

جدت

جیساکہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ امیر صاحب کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں۔ اور یہ دعویٰ بدیہی دعویٰ ہے۔ ان کی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو۔ چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

راز خون آلود خویش اے دل مسنہ با من بر دلے
ایں ورق خام است حرف از دے بروں خواہد گذاشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ۔ کیوں کہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا۔

زلف او پہلو خال لب او　　گوئی از شہد مگس می راند

مہ رود مہ بر اوج در شب تار　　تا زلف تو نردباں نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا۔ جب تک تیری زلفوں کی سیڑھیاں

دکھائے۔ چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے۔

ہست صحرا چوں کف دست دہر وا ز لالہ جام　　خوش کف دستے کہ چندیں جام صہبا بر گرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے۔

دیدہ ام شاخ گلے بر دوش می پیچم کہ کاش　　می توانستم بیک دست ایں قدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی۔ اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے ہی پیالے لے سکتا ہے۔

غلام نرگس مستم کہ بامداد پگاہ　　قدح بدست گرفتہ ز خواب برخیزد

گلستاں نسیم سحر یافتہ است　　صبا غنچہ بشگفتہ در یافتہ است
چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب　　کہ گویا یکے جام زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور یہ تشبیہ عام تھی۔ لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آگیا ہے۔ ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے اور چوں کہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں۔ اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے۔

میروی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھ کو رونا آتا ہے اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے۔

مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اس لئے وہ جانا چاہے گا تو بارش ہوگی۔ اور وہ اس لئے کبھی نہ جاسکے۔

مے میان شیشۂ ساقی نگر　　آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ تماغز لالہ شراب کرد　　در گوشہ ہائے باغ بسے ورنا بکرد
فراش باغ بارگہ خود بباغ او　　وانگہ بر آب خرگہ نسیم از حباب کرد
نرگس کہ شب نخفت ز فریاد بلبلاں　　بنہاد سر بہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے۔ غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے۔ غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا امیر صاحب کی ایجاد ہے اور انھیں پر خاتمہ بھی ہوگیا متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں لیکن اس کا دوسرا انداز ہے۔ وہ اور سلسلہ کی چیز ہے چنانچہ آگے چل کر اس کی حقیقت کھلے گی۔

امیر صاحب کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں۔ مثالوں سے اندازہ ہوگا۔

بہ خانۂ تو ہمہ روز بامداد بود　　کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

---

[1] طبیعت۔ [2] موسیقی۔

تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے　　کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا
زلف تو سیہ چراست ؟ ما گفتا　　بسیار در آفتاب گشت است[1]

ششتہ می شود کہ از روبیت چہ کنم　　کہ زابروئے تو چشم بدو محراب افتاد
چشم مست تو کہ دی برمن بیتاب افتاد　　تو نیفگندی از آلودگی خواب افتاد

زہر آں جنس تاریک باشد خانہ چشم　　کہ ہرگز آفتاب من دریں روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست　　روز روشن چراغ نتواں کرد[2]

می روی و گریہ می آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دل من بہ زلف وروبیت شد اسیر چوں نگردد　　شب ماہتاب و دزدے کہ بخانہ در آمد

زہے عمر دراز عاشقاں گر　　شب ہجراں حساب عمر گیرند
یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے ۔
زلف ازاں می برد آں شوخ کہ بشبہائے غم　　گر شود کوتہ ازاں جا ہمہ پیوند کند
یعنی اپنی زلف وہ اس لئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہوجائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھا دے ۔
راہے است برائے بردن دل　　ابروئے تو گر میاں کشاد است
یعنی تیری دونوں ابروؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے ۔ اس لئے کہ دل لیجانیکے لئے راستہ ہے ۔
زلفت سرو پا شکستہ زاں است　　کز سر و بلندت افتادہ است
یک شب ز رخ خویش چراغیم کرم کن　　تا قصہ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم
(یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اس کی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں ۔)
خانہ چشم من خراب شد است　　کہ بہ بنیاد خانہ ام رفتہ است

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکریں لعل تو کان نمک است　　گرچہ شکر نہ مکان نمک است
آب روئے تو ملاحت افزود　　گرچہ از آب زیان نمک است

خواہی اے جان بر دخواہ بمن باش کہ من　　مردنی ہستم امروز کہ جاناں اینجا ست

آئینہ کرد حسن وے از آسماں سوال　　بر خاست آفتاب و بزانو جواب کرد
(یعنی اس کے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا ۔ آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے ۔)
مرا بروئے تو گردم گرہش باز کشای　　کہ کمانت نہ باندازہ بازوی کسی است

ہرچند کہ زلف تو سیاہی است جہانگیر　　زیں گونہ پریشاں نتواں کرد سپہ را

بہ سایہ خفتہ بُدم من کہ یار آمد گفت　　چہ خفتہ کہ رسید آفتاب در سایہ
اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے ۔

ع ۔ درد با دادی و درمانی ہنوز ۔

ع ۔ یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم ۔

امیر صاحب نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہم کو ڈر تھا کہ جو جال انھوں نے بچھایا اس میں خود نہ پھنس جائیں ۔ لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں ۔ مثلاً فرخی و ابن المعتز وغیرہ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے ۔

امیر صاحب اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں ۔ تاہم ان کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہونچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آجائیں صنعت طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں ۔ ع

درد با دادی و درمانی ہنوز

ز بند دو جہاں آزاد گردم　　اگر تو ہم نشیں بندہ باشی
من ز ریش راکشتی بغزہ　　کرم کردی الٰہی زندہ باشی

گفتیم ناخوش چرائی خسرد　　چوں کنم ؟ آں شکل داں بالا خوش است

بندہ را در غم تو نیست خبر　　ہمہ یاراں بندہ را خبر است

خرد سالے بمن کند بیداد　　اے بزرگاں شہر داد دہید

عربیت

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر صاحب کو عربی علم ادب میں کمال تھا اور اس فن کی نادر کتابیں ان کے حافظہ میں مخزون تھیں ۔ تاہم ان کو اس فن میں دعوی نہیں غرۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعتراف عجز

---

[1] غالباً　[2] دھوپ میں پھری ہے ۔　[3] چراغ کردن ۔ چراغ جلانا ۔

گے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ اشعار یہ ہیں۔

ذاب الفواد وسال من عینی الدم وجلی الدوامع کل ما انا اکتم
دل پگھل گیا۔ اور آنکھوں سے خون بہا اور آنسوؤں نے وہ سب کہہ دیا جو میں چھپاتا تھا
واذا بحت لدی الوری کرب النوی بکی الاحبۃ والاعادی ترحم
اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے۔

ما عاذل العشاق دعنی باکیا ان السکوت علی المحب محرم
او ناصح! تو مجھے رونے دے چپ رہنا عاشق پر حرام ہے
من بات مثلی فھو یدری خلیلتی طول اللیالی کیف بات متیم
جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے

اعجاز خسروی میں۔ عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں جن سے اُن کی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لفظی تکلفات ہیں لیکن یہ اس زمانہ کا عام انداز تھا تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا۔

وان انا الا من غزیتہ ان غوت غویت وان ترشد غزیتہ ارشد
میں بہرحال قبیلہ غزیہ کا آدمی ہوں۔ غزیہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہے تو میں بھی ہوں۔

صنائع و بدائع

امیر صاحب نے صنائع و بدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں اگرچہ کوہ کندن و کاہ برآوردن ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے کہ ان کی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے۔ ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے۔

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اس لئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً صنعت منقوط یعنی عبارت میں ایسے الفاظ کا لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو۔ امیر صاحب نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں۔ بعض فارسی میں تھیں لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص نہ لکھ سکا۔ امیر صاحب نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں انھوں نے تصرفات کئے۔ اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں چنانچہ ہم انھی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں۔

[illegible]

یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ لفظوں کے رد و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور بامعنی ہو۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی ۔ بدبدی۔ مرلوی۔ نجانی زمانے بباشی۔ بہ یاری بشاقی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ کل تو آیا اور تونے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا۔ ایک ذرا ٹھہرجا۔ تو زینتی کرنے کے قابل ہے۔ لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں۔

رشیدی ندیدی مرادی عیانی ودمانی بیانی بتادی نسانی

تو میرا ہدایت یافتہ ہے۔ بے نظیر ہے۔ میری مراد ہے میری نجات ہے۔ مجھ کو اس بات نے ناامید کیا کہ عورتیں باہم لڑتی ہیں۔

قلب اللسانین

بہت اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتے مثلاً

بسی یا کامرانی در جہاں باش
می باش بکار شاد بانی۔
بامی یار ما کہ کار می کنیم بہم۔
دوست ما یار نمی۔ بہ یاری ما آئی۔
بکن داد و بخشش و کامران باش۔

ان تمام مصرعوں کو اُلٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے۔

وصل الحرفین

یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے۔ بلکہ دو دو۔ یا تین تین حرف کا لفظ ہو مثلاً

چاکر۔ خامہ۔ حاجی فرقانی۔ سرخدمت۔ بہ پابیت می مالد۔ و می گوید کہ
بدیں جانب خاطر با فرحت ترین می باشد باید کہ گہہ گہہ جانب ما نامہ فرماید
تا ہر خوشی کہ براست فرحی کامل باید۔

یہ اس صنعت کا نقیض ہے جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً۔

در۔ دور۔ دواو۔ آورد۔ روداد۔ داری۔ درازی۔ دگار۔ ذات
وادر دوران را۔ الخ

امیر صاحب نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

اربعۃ الحرف

اس صنعت پر امیر صاحب کو بہت ناز ہے کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف۔ ہ۔ واو۔ بیہ کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے۔ یعنی تمام الفاظ صرف انھی حرفوں سے بنے ہیں۔ لیکن جو عبارت لکھی ہے۔ وہ بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنہ والشفا

اس صنعت پر بھی ان کو ناز ہے۔ اس میں ایسے الفاظ جمع کئے ہیں کہ سطروں کی سطریں پڑھتے جاؤ۔ لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی۔ صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمۃ اللفظ

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیے

ڈاکٹر تارا چند

امیر خسرو اور ہندوستان

نہ کسی ملک میں نہ کسی زمانہ میں ایسا ہے کہ سب لوگ ایک مذہب رکھتے ہوں، ایک نسل سے ہوں، ایک زبان بولتے ہوں، سب کی رسمیں ایک ہوں، اور ان کے خیالات میں کوئی فرق نہ ہو۔ ہر ایک ملک کی آبادی بھانت بھانت کی قوموں اور قسم قسم کے گروہوں سے مل کر بنتی ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس کے بارہ میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں تنوع نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ قومیت کا تقاضا ہے کہ نسل، مذہب، تمدن، زبان کی کثرت میں سیاسی وحدت کا جذبہ جاری اور ساری ہو۔

آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم تمدنی تنوع کو سماجوں کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو بنیادی مان کر ایک دوسرے کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کے فرق قومیت کے راستے میں حائل ہوں۔ اسی شک وشبہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ خصوصاً پچھلے زمانہ کی تاریخ کو علم کی شفاف روشنی میں نہیں بلکہ جذبوں کے گرد وغبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں۔ چوں کہ قومی احساس کے بننے بگڑنے میں تاریخ کا گہرا اثر ہوتا ہے تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہیئے غور نہیں کیا۔ تاریخ قوم کی لمبی اور سچی سرگذشت کی یاد ہے اور جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد ہے جو اس کے ذہن میں محفوظ ہیں اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ وحدانی سلسلہ ہے جس سے قوم اپنی نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتی ہے۔ تاریخ دانوں کی غفلت اور بے راہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے اپنی روایتوں کی غلط تعبیر سماج کے بندھنوں کو کمزور کر سکتی ہے اس میں شک نہیں اس معاملہ میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے جو ڈگر چلائی اس کے نتیجے ہمارے لئے بدبختی کا باعث ہوئے اور اگر اب بھی ہم نہ چیتے تو آئندہ کے لئے سخت نقصان پہونچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ امیر خسرو اکیڈمی کے قیام سے ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ اپنے اصلی رنگ میں ملک کے سامنے آئے اور غلط فہمیوں کے دروازے بند ہوں۔ امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرہویں اور چودہویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملی جلی تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور راہب اس زمانہ میں کیسے جذبے کیسے خیال رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں پر جن میں اسلامی ملک شامل تھے ترجیح دیتا تھا اس کے دل اور دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی فضا کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قومیت کا وہ جذبہ جو آج نظر آتا ہے اس زمانہ میں موجود تھا۔ آج سے چھ سو سال پہلے سماجی یا فردی زندگی میں اس کی تلاش الٹی گنگا بہانی ہے۔ پچھلے زمانہ میں سماجوں کا نظام آج سے مختلف تھا، رشتہ بندی کے اصول جدا تھے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت نسب کو دی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی کسی خاص قبیلہ یا ذات سے وابستہ ہوتا تھا اور قبیلہ یا ذات کے لوگوں کا رشتہ کسی حقیقی یا خیالی مورث اعلیٰ سے جا ملتا تھا سب فرد اپنے آپ کو اس کی اولاد سمجھتے تھے۔ اس طرح اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان قبیلوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے سیکڑوں قبیلے اور ذاتیں تھیں اور یہی مسلمانوں کی حالت تھی۔ سیاست کا دار ومدار نسبی اصول پر تھا، نہ کل ہندوستان کی کوئی ایک ہندو جماعت تھی نہ کوئی ایک اسلامی۔ ہندوستان کے کچھ شمالی حصوں پر جو خاندان حکومت کرتے تھے وہ توران اور خراسان سے آئے تھے ان کا مذہب اسلام تھا مگر ان کی سیاست کی بنیادیں اسلامی نہیں کہی جا سکتیں ان کے کاموں میں اسلامی وحدت کا جذبہ کارفرما نہ تھا ان کی سیاست خاندانی اور عشایری مفاد پر مبنی تھی اور یہی صورت ہندو راجوں مہاراجوں کی تھی۔ یہ بھی غلط عقیدہ ہے کہ جو فاتح باہر سے آئے وہ مذہب اسلام پھیلانے کی غرض سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور یہ بھی کہ جن ہندو راجوں نے ان کا مقابلہ کیا وہ ہندو مذہب کی رکھشا کے لئے لڑے۔ دونوں طرف لڑائی زر، زن اور زمین کے واسطے تھی، دونوں طرف مذہب کی دہائی دینے والے وہ مولوی اور پنڈت تھے جنھیں تلوار اٹھانے سے سروکار نہ تھا۔ تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ پر حملہ کیا اس کے لئے شریعت کی کون سی حجت تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ سندھ میں بدھ مذہب کا خاندان راج کرتا تھا۔ برہمن وزیر نے اس کے خلاف سازش کی اور تخت سے اتار دیا۔ عربوں کو خانہ جنگی کی خبر ملی کچھ شکایتیں لے کر لوگ حجاج تک پہونچے۔ ایسے موقع ہاتھ آیا۔ سمندری ڈاکوؤں کا بہانہ مل گیا۔ داہر سے معاوضہ طلب کیا گیا۔ اور اس کے انکار پر دھاوا بول دیا گیا۔ رعایا نے جو راجوں کے ظلم سے تنگ تھی حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ سندھ کے شہر اور قلعے محمد بن قاسم کے ہاتھ آئے دونوں میں سے ایک کے سامنے بھی نہ کوئی مذہبی مقصد معلوم ہوتا ہے اور نہ

اخلاقی ۔

محمود غزنوی کے حملوں کو مذہب کے گہرے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے مگر تاریخ بتلاتی ہے کہ حقیقت کیا ہے ۔ سامانی خاندان کے امیر سبکتگین کے دل میں اپنے آقا کے خلاف آگ بھڑکتی ہے، سبکتگین کا لڑکا محمود جو ایک جری سپاہی اور نامور سپہ سالار تھا سامانیوں کو خراسان سے نکال کر سلطنت کا مالک بن جاتا ہے ۔ اس کے سامنے آل بویہ اور خلیفہ بغداد کا جھگڑا آتا ہے آل بویہ مذہباً شیعہ تھے خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے ۔ خلافت تو خود ہی دم توڑ رہی تھی ۔ اس نے اپنی عمر میں کچھ سال بڑھانے کے لئے محمود کا سہارا ڈھونڈھا، محمود کو ایران پر تسلط حاصل کرنے کا موقع ملا مسلم اور غیر مسلم فوج لے کر شمالی ایران کو روندنا شروع کر دیا، ایلخانیوں اور دیلمیوں سے جنگ چھڑ گئی ۔ ادھر مشرق کی سرحد پر ہندوستانی راجے جنھیں سبکتگین نے افغانستان سے باہر کر دیا تھا اس تاک میں تھے کہ کھوئے ہوئے ملک کو پھر لے لیں ۔ محمود نے دکھنی لشکر کشی شروع کر دی ایک مرتبہ ہندوستان پر حملہ کرتا تھا اور دوسری بار وسط ایشیاء یا ایران پر، نہ مسلمان ریاستوں نے اس کا مقابلہ کیا نہ ہندو راجوں نے ۔

ادھر اس نے اسلامی علاقوں پر قبضہ کیا ادھر مندروں کو گرایا اور مال و دولت کو لوٹا، نہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کی نہ ہندوؤں کو چھوڑا ۔ درباری شاعروں نے تعریف کے پل باندھ دیئے خلیفہ نے یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابوں سے نوازا کوئی پوچھے جس شخص نے ایران کے مسلمان حاکم خاندانوں کو تباہ کر دیا اور خلافت کو اپنی قسمت پر چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چنگیز اور ہلاکو غیر مسلم سرداروں نے اسلامی مملکتوں اور عباسی خلافت کو خاک میں ملا دیا اسے کس طرح اسلامی دولت کا دایاں ہاتھ اور اسلامی ملت کا بھروسہ سمجھا جائے ۔ پھر محمود کے تک و تاز کے دوران میں ہندو سماج اور ہندو ریاست کا کہاں نشان تھا ۔ محمود آتا ہے متھرا کو، نگرکوٹ کو، قنوج کو، سومنات کو تہ و بالا کر دیتا ہے، کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کس ہندو سنگھٹن نے ان پوتر ستھانوں کی حفاظت کے لیے کوشش کی ۔ غزنی سے پاٹن اور غزنی سے کانجر تک دھاوے ہوتے ہیں سوائے مقامی راجوں کے کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ۔ کیسا تعجب ہے ان نیم وحشیانہ خونریزیوں کو ہندو دھرم اور اسلام سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ پھر اس کا کیا جواب ہے کیوں محمود نے اپنی فوج میں ہزاروں ہندو سپاہی بھرتی کر رکھے تھے کس طرح محمود نے ہندو سرداروں سوندر، تلک، سیوند رائے پر اعتماد کیا ۔ احمد نیالتگین ہندوستان کا حاکم مقرر ہوتا ہے بغاوت کا جھنڈا اٹھاتا ہے محمود تلک کو اس کی سرکوبی کے لئے ہندوستان بھیجتا ہے تلک اور ہندو جاٹ مل کر نیالتگین کا قلع قمع کر دیتے ہیں ۔ کرمان میں جنگ ہوتی ہے محمود کی فوج کا سردار نوشی تگین دو ہزار ہندو اور ایک ہزار ترک اور ایک ہزار کرد اور عرب سپاہیوں کو لے کر لڑنے جاتا ہے دشمنوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر فوج تتر بتر ہو جاتی ہے ہندوستانی افسر بھاگ کر غزنی پہونچتے ہیں محمود انھیں برخاست کرتا ہے چھ ہندو افسر اتنے شرمندہ ہوتے ہیں کہ جگر میں خنجر بھونک لیتے ہیں اور جان قربان کر دیتے ہیں ۔ وسط ایشیا میں مرو کے مقام پر محمود کے ہندو سپاہی لڑتے نظر آتے ہیں ۔ نیشاپور کان میں ہندو فوجی خیموں کی نگہبانی کرتے ہیں، ہندو فیلبان محمود کے جنگی ہاتھیوں کی فیلبانی کرتے ہیں ۔ بلخ کے نزدیک ہندو فوج کا کیمپ ہے، وہاں جگہ کا نام کافروں کا حصار ہے ۔ ان واقعات کی کیا تشریح ہے ؟ بت شکن بادشاہ اور بت پرست سپاہیوں کا کیا رشتہ تھا ؟ ہندو افسر کیوں مسلمان امیر کے لئے جان دیتے تھے، مسلمان امیر کیوں ہندو افسر پر بھروسہ کرتا تھا ۔ ؟

محمود کی اولاد قریب ایک سو پچاس برس تک پنجاب پر حکومت کرتی ہے اس عرصہ میں ہندوستان میں کہیں ہلچل نہیں ہوتی ہندو سماج میں کوئی ایسا تن چلا نہیں نکلا جو مذہب کے نام پر راجاؤں کو جمع کرے اور دشمنوں سے پوچھ گچھ کرے، لیکن غزنویوں سے اگر کوئی پنجاب کو خالی کراتا ہے تو وہ غوریوں کا خاندان ہے ۔ انھیں کے معرکوں سے ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، پہلے شمالی ہندوستان اور پھر دکن میں ترکوں کی حکومت قایم ہوتی ہے ایک کے بعد دوسرا خاندان تاج و تخت کا مالک بنتا ہے لیکن کسی بھی خاندان کی سلطنت سو برس سے زیادہ نہیں چلتی ۔

التمش ۔ بلبن ۔ علاؤ الدین خلجی، محمد بن تغلق ۔ نے بڑے دبدبے کے ساتھ حکومت کی ۔ لیکن ان کی کامیابی ان کی ذات تک محدود رہی ان کے مرنے کے ساتھ طوائف الملوکی پھیلی ۔ نہ کوئی ایسی ملت قائم ہوئی جو ان میں سے کسی خاندان کی پشت و پناہ ہوتی اور نہ کوئی ایسا سماجی طبقہ بنا جو انھیں سنبھالے رکھتا اگر ہندوؤں نے ان سے طاقت چھیننے کی کوشش نہیں کی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے قبیلوں اور علاقوں میں کوئی ایکتا نہیں تھی، مذہبی اور سماجی زندگی کو سیاست کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں تھا، اسلامی ملت اور ہندو سماج کے تصور حقیقت سے کوسوں دور تھے ۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے مذہبی جنگ و جدل ایک فسانہ ہے جسے انیسویں صدی کے فرنگی تاریخ دانوں نے گھڑا ۔ ممکن ہے اسے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح سمجھتے ہوں ممکن ہے انھیں سچ مچ یقین ہو کہ واقعات کی نوعیت یہی ہے، لیکن کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تاریخ کے ان گلے سڑے غلافوں کو اتارا جائے اور ان فرضی نظریوں کی سختی کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے، تاریخ کو مذہب نہیں علم کی روشنی میں پڑھا جائے ۔

اس زمانہ کے ہندوستان میں دو مذہب اہمیت رکھتے تھے دونوں مذہب انتہائی لطیف اور پاکیزہ خاصیتوں کے حامل تھے، دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ قدروں کے پشت و پناہ تھے ۔ ان کے وسیلے سے انسان حقیقت میں انسان بنتا ہے اپنی سفلی خصلتوں اور حیوانی خواہشوں پر غلبہ پاتا ہے لالچ ۔ غصہ، حسد، شہوت، بے رحمی اور تنگ نظری کی غلاظتوں سے دل کو صاف اور دماغ کی کدورتوں کو دور کرتا ہے دونوں وجدان اور نفس میں ہم آہنگی پیدا کرتے اور انصاف اور حق، انسانی محبت اور خلق کی خدمت کی دعوت دیتے ہیں ۔ کس طرح ان مذہبوں کو قتل و غارت، دشمنی اور آزار کا جواز مان لیا جائے ۔ بات یہ ہے جنگ اور جدل کی وحشیانہ حرکت کے لئے ہر زمانہ میں لوگ عذر ڈھونڈتے رہتے ہیں اپنے بہیمانہ اعمال کو مذہب کے سر تھوپتے ہیں بیسویں صدی یورپ کی دونوں لڑائیوں میں دونوں طرف کے عیسائی پادری اپنی قوم کو حق بجانب اور دوسری کو شیطان کے

بھلا۔ ے میں بھولا مانتے تھے۔ خدا اور پیغمبر سے دعا مانگتے تھے کہ مذہب کے دشمنوں کو شکست نصیب ہو۔ ایسی ہی کچھ کیفیت ہندوستان کے منجھلے زمانہ کی تھی۔ سچ پوچھئے تو مذہب اور دھرم کی ٹٹی کے پیچھے ملک اور دولت کے لالچی شکار کھیلتے تھے۔ ملت اور سماج کا جو تصور آج ہے اس وقت کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ تاریخ دانوں کی قطعی بغیر واجب اور غیر تاریخی کوشش ہے جو اس زمانہ کے کارناموں میں آج کل کے حرکات کو کارفرما سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ تاریخ کی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف امن اور شانتی کا نکالا۔ جس میں انسانیت کے ارتقا، ہمدردی اور رہکاری کی توسیع اور مانو پریم کے پھیلاؤ کی جھلکی ہے، دوسرا رُخ لال لال خون سے رنگا ہوا ہے۔ اس زمین میں انسانی خون کے پیاسے جاہ و دولت کے لالچی اور زبردستی کے دیوانے گھمنڈ کے گھوڑوں پر سوار ادھر اُدھر دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذہب کا پہلے رخ سے واسطہ ہے اسے تاریخ کے دوسرے رخ سے وابستہ کرنا مذہب کی توہین ہے انسانیت اور اخلاق کو منہ چڑھانا ہے۔

مجھے اس لمبی تمہید کی ضرورت اس لئے معلوم ہوئی کہ امیر خسرو کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ جس زمانہ میں امیر خسرو نے زندگی بسر کی اس زمانے کے ذہنی ماحول کا اثران پر ناگزیر تھا۔ ان کے قلم سے بھی کبھی کبھی ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ اسلام کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور دوسرے مذہبوں پر اس کی برتری کے قائل ہیں بھی ایسے لفظ بھی استعمال کرتے ہیں جو رواداری کی نزاکتوں کو ٹھیس لگاتے ہیں۔ باوجود اس کے گہری نظر سے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کس قدر ان کا دل اور دماغ ہندوستانیت سے لبریز تھا۔

اصل یہ ہے کہ خسرو کی ذات قرآن السعدین تھی جس میں دو تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے ان کے والد لاچین قبیلہ کے ترک تھے ماں نسل سے ہندوستانی اور عماد الملک راوت عرض کی بیٹی تھی۔ خسرو اپنے بارہ میں خود لکھتے ہیں "ز نسل عارض آمود منم" یعنی نانا رنگ کے سانولے تھے۔ باپ بے پڑھے تھے لیکن امیر آدمی تھے پیشہ سپاہی کا تھا۔ مگر خسرو آٹھ برس کے ہوتے تو سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا بوڑھے نانا کی سرپرستی میں دہلی میں تعلیم ہوئی جہاں ماں کی لاڈلی گود میں پلے اور بڑے ہوتے تین مکتبوں اور استادوں کی شاگردی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا خسرو تلمیذ الرحمٰن تھے، قدرت نے ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، شاعری کو طبیعت سے فطری مناسبت تھی، ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے تھے کہ شعر کہنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں "دوران صغر سن کہ دندان میافتاد سخن میگفتم"۔ خواجہ عزیز الدین سے جو بڑے عالم تھے خسرو سخن کا لقب ملا، انیسویں سال میں اپنے بچپن کے کلام کا دیوان "تحفۃ الصغر" تیار کر دیا۔ امیر خاندان کے تھے شروع ہی سے امیروں کے درباروں سے تعلق ہو گیا خسرو نے اپنی بہتر برس کی عمر میں سات سلطانوں کا زمانہ دیکھا۔ اکثر نے ان پر عنایت کی اپنے خاص ندیموں میں جگہ دی عزت اور اکرام کی نگاہ سے پرورش کی۔ کچھ حاسدوں کو یہ پسند نہ آیا لیکن ان کی دشمنی سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خسرو کو ابتدائی جوانی میں محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی خدمت کا فیضان حاصل ہوا۔ ان کی صحبت میں دنیا کے ملاق سے تیاگ قناعت کی برکت، بے نیازی سیکھی۔ اقرار کرتے ہیں۔

نیست ان دارم از پی پس بہ راز
کو درسشہ نیز شوم بے نیاز

اس کے بعد سے خفیہ طور پر میری یہ نیت ہو گئی ہے کہ میں شاہی دربار سے بھی بے نیاز ہو جاؤں۔

پشت نہ جویم نہ پناہی زکس
چوں بہ خداوند کنم روی و بس

قرآن السعدین

نہ مجھے کسی کی پشت پناہی کی ضرورت ہے نہ اماں کی بس میں نے تو اپنے آقا و مالک کی طرف اپنا رجحان کر لیا ہے۔

استغنا کا یہ عالم تھا ؎

من کہ نہادم ز سخن گنج پاک
گنج زر اندر نظرم ہست خاک

قرآن السعدین

میں نے شاعری کی دولت اور خزانہ جمع کیا ہے روپے کا خزانہ میری نظر میں ہیچ ہے۔

ان کے کردار پر صائب کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

دست طمع پیش کساں چوں مکنی دراز
پل بستہ تا بگذری از آبروئے خویش

اگر حرص اور لالچ کا ہاتھ تو نے کسی کے سامنے پھیلایا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ تو نے پل باندھ لیا ہے جس پر ہو کر تو اپنی عزت و آبرو سے گذر جاتا ہے یعنی اپنی عزت کھو بیٹھتا ہے۔

خسرو صوفی منش۔ درویش انسان تھے ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت تھی شاعری میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ شاعروں میں ان کا پایہ اونچا ہے۔ ہندوستان میں کوئی ان کا مثل پیدا نہیں ہوا، زندگی میں خراسان اور ایران سے خراج تحسین حاصل کیا اور آج بھی ایران میں چوٹی کے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔

شاعر کے بارہ میں کہا جاتا ہے اپنے زمانہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ خسرو اس قول کے بہترین نمونوں میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں تیرہویں اور چودہویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا استہرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاسیات کی روشن تصویریں ہیں، اخلاقی تمدن کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگارنگ جھلکیاں ہیں، شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے۔ راہ عشق کے پیچ و خم محبت کے متانوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے، اور ناکامیوں کا المیہ۔ پند و نصیحت، حکمت و تدبیر تصوف و معرفت کیا کچھ ہے جو خسرو سخن کی قلمرو کے باہر ہے۔

کلام کا حجم اتنا ہے کہ ایک مقالہ میں اس کا احاطہ غیر ممکن ہے۔ میں آج اس کے صرف چند پہلوؤں کی طرف آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ میرے مضمون کا پہلا عنوان ہے۔ "خسرو اور ہندوستان" پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان دنیا کے تمام ملکوں سے بہتر اور برتر ہے۔ کہتے ہیں "کشور ہند است بہشتی بزمین" اور اس کے ثبوت میں ایک نہیں سات حجتیں پیش کرتے ہیں۔ حجتوں کو جانے دیجئے۔ ان کے پیچھے جو جذبہ ہے دیکھئے کہتے ہیں اس وجہ سے ہند کو ترجیح دیتا ہوں۔

خفست یکی کیں زمیں از دور زمن
ہست مرا مولد و ماوی و وطن

[illegible] میں سے ایک یہ ہے کہ اتفاق زمانہ سے یہ ملک میرے پیدائش کی جگہ اور پرورش پانے کا مقام اور وطن ہے ۔

دین ز رسول آمدہ کای زمرہ دین
حب وطن ہست ز ایمان بہ یقین

اور یہ رسول کی حدیث ہے کہ اے دین والو وطن سے الفت رکھنا ایمان کا یقیناً جز ہے ۔

پھر دس دلیلیں اس بات کی دیتے ہیں کہ کیوں ہند کو روم ، عراق، خراسان اور قندھار پر فوقیت حاصل ہے ۔ کئی دلیلیں اس بات کی دی ہیں کہ ہندوستان کی ہوا خراسان سے بہتر ہے

نی چو خراسان کہ تن از برف فزون
سرد پیاز یست بدہ شقہ درون

وہ خراسان کی طرح نہیں ہے جہاں ہم سردی کی زیادتی کی وجہ سے ٹھنڈا اور اندر پیاز کی طرح ہو ۔ دس خولوں والا ہو جاتا ہے ۔

پھر کہا ہے ۔

چار م شاں کیں طرف از سبزہ و گل
ہست ہمہ سال بہار و گل و مل

چوتھی دلیل ہندوستان کی خوبی کی یہ ہے کہ اس کے گرد چاروں طرف سبزہ اور پھولوں کی فراوانی کی وجہ سے پورے سال بہار اور کھلے ہوئے پھولوں اور شراب کا منظر دکھائی دیتا ہے ۔

اور ہندوستان کے خوشبودار پھولوں، قسم قسم کے میووں، بے گٹھلی کیلے اور پان کی تعریف میں شعر کہتے ہیں ، پان کا ذکر یوں کرتے ہیں ۔

ہست دہم آن کہ چو تنبول گزیں
میوہ نباشد بہ ہمہ روی زمیں

دسویں یہ کہ پان جیسا منتخب میوہ ساری دنیا میں نہیں ملتا ۔

آم اور انجیر کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کو جو انجیر کے سامنے آم کی قدر کرتے ہیں لان زن کا لقب دیتے ہیں ۔ پھولوں پر اس قدر گرویدہ ہیں کہ ایک ایک کا نام لے کے تعریف کرتے ہیں گل کوزہ ، صدبرگ ، بیل ، جوہی ، کیوڑا ، راتے چمپا ، مولسری ، دونہ ، کرنا ، سیوتی سب کا بیان کرنے کے بعد خراسانی پھولوں سے برتری کا سبب بتاتے ہیں ۔

چو بینی ارغوان و لالہ خنداں
کہ رنگی ہست بوئے نیست چنداں

اگر ارغوانی لالہ کو ہنستا ہوا تو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ ان کے رنگ تو خوب ہیں لیکن خوشبو نام کو بھی نہیں ۔

گل ما را بہ ہندی نام زشت است
وگر نہ ہر گلی باغ بہشت است

ہمارے پھولوں کے نام ہندی ہونے کی وجہ سے خراب ہیں ورنہ حقیقت میں ہمارے باغ کا ہر پھول باغ جنت کی طرح ہے ۔

گر این گل خاستے در روم و شام
کہ بودے پارسی یا تازیش نام

اگر یہ پھول روم اور شام میں اگتا تو اس کو پارسی یا عربی نام ملتا ۔

شدے معلوم تا مرغان ان بوم
چسان غلغل زدندے در رے و روم

اور جب اس سرزمین کے پرندے کو پتہ چلتا تو وہ رے اور روم کے شہروں میں اس طرح غلغلہ مچاتے ۔

کہ این گل چنین باشد کہ سالے
دہد بو دور ماندہ از نہالے

کہ یہ پھول اس سال اس طرح کا ہو گیا ہے کہ درخت سے دور دور تک خوشبو پھیلاتا ہے ۔

کپڑوں کی تعریف میں فرماتے ہیں ۔

نکو دانند خوبان پری کیش
کہ لطف دیوگیری از کتاں بیش

پریوں جیسی خصلت رکھنے والے حسین اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوگیری کا کپڑا بڑا باریک ہوتا ہے ۔

ز لطف آن جامہ گوئی آفتابیست
و یا خود سایہ یا ماہتابیست

لطافت میں جو کپڑا آفتاب کی طرح معلوم ہوتا ہے اور یہ کہیے کہ وہ خود ہی سایہ ہے یا چاند ہے و رنگل سے جو تحفہ آتے ہیں ان میں ایک قسم کا کپڑا ہے

چنین جامہ ابریشمین ہندوانہ
کہ یک گز شود دہ کشند از دوانہ

ہندوستان کے ریشم کا بنا ہوا کپڑا اتنا مہین اور باریک ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر تو وہ ایک گز معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے دس خیمہ ایستادہ کئے جا سکتے ہیں ۔

زبس لطف دہ گز بدیدہ بگنجد
کہ دیدہ ز گنجیدن ان نرنجد

اس کا دس گز کپڑا آنکھوں میں سما سکتا ہے اور اس کے سما جانے سے آنکھوں کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی ۔

نہ زو بگذرد ہم نہ آبے نہ چربی
نہ چون قطرۂ آب پیکان حربی

نہ اس میں سے پانی نکل سکتا ہے اور نہ کسی طرح کی چکنائی گزر سکتی ہے اور نہ جنگی تیر اس طرح پار ہو سکتا ہے جس طرح پانی کا قطرہ نہیں نکل سکتا ۔

اور ایک کپڑے کے بارے میں کہتے ہیں ۔

جامہ ہندی کہ ندانند نام
از تنکی تن بنماید تمام

ہندوستان کا ایک کپڑا ہے جس کا نام لوگ نہیں جانتے وہ اتنا باریک ہوتا ہے کہ اگر اسے کوئی پہنے تو سارا جسم نظر آتا ہے ۔

ماند پچیدہ بناخن نہاں
باز کشایش بپوشد جہاں

اگر اس کو ناخن میں بھی لپیٹ لیا جاتے تو پوشیدہ ہی رہے حالاں کہ اگر اس کو کھولیں تو ساری دنیا ڈھانپ لے ۔

یہ ڈھاکہ کا "آب رواں" تو نہیں جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ پورا تھان ایک انگوٹھی کے حلقہ میں سے نکل جاتا تھا ۔؟

ہندوستان کے پرندوں کا بیان سن لیجئے ۔ طوطے کے بارہ میں کہتے ہیں حافظ ہے آدمی ہے ۔

فاتحہ واخلاص ودعا ور دہنش
با من و تو ہم چو من و تو سخنش

اس کی زبان پر سورۂ فاتحہ اخلاص اور دعاؤں کا ورد رہتا ہے اور ہمارے تمہارے ساتھ تمہاری ہماری طرح باتیں کرتا ہے ۔

پھر شارک کا ذکر کرتے ہیں کہ ویسا پرندہ نہ عجم میں ہے نہ عرب میں ۔ کوّے کی کائیں کائیں میں بھی خاص اثر ہے اس کی بولیوں سے شگون لیتے ہیں اور چڑیا تو پنہاں راز بتا دیتی ہے ۔ لیکن مور کے لئے تعریفوں کے دریا بہا دیئے ہیں پوچھتے ہیں ۔

گر نہ بہشت است ہمیں ہند چرا
از پئے طاؤس جناں گشت مرا

اگر ہندوستان بہشت نہیں ہے تو پھر مور کی وجہ سے میرے لئے جنت بن گیا ہے ۔

یہاں اسے طائر فردوسی کہا ہے کہیں بتایا ہے کہ ہد ہد جو مرغ سلیماں ہے اس کے زرّیں بال کو دیکھ کر انگلی کاٹتا ہے اور آخر میں فیصلہ دے دیا ہے ۔

ہمہ دانند کہ پیدا و نہاں
نیست چنیں مرغ در اطراف جہاں

پوشیدہ اور ظاہر طور پر سب جانتے ہیں کہ اطراف عالم میں اس طرح کا پرندہ کوئی نہیں ۔

جانوروں میں ہرن کی چال ، گیدڑ کے زیر و بم ، گھوڑے کے ناچ ، بندر کی نقل ، بکرے کا لکڑی پر چاروں طرف سم رکھ کر ٹھہر کنا اور ہاتھی کا آدمیوں کے سے کام کرنا بہت مزے لے لے کر سناتے ہیں ۔ لیکن ہندی حسینوں کو دیکھ کر تو بے تاب ہو جاتے ہیں ۔ سو ملک چین بھی ہندوستان کے ایک بال کے برابر نہیں ، یغما اور رنج کے خوبرویوں کی آنکھیں ضرور چمکتی ہیں لیکن چہروں پر ترشی ہوتی ہے ، خراسانی سرخ و سفید ہیں لیکن خراسانی پھولوں کی طرح بے بو ہیں ، روم اور روس .... کا حال مت پوچھئے ۔

سپید و سرد ہم چوں کندہ یخ
کز ایشاں دم خورد فاقون دوزخ

برف کی سِل کی طرح سفید اور ٹھنڈے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر دوزخی عورتوں کی سانس اکھڑ جاتے ۔

تاتاریوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ختن والیوں میں ملاحت نہیں ، سمرقندی اور قندھاریوں میں شیرینی کی کمی ہے تو مصریوں میں چستی اور چالاکی غرض کہیں بھی وہ خوبروئی اور دلربائی نہیں جو ہند کی حسیناؤں میں ہے ۔

ہندوستان میں جو جگہ سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہی آپ کا شہر دہلی ہے کہتے ہیں ۔

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است کہ آباد باد

دہلی کے دین اور انصاف کی شہرت اطراف میں پھیلی ہوتی ہے یہ عدن کی جنت ہے ۔ خدا اس کو آباد رکھے ۔

ہست چوں ذات ارم اندر صفات
حرسہا اللہ عن الحادثات

یہ اپنی صفات اور خصوصیات کی بنا پر باغ ارم کی طرح ہے خدا اس کو زمانے کے حوادث سے محفوظ رکھے ۔

پھر اس کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے ثبات کو فلک ثابتہ کا نمونہ بتاتے ہیں جامع مسجد کو کعبہ سے ملا دیتے ہیں ، قطب مینار کو آسمان تک پہونچانے والی سیڑھی اور آسمان کو سنبھالنے والے ستون سے ، حوض خاص کے پانی کو نور سے جس میں آسمان کا عکس نظر آتا ہے جس کی تہ میں ریت کے دانوں کو اندھا آدمی رات کی اندھیاری میں گن سکتا ہے ۔ دہلی بلند مرتبہ تاجداروں کا پایۂ تخت ہے جہاں ملک کے بزرگ اور مملکت کے رکن رہتے ہیں ۔ اس کے باشندے فرشتہ سیرت اہل جنت کی مانند خوش دل اور خوش خو ہیں ۔ صنعت میں علم و ادب میں گانے بجانے اور کرتبوں میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں ۔

ہند کے موسموں کا بیان کس آب و تاب کے ساتھ کرتے ہیں ا جاڑا آتا ہے تو ہندوستان جنت نشان ہو جاتا ہے گھر اور باہر ۔ باغ اور میدان سبزہ زار بن جاتے ہیں ۔ بہار میں پھول ہنستے ہیں بلبلیں گاتی ہیں ، عاشق اور معشوق گھروں سے باہر سیر کو نکل آتے ہیں دنیا نوروز کا جشن مناتی ہے گرمی تو اس ملک کا خاصہ ہے لیکن یہ اس لئے ہے کہ

مہر فلک گرم شد اندر وفاش
گرم از اں گشتہ جہاں را ہواش

اس سے وفاداری کے عشق میں آسمانی سورج گرم ہو گیا ہے یعنی اس میں گرمی ہندوستان سے عشق کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور پھر اس سے سارے عالم کی ہوا گرم ہوتی ہے ۔

برسات کا موسم آیا تو آسمان پر بادلوں کا شامیانہ چھا گیا ، جنگل میں ہر طرف سبزہ کی

صفیں تیار ہوگئیں دھان کے پودوں کے سر پانی میں ڈوب گئے، باغوں میں پھلوں کے درخت میووں سے لد گئے، نالے اور ندی چڑھ گئے، بطخیں اٹھلاتی ہوئی گھومنے لگیں۔ پھر خزاں کی فصل نے ہوا کے جھونکوں کو گلشنوں کی بربادی کے لئے چھوڑ دیا، چمبیلی سوکھ کر جلی پڑ گئیں، بنفشہ نے نیلا لباس پہن لیا۔ سوسن، صد برگ، سیوتی کے پھولوں کی پتیاں گر گئیں اور درخت ننگے ہو گئے بلبل غمگین اور طوطے گونگے ہو گئے۔

اپنے دیش کے پرندوں، پرندوں، ہوا، پانی، نگر اور جنگل، مرد اور عورتوں کے رنگ و روپ سے خسرو اس قدر متاثر تھے کہ بار بار ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے گن گانے سے تھکتے نہیں۔ لیکن یہ تو پھر بھی سطحی چیزیں ہیں اور شاعروں کا بھی دھیان اس طرف گیا ہے جو بات کم ملتی ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ جس طرز سے خسرو نے ان پر گہری نظر ڈالی ہے اور ایک بے لاگ مگر ہمدردی سے بھری ہوئی تنقید کی ہے اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔

زبان کا مسئلہ آج بیسویں صدی میں جھگڑوں کی جڑ ہے، ایک تیرہویں صدی کا وطن پرست شاعر زبانوں کا کس طریقے سے مقابلہ کرتا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو ہندوستان کی سب عوامی بولیوں سے واقف تھے کم سے کم نام کی حد تک۔ گو ان کے اپنے لفظ یہ ہیں۔

من بہ زبانہائے کسان بیشتری
کردہ ام از طبع شناسا گذری

میں لوگوں کی اکثر زبانوں سے واقفیت رکھتا ہوں اور اپنی سمجھنے والی طبیعت کے ذریعہ ان سے واقفیت حاصل کی ہے۔

دانم و دریافتہ وگفتہ ہم
جستہ و روشن شدہ زان بیش و کم

ان میں سے کچھ کو جانتا ہوں کچھ سے یوں ہی آگاہ ہوں کچھ میں شاعری کرتا ہوں اور ان میں سے اکثر و بیشتر سے مجھ کو روشنی اور دانش حاصل ہوتی ہے۔

پھر سندھی، لاہوری (پنجابی) کشمیری، کری (کنبر)، دوارسمندری (تامل)، مبری (آندھرا) گوری (بہاری)، بنگالی، و دہلوی کے نام گناتے ہیں یہ زبانیں آج بھی رائج ہیں اور ہندوستان کے آئین میں درج ہیں۔ مگر ہندوستان کی ان بولیوں کے علاوہ سنسکرت زبان ہے جو پرانے زمانے سے برہمنوں کے نزدیک منتخب ہے لیکن عوام کو اس کی خبر نہیں اور ہر ایک برہمن بھی اس کی حدوں سے واقف نہیں۔ اس زبان میں چار وید ہیں علم و دانش کے آئین ہیں اور قصے اور افسانے سنسکرت ادب کا سبق پڑھاتی ہے اور رنگوں کو چمکاتی ہے صرف و نحو و علم و ادب میں سنسکرت عربی کے مشابہ ہے اور فارسی سے برتر۔

فارسی اور عربی کا مقابلہ خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں کیا ہے اور فیصلہ یہ دیا ہے۔ "پس از روی حجت معقول ضرورت است کہ پارسی بر عربی راجح باشد" ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ رائے پسند نہ ہو اس شعر سے حجت ختم کر دی ہے۔

مرا ہر حجتی کامد زسوی خویشتن گفتن
تو ہم گر حجتی داری زسوی بیرون کش

میں جو بھی دلیل پیش کرتا ہوں وہ میری اپنی ہے تیرے پاس بھی اگر کوئی دلیل ہے تو بھی اس کو سامنے لا۔

زبان بحثیں اس لئے نہیں دیں کہ وہ سفیہاں پر غضب و تعصب بیرون خواہند آمد ستارسی۔ عربی کی بحث میں بیان ہے کہ عربی کی فضیلت محض شرعی ہے۔ اس لئے اس کے اشعار میں تو سے استشہاد کیا ہے لیکن شعری نہیں۔ ثابت کیا ہے کہ تین وجہوں سے فارسی عربی پر سبقت لے جاتی ہے اول میزان فارسی میزان عربی سے بہتر ہے دوم عربی میں لفظوں کے معنی کئی کئی ہیں اور ایک معنی میں کئی کئی لفظ ایسا فارسی میں نہیں۔ تیسرے عربی میں حرف قافیہ ہے اور فارسی میں قافیہ بھی ہے ردیف بھی کہتے ہیں۔

"پس چوں شعر فارسی بہ حسن وزن و لطافت معنی و از دیار ردیف از او طبع زاید زاید این حسن او زیادہ را کجا اندازہ باشد"

پس فارسی عربی سے سخن و شعر کے نقطہ نظر سے بہتر ہے اور سنسکرت "نہ سپہر" میں کہتے ہیں اگرچہ دری شیریں و شکرین ہے لیکن سنسکرت میں ذوق عبارت اس سے کم نہیں" زبانوں کے موازنہ میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں عربی فارسی اور ترکی کے دنیا میں پھیلنے کا سبب بیان کرتے ہیں۔

ویں روش ہست کہن کان سخنی
کش بود از تاجوران کن مسکنی

یہی پرانا قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ بادشاہوں کے فرمانوں کے جاری کرنے یا ان کی اردو نہی کی وجہ سے زبان پھیلتی ہے۔

چو بہ کہ ومہ رسد از گفت شہان
عام شود در ہمہ اطراف جہاں

جب وہ بادشاہوں کی گفتگو سے ہو کر چھوٹے بڑے لوگوں تک پہونچتی ہے تو پھر ساری دنیا میں عام ہو جاتی ہے۔

مثالیں دی ہیں جب خلافت بغداد پہونچی تو پارسیوں کا زور رہا اور سب عرب آئین پارسی ہو گئے غوری اور ترک جن کی زبان فارسی تھی ہندوستان میں نمودار ہوئے تو ہم سب نے فارسی سیکھ لی۔ چونکہ عربی قرآن کے لئے چن لی گئی تھی اس لئے اس کی جگہ فصاحت کی دنیا میں نادر ہوئی۔ اصل یہ ہے زبانیں بہت ہیں اور ہر ایک زبان میں اپنا نمک ہے۔ پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ شور و غل کہ میری زبان اوروں سے بہتر ہے یا یہ کہ ایک شربت قند ہے اور دوسری سرکہ بیہودہ گفتگو ہے۔

زبانوں کے ساتھ علم بھی آجاتا ہے۔ جب یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہند کی ہوا تمام دنیا سے بہتر ہے اور صرف باغ جنت سے ایک درجہ کم تو ہند کی حکمت و دانش کا جائزہ لیتے ہیں۔ خسرو کے نزدیک یونان کا فلسفہ مشہور ہے لیکن ہندوستان نہ صرف اسی مایہ ہی نہیں بلکہ ہر علم میں بہتر فکر کا مالک ہے۔ یہاں منطق ہے نجوم ہے اور معقولات میں برہمنوں نے ارسطو کے دفتر قانون کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے علم طبیعی ریاضی، ہیئت، سب ہی ان کے یہاں ہیں مثلاً ابو معشر جو دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ستارہ شناس تھا دس برس ہند میں رہا اور اس نے بنارس میں علم نجوم سیکھا۔ وہ خود قبول کرتا ہے جو کچھ اس نے سیکھا وہ سب ہند کی سیاحی کی بدولت تھا۔

ہندسہ کا علم بھی ہندوؤں کا وضع کیا ہوا ہے۔ صرف ان کی ایک صفر کی ایجاد سے ریاضی نے اقلیدس علم کے درجہ پر پہونچے۔ صفر کی رقم دریافت کرنے کا سہرا آسانامی عالم کے سر پر ہے اور اس کے نام کے ساتھ ہند جوڑ دینے سے ہندسہ کی اصطلاح بنی ہے۔ یونانی اور دوسرے حکما آسا ہی کے شاگرد ہیں۔

ہندوستان کی برتری یہاں ختم نہیں ہو جاتی کلیلہ دمنہ کی کتاب جو بہترین حکمت کی کتاب ہے یہیں کی پیداوار ہے پھر شطرنج کا کھیل ہے جو ہند ہی کی ایجاد ہے جس سے طبیعت کھلتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی قوت بڑھتی ہے۔

زوحد و اندازہ بجستند کسی
غایت ونہایتش ندانست کسی

حد اور اندازے سے بڑھ کر اس کی حقیقت کو پانے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی اس کی غایت اور انتہا کو نہ سمجھ سکا۔

ہند کا سنگیت سارے جہاں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا دنیا بھر کے لوگوں نے اسے یہاں سے سیکھا ہے لیکن یہ ہنر ایسا ہے کہ تیس چالیس سال ریاضت کرنے پر بھی اس کی سبک آواز کو ادا کرنا مشکل ہے۔ اس سنگیت میں ایسی کشش ہے کہ ہرن کر بے ہوش ہو جاتا ہے بے تیر و کمان کے سنگیت کا طلسم اس کے دل میں پیوست ہو جاتا ہے اور بے چارہ جان دے دیتا ہے فرق دیکھیے عرب کا اونٹ حدی خواں کی آواز سنتا ہے تو اور تیز تیز چلتا ہے لیکن ہرن ہندی گانے سے ایسے حواس کھوتا ہے کہ مرنے کی نوبت آجاتی ہے۔

ہندوستان کے علم و فن سے مذہب کی طرف آتے ہیں کہتے ہیں یہ تو ٹھیک ہے ہندو ہماری طرح دین دار نہیں ہیں پھر بھی ہمارے اکثر مسئلوں کا اقرار کرتے ہیں۔ جن اصولوں پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں۔ وحدت، ہستی، قدامت، عدم سے ایجاد کی قدرت رزق دینے والے کا وجود جو ہنرور اور بے ہنر کو رزق دیتا ہے ہر بے جان کو جان دیتا ہے اور واپس لیتا ہے وہ خالق ہے اور اس کی حکمت اور حکم ازلی اور ابدی ہے وہ اپنے کاموں پر اختیار رکھتا ہے اور عملوں کے کرنے نہ کرنے کا مجاز۔

ہندو مذہب کا اور فرقوں سے موازنہ یوں کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتے ہندو ان سے کہیں بہتر اور نیک تر ہیں، دوسرے وہ ہیں جو وجود کی ہستی کے قایل نہیں لیکن برہمن اس کی ہستی کا یقین رکھتے ہیں، تیسرے روح میں یقین رکھنے والے ہیں لیکن ہندوؤں کو اس قسم کے نظریوں سے کوئی تعلق نہیں، پھر ایک فرقہ جسم کو حقیقی سمجھتا ہے مگر برہمن ان کا ساتھ نہیں دیتے، آخری فرقہ صابت الظون کو مانتا ہے لیکن ہندو توحید کا قایل ہے اور رسالت سے انکار کرتا ہے عنصری فرقہ چار خداؤں کا گمان رکھتا ہے مگر ہندو کہتا ہے ایک حق ہے اور اس پر قائم ہے مشبہوں کا فرقہ تشبیہ کی طرف مائل ہے ہندو تنزیہ کی طرف ایک فرقہ نور اور تاریکی کی تخلیق میں الجھا ہے لیکن ہندوؤں کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں۔ برہمن اعتراف کرتا ہے کہ اس کا معبود ایسا ہے کہ اس کا مثل ممکن نہیں کچھ ہندو پتھروں اور جانوروں سورج اور درختوں کو پوجتے ہیں تو وہ ان کو مخلوق سمجھتے ہیں اور دیوی دیوتا مورت مان کر پرستش کرتے ہیں لیکن ان کی پرستش اپنے پرکھوں کی تقلید ہے جسے وہ آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر میں اس شعر پر بحث ختم کر دیتے ہیں۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

ہر ایک قوم کا ایک مسلک اور مذہب اور قبلہ ہوتا ہے لہذا میں نے بھی اپنا قبلہ ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف سیدھا کر دیا ہے (مراد معشوق یا مرشد سے ہے)

اپنے ذاتی مذہب کے بارہ میں صاف صاف بتا دیتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

میں تو عشق کا کافر ہوں مجھ کو مسلمانی کی ضرورت نہیں ہے میری ہر ایک رگ تار بن گئی ہے مجھ کو زنار کی ضرورت نہیں ہے۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بتوں کی پوجا کرتا ہے۔ ہاں ہاں کرتا ہوں مجھ کو مخلوق سے کچھ واسطہ نہیں۔

یہاں تک تو میں نے خسرو کے کلام کے اس حصہ پر توجہ دلانے کی کوشش کی جس کا براہ راست ہند اور ہند کی تہذیب کے ساتھ تعلق ہے، اب اس مقالہ کے دوسرے جزو میں کچھ اور موضوعات پر بحث ہے۔ خسرو کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مجھے ڈر ہے اگر میں اس پر کچھ لکھوں تو مضمون اتنا بڑھ جائے گا کہ آپ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگے گا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خسرو کے یہاں شعریت کی تمام خوبیاں درجہ کمال پر ملتی ہیں۔ خسرو صنائع و بدائع کے استاد اور نئی صنعتوں کے موجد ہیں۔ تشبیہ اور استعارہ میں مشکل سے کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا ہے انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھائی اور اسے اس خوب صورتی کے ساتھ نبھایا کہ باید و شاید۔ رزم کے بیان میں انتہائی جوش و خروش ہے، بزم کی تصویروں میں دلوں کو موہنے والے روپ رنگ، حمد و نعت اور پند و نصیحت کو نظم میں ایسا باندھا ہے جیسے لڑیوں میں آبدار موتی پرو دیئے ہوں۔ عشق و محبت کی داستانیں برہا اور ملن کی کہانیاں درد بھرے لطف کے ساتھ سناتے ہیں اور دلوں کو بے چین کر دیتے ہیں۔ غرض جذبوں کے آثار چڑھاؤ کا برتن بتلاتا ہے۔ کوئی پردین کلاونت سرگم کے راگ سنوار رہا ہے۔ خسرو کی شاعری ہندوستانی فضا میں پروان چڑھی اس میں ہندوستانی رنگ چوکھا آیا۔ لیکن اس وقت موقع نہیں کہ اس طرف زیادہ دھیان دیا جائے۔

میں اس صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ خسرو کے کلام میں حکمت سیاست اور تصوف کے کیسے کیسے بے بہا رتن ہیں، اس زمانہ کے ہندوستانیوں کا اخلاق کن بنیادی قدروں پر قائم تھا: سیاست کے کون سے اصول تھے جن پر حکومت کا دارومدار تھا، کس قسم کے عالم گیر نظریے تھے جو زندگی کو معمول کی سطح سے اونچا اٹھاتے تھے اور انسانی ذہنیت کو جلا دیتے تھے، کون سے اعتقاد تھے جو جیون کی ناؤ کو لہروں کے تھپیڑوں اور ہواؤں کے جھونکوں کے باوجود کنارے کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔

مثنوی شیریں خسرو میں شب باروس کے ہیجان انگیز بیان کے بعد جسے پڑھتے وقت آنکھیں جھک جاتی ہیں، اور زبان لڑکھڑاتی ہے دفعتاً کلام کا رخ بدلتا ہے اور حکمت و دانش کی مجلس آراستہ ہوتی ہے۔ عشق اور کامرانی نغمہ شراب کی گرما گرمی سے طبیعت پھرتی ہے اور علم و دانش کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ ندیموں میں ایک ملقب بزرگ امید نام ہیں جن سے خسرو سوال کرتا ہے اور وہ جواب دیتے ہیں، اس زمانہ کے فلسفہ اور سائنس کا خاکہ کھینچ دیتے ہیں جو ضرور دلچسپ ہے۔ سوال و جواب سننے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سب کے لئے میرے پاس وقت نہیں چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

سب سے پہلا سوال تو وہی پرانا مسئلہ ہے جو انسانی تاریخ کی ابتدا سے آج تک ہمارے دماغوں کو پریشان کر رہا ہے یعنی دنیا جہان کی پیدائش کا مسئلہ۔ خسرو نے اس زمانہ کے فلسفہ کی روشنی میں جواب دیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ حقیقت اولیٰ ازلی ہے عقل اول ظہور میں آئی اور اس سے دو ہستیاں واجب اور ممکن واجب سے ترتیب وار دس عقلیں ظاہر ہوئیں جن میں دسویں عقل فعال ہے ہستی امکانی سے نو آسمان جو زحل، کیوان، برجیس، مریخ، خورشید، زہرہ، سیاروں اور چاند کی سیر کے میدان ہیں، ارسطو کے وقت سے عالم کی پیدائش کا یہی نظریہ تھا جسے یورپ کے سولہویں صدی کے ستارہ شناسوں نے پلٹا اور نئی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرز پر چار عنصروں کا سوال حل کیا ہے۔ لیکن پوچھئے یہ عنصر کس اصلی مادہ سے نکلے ہیں تو کہتے ہیں کہ عقل اس کے سمجھنے سے معذور ہے۔ پھر پانچویں عنصروں کا ذکر کرتے ہیں یعنی مٹی، ہوا، پانی، آگ اور ایتھر اور ان کی صفتیں بتاتے ہیں۔ ان میں آگ اور ہوا کا مرتبہ باپ کا اور پانی اور مٹی کا ماں کا ہے ان سے موالید ثلاثہ وجود میں آتے ہیں۔ جن کے نام معدن، نبات، اور حیوان ہیں اور ان کی بہترین اولاد آدمی ہے۔ آدمی سے کیا مراد ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ

غرض گر شہوت است و خورد و آشام
خران را ہم توان کرد آدمی نام

اگر شہوانی خواہشات اور کھانے پینے کو مقصد قرار دیا جائے تو یوں تو گدھوں کو بھی آدمی کہہ سکتے ہیں۔

اگر سونے اور چاندی کے معاملے میں اس کو حاصل کرنے کے لئے کوئی چابک دستی سے کام کرتا ہے تو سمجھ لو کہ لدو گھوڑا ہے جو بوجھ کی وجہ سے لنگڑا ہو گیا ہے۔

گرش گنج و درم باشد جہانی
چو در بینی بود محتاج نانی

اگر خزانہ اور روپیہ پیسہ ہی کسی کے لئے دنیا ہے تو اگر تم بغور دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی روٹی کا محتاج ہے۔

چو این سرمایہ نبود باخرد جفت
نشاید بے خرد را آدمی گفت

اگر دولت کو عقل سے متحد نہ کیا جائے تو بے عقل شخص کو انسان کہنا موزوں نہیں

پس آنکس مردم آمد ز آفرینش
کہ ہستش برخرد قانون بینش

پس روزنامول سے صحیح معنوں میں مرد وہی ہے جس کی نگاہ عقل سے نمایاں ہو۔

یعنی اگر آدمیت سے مراد محض کھانا پینا اور اولاد پیدا کرنا ہے تو گدھے کو بھی آدمی کہہ سکتے ہیں۔ اگر کوئی سونے چاندی ہتھیانے میں تیز ہے تو وہ اس جانور کی مثال ہے جو ٹانگ سے لنگڑا ہے اور اگر روپیہ پیسہ ہی دنیا ہے تو اس کے اندر آدمی روٹی سے محتاج ہے چونکہ سرمایہ کا عقل سے جوڑ نہیں اس لئے بے عقل کو آدمی کہنا زیب نہیں دیتا اس کو اس عالم میں آدمی کا مرتبہ دے سکتے ہیں جس کی زندگی کے مقصد عقل کے قانون سے بندھے ہیں۔

اس مضمون کو سنسکرت کا شاعر اس طرح باندھتا ہے۔

یعنی جن کے پاس نہ ودیا ہے نہ تپ (ریاضت) اور نہ دان دیا ن ہے نہ شیل نہ گن ہے اور نہ دھرم وہ لوگ اس دنیا میں زمین کا بوجھ ہیں آدمی کے روپ میں چلتے پھرتے جانور ہیں۔

عقل کیا چیز ہے؟ تو اس کا جواب دیتے ہیں کہ جو چیز انسان کو عاقبت یعنی آئندہ کی طرف مائل کرے اور اپنے ولی نعمت کی یاد دلائے کچھ اور سوالات کے بعد سوال ہوتا ہے کہ خیال کی کیا حقیقت ہے؟ جواب یہ ہے کہ روح چھپا ہوا راز ہے اسے تو کوئی جانتا نہیں لیکن دماغ معنی کا آئینہ ہے جس میں ذہنی اور خیالی طاقت ہے۔ یہ آئینہ بالکل صاف اور بے رنگ ہے اور اس میں روح کے فیض سے عکس پیدا ہوتے ہیں۔ موجود اور غیر موجود چیزیں اس پر تصویریں بناتی ہیں جیسے موم پر نقش اور زمین آسمان سورج اور ستارے موتیوں کی طرح اس سیمابی سمندر کو بھر دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب اصلی معنی کی تصویریں ہیں جو آئینہ میں منعکس ہیں۔

بادشاہ کا بزرگ امید سے آخری سوال ہے حکومت کے متعلق بادشاہوں کا کیا دستور ہونا چاہئے؟ یہیں سے خسرو کے سیاسی نظریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو خسرو شیریں تک محدود نہیں اکثر مثنویوں میں پھیلا ہوا ہے۔

خسرو کے فکر کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ سخت دشمنی کا سلوک کرتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، لیکن ہم وطنوں کے مذہب اور تمدن کا بلا تفریق مذہب احترام کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب سنسکرت اور ہندی زبانوں اور ہندو رسموں اور رواجوں کا بیان محض رواداری سے نہیں طرفداری کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر منگولوں کا بیان دیکھئے۔ ان کے چہرے مونہے کپوں جیسے ہیں جن میں جھریاں اور سلوٹیں پڑی ہیں، ناکیں اتنی چوڑی ہیں کہ چہرہ کے ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلی ہیں، قبر کی طرح گندی اور بھٹی کی طرح پانی سے بھری ہیں منہ پھٹے ہیں اور ان سے رال بہتی ہے۔ ناک کے بال ہونٹوں تک لٹکے ہیں اور مونچھیں نہایت

ہیں۔ داڑھی تھوڑی پر چپکی ہے کیوں کہ ان کے برفانی چہروں پر سبزہ نہیں اگ سکتا حقیقت میں ان کا جوڑوں سے بھرا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اور جڑ زمین پر کاٹے تل پھیلا دیتے ہیں پیٹھ کی کھال کیمخت جیسی سخت اور گدڑی کا چمڑا جوتوں کے قابل ہے آدھا بدن کھال کے پاس سے چھیل گیا ہے اور آدھا سر جوؤں کے ڈر سے گھوٹ دیا ہے۔ ان کی خوراک تے سے بدتر۔ دوران کے بدن چوڑے، ہڈی کے کتوں مانند ہیں۔ غرض منگول صورت اور سیرت سے نہایت مکروہ ہیں منگولوں کی جیسی درگت کی ہے اس حد تک تو نہیں لیکن حکومت کے جتنے دشمن تھے ان سب کے لئے لعن اور تشنیع کے کلمے استعمال کئے ہیں گجرات کے راجا کو رائے بدہ سماد کے بنس دیو کو اہرمن، ورنگل کے راجا کو ابلیس دیو پانڈیا کو رائے گمراہ اور گبر لعین اس طرح قتلغ خواجہ کو ملعون کافر کہا ہے۔ بعض موقعوں پر لکھا ہے کہ دنیا ہندوؤں سے خالی ہو گئی ظاہر ہے یہاں مراد یہ نہیں ہے کہ سب ہندوؤں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس جگہ کہنا صرف یہ ہے کہ ہندو راجے مہاراجے مطیع اور فرماں بردار ہو گئے اور دلی کے بادشاہ کو باج اور خراج دینے لگے۔ جہاں لفظ ہندو سے مذہب کی طرف اشارہ ہے وہاں وہی روا داری اور حقیقت نگاری ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن السعدین کی ایک مشہور غزل کے چند شعر دلچسپی سے خالی نہیں۔

اے دہلی و اے بتان سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

اے دہلی اور اس کے سادہ لوح محبوبو جنھوں نے پگڑی باندھ رکھی ہے اور جو ٹیڑھا چیرہ لگائے ہوئے ہیں۔

منکران بہ نیز ازانکہ ہستند
از عنایت ناز خود لادہ

وہ کسی حکم کی تعمیل نہیں کرتے کیوں کہ خود اپنے ناز و انداز کی بنا پر اپنی ہی بات چلاتے ہیں۔

خورشید پرست شد مسلمان
زین ہندوگان شوخ و سادہ

اس شوخ اور سادہ حسین ہندو محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کو پوجنے والے ہو گئے ہیں۔

ہندو رسموں کی بھی رعایت منظور تھی چنانچہ ستی کے بارہ میں کہتے ہیں۔

گرچہ در اسلام روا نیست چنیں
لیک چو بس کار بزرگست بہ بین

اگرچہ اسلام میں یہ جائز نہیں ہے لیکن اگر تو غور کرے تو بہت بڑا کارنامہ ہے۔

گر بہ شریعت بود این نوع روا
جان بدہند اہل سعادت ہوا

اگر شریعت میں اس قسم کی چیز جائز ہوتی تو سعادت مند زیادہ سے زیادہ جان دینے کی کوشش کرتے۔

خسرو کے سیاسی خیالات کے اور پہلو بھی غور طلب ہیں۔ حکومت کے متعلق ان کا نظریہ ہندوستانی اور ایرانی عقیدوں سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں راجا کا درجہ بہت ہی اونچا مانا جاتا ہے، راجا سے اگر کوئی اوپر ہے تو ایشور۔ کالی داس نے رگھو خاندان کا سورج دیوتا سے رشتہ ملایا ہے اور تعریف میں ایسے بلند آہنگ اور پرشکوہ لفظ استعمال کئے ہیں کہ ذہن پر عجیب اثر پیدا کرتے ہیں۔

یعنی یہ خاندان نسب سے صحیح اور پاک دامن اور اپنے کاموں میں ہمیشہ کامیاب ہے سمندر کے کناروں تک زمین کا حاکم ہے اور آسمان کے افق تک اس کی سواری کا میدان پھیلا ہے۔ عبادت میں شرع کا پابند، خیرات میں آرزوؤں کا پورا کرنے والا، ملزموں کو سزا دینے میں اور وقت کی پابندی میں سختی سے کاربند ہے۔ دولت اس غرض سے جمع کرتا ہے کہ احتیاج مندوں میں تقسیم کر دے۔ کم گو اس لئے ہے کہ سچائی ہاتھ سے نہ جائے۔ ملکوں کو شہرت کی خاطر فتح کرتا ہے اور اولاد کے لئے خانہ داری کے فرض ادا کرتا ہے۔

کالیداس اس کے ساتھ ساتھ خسرو کے شاعرانہ تمجید کے شعروں پر کان لگایئے۔ علاء الدین کو جن لفظوں سے مخاطب کرتے ہیں ان میں وہی تان ہے جو سنسکرت میں سنائی دیتی ہے سنسکرت اور فارسی کے آہنگ میں الف ممدودہ نے جو شان پیدا کر دی ہے وہ بیان سے باہر ہے فرماتے ہیں۔

شہا گنج بخشا کرم گسترا
معانی شناسا سخن داورا

اے خزانہ بخشنے والے اور مہربان شہنشاہ اور حقائق کو سمجھنے والے اور شعر وادب کے مربی۔

مرا عمر گز شصت بالا گذشت
ہمہ پیش شاہان والا گذشت

میری عمر جو ساٹھ سے اوپر ہو چکی ہے۔ ساری کی ساری بلند مرتبہ شاہان کے ساتھ گذری۔

از ان پس کہ در شہ ستانی شدم
تونگر، گنج علائی شدم

اس کے بعد سے میں مستقل طور پر بادشاہوں کا مدح سرا ہوا اور علاء الدین کی بخششوں سے دولت مند بن گیا ہوں اور پھر تعریف یوں کرتے ہیں۔

کہست از عون وعدل وبذل واحسان شہ عالم
جہاں بیغم امان محکم طرب بیحد خوشی بے مر

امیر خسرو مؤرخ کی حیثیت سے

خلیق احمد نظامی

امیر خسرو کے معاصر اور دوست ضیاء الدین برنی کا بیان ہے۔[1]

"امیر خسرو در نظم و نثر پارسی کتب خانہ تصنیف کردہ است"

(امیر خسرو نے فارسی نظم و نثر میں ایک کتب خانہ تصنیف کیا ہے) ایک اور ہم عصر تذکرہ نویس امیر خورد نے اس کی تصدیق اس طرح کی ہے۔

"از کتبے کہ انشاے او، کتب خانہ پُر گشت"[2]

(اُن کی تصنیف کی ہوئی کتابوں سے ایک کتاب خانہ بھر گیا) لیکن ان دونوں میں سے کسی نے یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ کتابیں کس کس فن اور موضوع سے تعلق رکھتی تھیں۔ برنی نے علاء الدین خلجی کے عہد کے مشاہیر صوفیہ، علماء، شعراء، مؤرخین اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین کے نام گناتے ہیں اور لکھا ہے کہ چشم روزگار نے باکمال لوگوں کا ایسا مجمع پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس فہرست میں امیر خسرو کا نام شعراء کے زمرہ میں آیا ہے۔ مؤرخین میں امیر ارسلان کلاہی، کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن امیر خسرو کا نام نہیں لیا گیا۔ کیا برنی کی نظر میں امیر خسرو کا مؤرخ کی حیثیت سے کوئی امتیازی مقام نہیں تھا؟ لندن یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر پیٹر ہارڈی نے امیر خسرو کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شاعر تھے، مؤرخ نہ تھے۔[3] اگر اس رائے کی بنیاد صرف یہ خیال ہے کہ ان کی ادبی کاوشوں کا حقیقی مرکز اور محور شاعری تھی، تو اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں، لیکن اگر اس کا مقصد امیر خسرو کی تصانیف کی تاریخی اہمیت اور افادیت کو کم کرنا ہے، تو یہ رائے غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ اگر تاریخ نام ہے صرف سیاسی واقعات کی کھتونی کا، تو امیر خسرو یقیناً مؤرخ نہیں تھے، لیکن اگر تاریخ عبارت ہے انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو کی تفسیر و تعبیر سے، تو امیر خسرو کی تصانیف ہمارے تاریخی ورثہ کا بہترین سرمایہ، اور قرونِ وسطیٰ کی تہذیب کی بہترین آئینہ دار ہیں۔ عصرِ حاضر کا مؤرخ جب ہندی قرونِ وسطیٰ کی تہذیب اور اس کے جلوۂ صد رنگ کا جائزہ لینا چاہتا ہے تو اس کو اپنی معلومات کا سب سے بڑا سرچشمہ امیر خسرو ہی کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی اُن مثنویوں میں بھی جن کا بظاہر ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہندوستانی تہذیب کے رنگ و بو ہی سے اپنے مرقعے تیار کیے ہیں۔ اس عہد کی روح، جس کو سمجھے بغیر تاریخی عوامل کا تجزیہ ممکن نہیں، اُن کی تصانیف کے ہر صفحے پر متحرک نظر آتی ہے۔ امیر خسرو نے ماضی کی داستانیں نہیں لکھیں، اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

من از دیدۂ خویش گویم سخن
نہ ز افسانہ و داستانِ کہن[4]

اور ان مشاہدات کا تنوع، اُن کے ذہن افق کی وسعت کا رہین منت ہے۔ تماشاگاہِ عالم کو انھوں نے ہر ہر پہلو سے دیکھا تھا۔ کبھی دربارِ شاہی سے اس پر نظر ڈالی، کبھی خانقاہوں میں بیٹھ کر اس کی حقیقت کو سمجھنے کی جستجو کی۔ دُنیا اور اس کی بوالعجبیوں کو جو حاصلِ زیست سمجھتے تھے اُنھیں بھی قریب سے دیکھا، جنھوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا اُن کے پاس بھی پہنچے۔ "آرائش و رنگ و بو" کی دنیا کا بھی جائزہ لیا اور زہد و تقویٰ اور ریاضت و مجاہدہ کی زندگی کا بھی مزہ چکھا۔ لڑائی کے میدان میں انسانی جسموں کو پارہ پارہ ہوتے اور خانقاہوں میں انسانی دلوں کو جوڑتے ہوئے بھی دیکھا۔ بادشاہوں کی ہوس ملک گیری کے تماشے بھی دیکھے اور نانِ شبینہ سے محتاج مفلسوں کے دل کی دھڑکنوں کو بھی سنا، وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل بھی کہی اور خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات بھی کی۔ دہلی سے ارنگل اور ملتان سے لکھنوتی تک ہندوستان کے ہر ہر گوشے میں پہنچے۔ یہاں کے پہاڑ، دریا، صحرا، موسم، پھل پھول، جانور، زبانیں، رسم و رواج ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا۔ ہندوستانی زندگی کے اس وسیع اور بھرپور تجربہ نے جو بصیرت ان میں پیدا کر دی تھی، وہ اُن کی تاریخی تصانیف میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

امیر خسرو کا تاریخی مطمح نظر دربار تک محدود نہیں تھا۔ وہ دربار میں رہتے ہوئے بھی، دربار کے نہیں تھے اور فوج میں ملازم ہونے کے باوجود جنگ و جدال سے نفرت کرتے تھے۔ کوکبۂ شاہی کی چمک و دمک اُن کی آنکھوں کو کبھی خیرہ نہ کر سکی اور عوام کی زندگی ہی اُن کی دلچسپیوں کا مرکز رہی۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی جو تصانیف ہم تک نہ پہونچ سکیں اور ضائع ہو گئیں وہ غالباً وہ تھیں جن کا تعلق بادشاہوں سے نہیں تھا، بہ الفاظ دیگر جو عوام سے متعلق تھیں۔ بادشاہوں سے متعلق لٹریچر کے تحفظ کا اہتمام تو شاہی کاتب اور مصوروں نے کر دیا، دوسرے لٹریچر کو یہ سہولت میسر نہ آسکی اور دست بُردِ زمانہ

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۹ [2] سیر الاولیاء ص ۳۰۲ [3] HISTORIANS OF MEDIEVAL INDIA, صفحہ ۹۳ [4] نہ سپہر صفحہ ۹۳

[illegible] ہوگیا یا علم سینہ بن کر رہ گیا۔

[illegible] کہ انھوں نے اپنی بیشتر کتابیں بادشاہوں کی ایما پر لکھی تھیں لیکن [illegible] حال بھی اُن کے تصور کی ہمہ گیری کو متاثر نہ کرسکی تھی۔ انھوں نے عوام کی [illegible] اور رزم و بزم کی داستانیں بیان کرلی کرتے جب طبیعت [illegible] جاتی ہے تو ان کا ذوق ایسے گوشوں کی طرف لے جاتا ہے جو عوامی زندگی سے متعلق ہیں اور وہ کچھ دیر عام لوگوں، صحراؤں، جوگیوں، زبانوں، رسوم و رواج کا ذکر کر کے اپنے منہ کا ذائقہ بدلتے ہیں۔ یہاں وہ زندگی کی حقیقتوں سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں اور اُن کی شاعری انسانی فطرت سے سرگوشیاں کرتی نظر آتی ہے۔ دکن میں علاء الدین خلجی کی فتوحات کا نقشہ کھینچنے پر پورا زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں لیکن ایک مختصر سے جملے میں اس تباہ کاری پر اپنے ذاتی تاثرات اس طرح ظاہر کر دیتے ہیں۔ ثم یردی العظام فی الارض۔

علاء الدین خلجی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں ملک گیری کی ہوس کے خلاف اُن کے حقیقی جذبات متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور سلطان کی روح سے مخاطب ہو کر کہا۔

چو ہرگز خاک زاآمد باز خاک ست
خوش آں کس کز غم بیہودہ پاک ست
چرا باید گرفت آں کشور و شہر
کزاں ندہند بیش از چار گز بہر

قرونِ وسطیٰ کے لٹریچر کو صحیح پس منظر میں سمجھنے اور صحیح نتائج اخذ کرنے کے لئے مصنف کی نفسیات، اس کے ذہنی محرکات، ماحول اور اندازِ بیان کا تجزیہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس طرح نہ صرف مصنف کی شخصیت بے نقاب سامنے آجاتی ہے بلکہ اس کی فکر اور اس کے جذبات کی تہ تک رسائی ممکن ہوجاتی ہے۔ امیر خسرو کی ہر تصنیف ایک علیحدہ ذہنی اور جذباتی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ کیقباد کے ہنگامہ ہائے نا ؤنوش سے طبیعت منغّض ہے، لیکن سلطان کی زندگی اس کے علاوہ اور ہے کیا، ذہن دوسرے مناظر اور کیفیات کی نقش گری کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اُس عہد کے خاتمہ کا اعلان کرتی ہے جس میں اُن کے باپ امیر سیف الدین محمود نے عزت اور شہرت حاصل کی تھی اور التمش کی فتوحات کا دائرہ بڑھانے میں معاون ہوئے تھے۔ ان ترک امراء کے سایہ میں خود امیر خسرو کے ذوقِ سخن نے پرورش پائی تھی، اب وہ عہد ختم ہوتا ہے اور اس کے بعض اکابر پابہ زنجیر نظر آتے ہیں اس منظر سے ان کا دل روتا ہے لیکن چہرہ پر مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ علاء الدین خلجی کے عزم ملک گیری میں ان کو التمش کے ادھورے خواب کی تعبیر دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی فتوحات میں تباہی و بربادی کے مناظر اُن سے برداشت نہیں ہوتے۔ "ملک گیری" کے مقابلہ میں "نظم و نسق" کو ترجیح دے کر سلطان کی ان کوششوں کا ذکر کرنے لگتے ہیں جن کا مقصد اخلاق کی درستگی اور ایک بہتر معاشرہ کی تشکیل تھا۔ مبارک خلجی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن نظر اس کے معائب سے نظر نہیں ہٹتی اور جگہ جگہ

اپنے مخصوص انداز میں اس پر گرفت کرتے جاتے ہیں۔ امیر خسرو کی تاریخی تصانیف کے سرسری مطالعہ سے شاید یہ گمان ہو کہ وہ سب بادشاہوں کی ایک سی ہی تعریف کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، لیکن اگر ذرا گہرائی میں اُترا جائے تو نفسیات کے نازک تار و پود نظر آنے لگتے ہیں۔

تاریخی اہمیت کے پیش اگر امیر خسرو کی تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو پورے لٹریچر کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) پانچ دیوان "تحفۃ الصغر" "وسط الحیوٰۃ" "غرۃ الکمال" "بقیہ نقیہ" "نہایت الکمال" جن کی بنیادی نوعیت ادبی ہے لیکن ان میں ایسے قصائد شامل ہیں جن سے اس عہد کی بعض اہم شخصیتوں اور اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۲) خمسہ "مطلع الانوار" "شیریں خسرو" "آئینہ سکندری" "ہشت بہشت" "مجنوں لیلیٰ" ان مثنویوں کا موضوعِ سخن ہندوستان سے تعلق نہیں رکھتا لیکن ان میں جگہ جگہ ہندوستانی تہذیب اور معاشرت سے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات فراہم کردی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے امیر خسرو کی مثنوی نگاری کو "تاریخی نقاشی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) "اعجاز خسروی" ضخیم نثری کارنامہ ہے جس میں انشاء کے نمونے درج ہیں بعض اہم تاریخی دستاویزات بھی اس میں شامل ہیں جن سے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) تاریخی مثنویاں اور تاریخ ("قران السعدین" "مفتاح الفتوح" "دولرانی خضر خاں" "تغلق نامہ" اور "خزائن الفتوح") ان سب کا موضوع تاریخی ہے اور اس عہد کے مختلف سیاسی اور تہذیبی حالات کے لئے بیش بہا ماخذ کی حیثیت ہے۔ اس لٹریچر کی تاریخی اہمیت کو سمجھنے کے لئے بعض حقائق کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ادب کی ہر صنف کا خواہ وہ قصیدہ ہو یا مثنوی، تاریخ ہو یا تذکرہ ایک علیحدہ اندازِ بیان ہوتا ہے جس کی پابندی مروجہ اصولوں کے مطابق ہر شاعر اور انشاء پرداز کو کرنی پڑتی ہے۔ قصائد کے بہت سے حصے محض زیبائش کے لئے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی اصنافِ سخن سے تمام حشو و زوائد کو علیحدہ کر کے ہی تاریخی حقائق کو سمجھا جاسکتا ہے۔ خود امیر خسرو کا خیال تھا ؎

کارائش کردنی زحد بیش
رخسارۂ قصہ راکند ریش

(۲) یہ بیشتر لٹریچر بادشاہوں کے ملاحظہ کے لئے اکثر اُن کی ایما پر وجود میں آیا تھا۔ شاعری اور پھر درباری آداب، دونوں کا تقاضہ تھا کہ عبارت آرائی اور زورِ سخن میں پوری کوشش کی جاتے۔ قرونِ وسطیٰ میں جب کوئی نیا علاقہ فتح ہوتا تھا تو "فتح نامے" لکھوا کر دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے تھے اور ان میں پورا زورِ بیان صرف کیا جاتا تھا۔ یہی انداز تاریخوں کے لئے بھی اختیار کرلیا گیا تھا۔ اس لٹریچر میں مبالغہ آرائی کی حیثیت بالکل زرق برق لباس کی ہے جس کے اندر اصل جسم پوشیدہ ہوتا ہے۔ کارلائل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مصنف کا اندازِ بیان' اس کا جسم ہے۔

.... لباس نہیں۔ اگر ملبوس آرائی کا لبادہ اُتار دیا جائے تو حقیقت بالکل واضح نظر آجاتی ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی نے صحیح لکھا ہے کہ امیر انسان کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شاعری کے ساغر میں حقیقت ہمیشہ عریاں نظر آتی ہے۔"

(۳) تاریخی اعتبار سے ان تصانیف کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ امیر خسرو خود ان واقعات کے شاہد ہیں۔ اس لئے جزئیات اور تفصیل کو واقعہ کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ عمارتوں کی تصویر، موسموں کی تفصیل، لباس کی جزئیات سے وہ ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ دنیا زندہ ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ زمان ومکان کی ساری بندشیں ٹوٹ چکی ہیں اور ہم اسی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔

(۴) امیر خسرو نے اکثر جگہ واقعات کی تاریخی ترتیب کا خیال رکھا ہے اور سنین کی پابندی کی ہے۔ ضیاء الدین برنی کے یہاں تاریخوں کا فقدان ہے۔ معاصر مورخین کی اس کوتاہی کو امیر خسرو نے بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک خلجی اور غیاث الدین تغلق کے عہد کے بہت سے واقعات کی تاریخی ترتیب، امیر خسرو کی تصانیف ہی کی بنا پر کی گئی ہے۔

(۵) ہندوستان کے مختلف مقامات سے ذاتی واقفیت کی بنا پر انھوں نے شہروں اور قصبات کا جو حال لکھا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ "مفتاح الفتوح" اور "خزائن الفتوح" میں مختلف مہمات کے سلسلہ میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے اس سے تاریخی واقعات کو صحیح پس منظر میں سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(۶) امیر خسرو نے مختلف موقعوں پر اپنے جذبات کو خاموش لیکن مضبوط طریقہ پر ظاہر کر دیا ہے۔ بعض جگہ واقعات کی تفصیل اس انداز سے دی ہے کہ ایک تاریخی ذہن ان میں زوال کے اثرات کا صاف اندازہ لگا سکتا ہے۔ "نہ سپہر" میں مبارک خلجی کی شکار میں دلچسپی اور بزم آرائیوں کا نقشہ، خلجیوں کی بربادی کی پیشین گوئی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ "قران السعدین" میں کیقباد کے دربار کے ہنگامہ ہائے ناؤ نوش شاہی خاندان کی تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"تحفۃ الصغر" امیر خسرو کے ۱۶ سال سے ۱۹ سال کی عمر تک کے کلام پر مشتمل ہے اس میں بلبن، شہزادہ محمد، حاتم خاں، اختیار الدین، کشلو خاں، توام الملک،... عزیز الدین کے نام قصائد شامل ہیں جن سے اس دور کے امراء کے حالات کی ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے۔ "وسط الحیوٰۃ" میں ۲۲ سال کی عمر کا کلام ہے۔ اس میں ۵۸ قصائد شامل ہیں۔ جن کا تاریخی مواد تیرھویں صدی کی تاریخ کی ترتیب وتدوین کے لئے ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ منگولوں کے حملوں، شہزادہ محمد کی شہادت اور طغرل کی ہزیمت کا تفصیلی حال ان میں موجود ہے۔ منگولوں نے ایک جنگ میں امیر خسرو کو بھی قید کر لیا تھا۔ اپنی پریشانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

اسیر گشتم و زبیم آں کہ خوں ریزد
نمی نماند زخوں در تنم نحیف و نزار

جو منگول اُن کو گرفتار کر کے لے جا رہا تھا اس کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

فرو رفتہ کمرایش کردہ رہ می رفتا | نشستہ بر فرسے چو پلنگ در کہسار
کشادہ از دہنش نکہتے چو بوئے بغل | فتادہ بر زنخش سبلتے چو موئے زہار
زماندگی قدمے گر بماندے تشنہ | گہے ملفانہ کشیدے بخشم گہ تکرار

منگولوں کی جو تصویر انھوں نے پیش کی ہے وہ اس دور کے تاریخی لٹریچر میں سب سے زیادہ مکمل نظر آتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں، چوڑا تمتماتا چہرہ، چپٹی ناک پھیلے نتھنے، داڑھی کے دوچار بال ٹھوڑی سے لٹکے ہوئے، لمبی لمبی مونچھیں، گھٹا ہوا سر۔ تاتاری زبان میں نعرے لگاتے ہوتے۔ یہ تھے منگول جنھوں نے تیرھویں صدی کے ہندوستان میں آگ اور خون کا ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔

"غرۃ الکمال" میں امیر خسرو کا ۳۴ سال سے ۴۳ سال کی عمر تک کا کلام شامل ہے۔ دیباچہ میں مختصراً اپنے حالات بیان کرتے ہوتے اس عصر کے ادبی رجحانات کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں۔ فارسی اور عربی شاعری کی بنیادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کے بیان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فارسی کے ذریعہ ملک میں ایک انتظامی یکسانیت پیدا ہو گئی تھی۔ "غرۃ الکمال" میں ۹۰ سے زیادہ قصیدے ہیں جن میں خلجی سلاطین اور شہزادوں مثلاً ارکلی خاں، الماس بیگ، الغ خاں کے بہت دلچسپ حالات درج ہیں۔ علاء الدین خلجی کے ایک بیٹے کی پیدائش پر جو قصیدہ لکھا ہے اس میں دہلی کی زینت وآرائش اور اس کی تمدنی زندگی کی ایک دلاویز تصویر پیش کی ہے۔ "بقیہ نقیہ" میں علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد کا کلام ہے۔ اس میں ۶۳ قصیدے ہیں جو قطب الدین مبارک خلجی، الماس بیگ، تاج الدین دبیر وغیرہ کے نام ہیں۔ رمضان اور عید پر بھی نظمیں شامل ہیں جن میں اس دور کی مذہبی زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ "نہایت الکمال" امیر خسرو کا آخری دیوان ہے جس میں تغلق سلاطین، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے نام قصائد ہیں۔ ایک مثنوی "در تعریف تغلق آباد" ہے جس میں دورِ تغلق کی اس نئی آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثنوی "صحیفۃ الاوصاف" میں قطب آباد (دیوگیر) کا حال لکھا ہے۔ یہ مثنوی تاریخی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ الغ خاں جو بعد کو محمد بن تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا، ۲۲، ۱۳۲۱ء میں دیوگیر کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں دیوگیر کا نام قطب آباد تھا۔ امیر خسرو بھی اس کے ساتھ گئے تھے۔ انھوں نے جس طرح اس شہر کی آبادی، جغرافیائی خوبیوں اور موسم کی دلکشی کا ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ جب محمد بن تغلق نے دیوگیر کو ایک جنوبی دارالسلطنت کی شکل دینی چاہی تو امیر خسرو کے خیالات کا پرتو بھی اس کے ذہن پر کام کر رہا تھا۔

"خمسہ" ایک ادبی شاہکار ہے جس میں امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے مشہور ادبی کارنامے کا جواب دے کر ہندوستان کی علمی سربلندی کا سامان مہیا کیا ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان کی معاشرت اور تہذیب کے متعلق نہایت اہم اور دلچسپ حوالے ملتے ہیں۔ یہاں کے جانوروں، پھل پھول، کپڑوں، فنون، سنگتراشی، مذہبی رسوم، شطرنج، ساز وموسیقی وغیرہ کے متعلق جو تفصیلات اس میں بکھری ہوئی ہیں اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تمدنی زندگی کے بہت سے گوشے روشن ہو جائیں گے۔

۱۳ عہ اعجازِ خسروی، کو امیر خسرو نے ۰، سال کی عمر میں مکمل کیا تھا۔ اس میں اُن کی نثری تصانیف اور ابتدائی دور کے کچھ رسائل بھی شامل ہیں۔ گو اس تصنیف کا بنیادی مقصد اپنی انشاپردازی کا سکہ بٹھانا ہے لیکن جن مختلف عنوانات پر یہ نگارشات ہیں اُن سے اُس دور کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں بڑی [illegible] اگر ایک طرف بیرونی تاجروں کی سرگرمیاں اور غیر سماجی عناصر کی [illegible] بیان کی گئی ہیں تو دوسری طرف موسیقی کے مختلف طرز، انشاء کے مختلف اسالیب اور زبان و بیان کے مختلف زاویوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ موسیقی کی ایک ماہر ترمتی خاتون کا ذکر اور اُن کی خوبیوں کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ سیاسی حالات کے سلسلہ میں بلبن کا فتح نامہ لکھنوتی اور علاء الدین خلجی کا وہ فرمان جو تخت نشینی کے فوراً بعد جاری کیا گیا تھا، ایسی دستاویزیں ہیں جن کو تاریخ کا کوئی طالب علم نظرانداز نہیں کر سکتا۔

اس لٹریچر سے قطع نظر جس کی حیثیت ادبی ہے، امیر خسرو کی دیگر تصانیف تاریخی معلومات کا ایک گنجینہ ہیں جن کے مطالعہ سے تاریخ کے طالب علم کو صرف سیاسی واقعات ہی سے آگاہی نہیں ہوتی بلکہ اس دور کے فوجی نظام، ادبی ماحول، سماجی اور تمدنی حالات کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

تاریخی مثنویوں میں سرفہرست "قران السعدین" کا نام آتا ہے یہ مثنوی کیقباد کی فرمائش پر رمضان ۶۸۸ھ مطابق ستمبر ۱۲۸۹ء کو مکمل ہوئی۔ بلبن کا جب انتقال ہوا تو اس کا بیٹا بغرا خاں بنگال کا گورنر تھا۔ دہلی میں امراء نے اس کے بیٹے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ باپ نے بنگال میں آزاد حکومت کا اعلان کر دیا جس پر سیاسی کشمکش کا آغاز ہوا اور فوج کشی تک نوبت پہنچ گئی۔ پھر کچھ دنوں تک نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اودھ میں دونوں کی ملاقات ہو۔ امیر خسرو اس موقع پر کیقباد کے ساتھ اودھ گئے تھے اور سلطان کی دہلی واپسی کے بعد بھی دو سال تک وہاں رہے تھے۔ جب دہلی واپس آئے تو سلطان نے اُن کو اپنا ندیم بنا لیا اور مثنوی لکھنے کا حکم دیا۔ "قران السعدین" امیر خسرو کے ابتدائی زمانہ کا کارنامہ ہے لیکن زبان و بیان کی خوبی، دہلی اور اودھ کے سماجی ماحول کی تصویر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ بعض ناقدین نے اعتراض کیا ہے کہ اس میں اصل مضمون کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ دوسرے مباحث زیادہ ہیں۔ امیر خسرو کو اس بات کا احساس تھا۔ اس کا سبب بتاتے ہیں ؎

چون سخن از لطف لبانے نداشت کالبدش صورت جانے نداشت
وصف بر آن گونہ فرو راندہ ام کز غرض قصہ فرو ماندہ ام

کہتے ہیں کہ میں نے صلہ کی طمع میں یہ مثنوی نہیں لکھی، میرا سخن بجائے خود ایک خزانہ ہے۔ اس کے سامنے گنجِ زر کی کیا حقیقت ہے۔ شاعری کی بدولت مجھ کو جو صلہ ملتا ہے اس کو دہ چند کر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ اگر سلطان مجھ کو فریدون و جمشید کا سا خزانہ بھی عطا کرے تو میرے ایک حرف کا بھی صلہ نہ ہوگا۔

من کہ نہادم ز سخن گنج پاک گنج زر اندر نظرم چیست؟ خاک
در دہدم گنج فریدون و جم ہدیہ یک حرف بود بلکہ کم

مثنوی میں ایسی بہت سی تفصیلات ہیں جن سے اس دور کے تہذیبی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً دہلی کی تمدنی حالت، جامع مسجد، منارہ، حوض، شہر نو، قصر نو وغیرہ کا حال کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتا۔

کیقباد، عیش و عشرت کا دلدادہ اور شاہد و شراب کا متوالا تھا۔ امیر خسرو نے اس کو نصیحت کرنے اور اس کے کردار کے ان پہلوؤں پر تبصرہ کرنے میں بڑی جرأت اور بے باکی کا ثبوت دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ترک طمع گیر۔ ز خود شرم دار تا نشوی چون طفلان شرمسار
گرسنہ زانی کہ دریں تنگنائے نان ز ملک می طلبی نز خدائے
غرہ بہ نزدیکی سلطاں مشو بلبل باغی مگس خوان مشو
ہست وے از خرمن ہستی خسے تا تو چہ باشی کہ کمی زو بسے

اس کے بعد امیر خسرو نے ایک مختصر مثنوی "مفتاح الفتوح" لکھی۔ اس میں جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اور ابتدائی مہمات کا حال درج ہے۔ یہ تفصیل کسی دوسری معاصر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مثنوی میں امیر خسرو کے لئے ایک مشکل مقام وہ آیا ہے جہاں ملک چھجو کو باغی کی حیثیت سے پیش کرنا پڑا ہے۔ ملک چھجو اُن کے بالکل ابتدائی محسنوں میں تھا اور ایک زمانہ میں اس کے متعلق انھوں نے لکھا تھا ؎

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است آسمان زد تیغ ملک چھجو نمود

لیکن اس مثنوی میں ایک باغی کی حیثیت سے اس کی مذمت کرنی پڑا سخت تھا۔ قدیم تعلقات نے اُن کا قلم روک لیا اور انھوں نے چھجو کو صرف "بدعہد" کہنے پر اکتفا کیا۔

"دولرانی خضر خاں" جو "عشقیہ" کے نام سے بھی مشہور ہے، اُن کی مثنویوں میں اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد شاعرانہ تخیل سے زیادہ واقعات پر ہے۔ خضر خاں نے ایک دن امیر خسرو کو بلایا اور دولرانی سے اپنے عشق کی داستان نثر میں لکھی ہوئی دے کر درخواست کی کہ اس کو نظم میں منتقل کر دیں۔ امیر خسرو نے اس کام کو بڑے خلوص اور تندہی سے انجام دیا اور ۷۱۵ھ کو یہ مثنوی پوری ہوگئی۔ بعد کو جن دردناک حالات میں خضر خاں کا خاتمہ ہوا اس سے امیر خسرو کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوگیا اور انھوں نے غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں اس میں اضافہ کیا اور علاء الدین خلجی کی بیماری، ملک کافور کی احسان فراموشی اور خضر خاں کے قتل کی پوری داستان اس میں شامل کر دی۔ امیر خسرو کو خضر خاں سے خاص تعلق خاطر تھا۔ غالباً اس کی ایک وجہ اس کی حضرت محبوب الٰہی سے عقیدت بھی تھی۔ مثنوی کے شروع میں امیر خسرو نے نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ علاء الدین خلجی کو نصیحتیں کی ہیں اور ظلم کے نتائج اور شراب نوشی کی تباہی سے آگاہ کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ سلاطین دہلی کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ اور ہر ایک سلطان کے متعلق جو رائے دی ہے وہ اُس کی سیرت اور کارناموں کا بہترین خلاصہ ہے۔ رضیہ کے

تغلق لکھتے ہیں ؎

چناں میراند زور سادہ شیراں ... کہ حالی می شدند از دہ دلیراں

ناصر الدین محمود کے متعلق لکھتے ہیں ؎

خود او مستغرق کار الٰہی ... با مرش بندگان در کار شاہی

علاء الدین خلجی کی فتوحاتِ دکن کے متعلق امیر خسرو نے "خزائن الفتوح" لکھی۔ یہ نثر میں اُن کی پہلی تصنیف تھی۔ لکھتے ہیں۔

"در کوچہ نظم فراواں فوص نمودہ بودم و انبار ہائی
لالی گرد آوردہ، خواستم کہ برائے سدہ والا
نثری نیز بیارایم"

لیکن جیسا کہ پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے نظم امیر خسرو کی مادری زبان تھی، نثر لکھنے میں ان کو تکلف کرنا پڑتا تھا۔ گو امیر خسرو نے صاحبِ "تاج المآثر" کا ذکر نہیں کیا لیکن انداز بیان میں اسی کا اتباع کیا ہے۔

"خزائن الفتوح" میں فتح دیوگیر سے لے کر "ضبطِ ارنگل" تک کا ذکر ہے اور کتاب کا دو تہائی حصہ اسی سے متعلق ہے۔ لیکن اور بہت سے دلچسپ مباحث بھی اس میں آگئے ہیں، مثلاً اشیاء کے نرخ کا تعین، شراب نوشی کا انسداد، ایاحیتوں کی سزائیں، دار العدل کا قیام، مسجدوں، حوضوں اور فصیلوں کی تعمیر علاوہ ازیں منگولوں کے حملوں کی تفصیل اور فتحِ گجرات کا حال بھی اس میں درج ہے بعض مقامات پر اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ....
علاء الدین خلجی کے درباری مورخ کبیر الدین نے اپنے فتح نامہ میں جن مباحث پر تفصیلی گفتگو کی تھی اُن کو دہرانا غیر ضروری تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے فوجی نظام کے متعلق جو مواد اس تصنیف میں ملتا ہے وہ گراں قدر ہے۔ امیر خسرو سپاہی تھے، اس لئے فوجوں کی ترتیب، نقل و حرکت کی تفصیلات بہت خوبی سے بیان کرتے ہیں۔

مثنوی "نہ سپہر" مبارک شاہ خلجی کے حکم پر لکھی گئی تھی۔ سلطان کی تخت نشینی، دیوگیر کی مہم، قصرِ نو کی تکمیل، جامع مسجد کی تعمیر کے علاوہ دہلی سے متعلق ایک حصہ ہے جس میں دنیا کے مشہور شہروں سے دہلی کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اس کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدیم ہندوستان کے تہذیبی کارناموں کے ساتھ ساتھ یہاں کی آب و ہوا، پھل پھول، پرند چرند، مذاہب، رسوم اور زبانوں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ایک باب میں بادشاہ اور امراء کے لئے کچھ نصائح ہیں جن سے امیر خسرو کی سیاسی افکار و نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک شہزادہ کی پیدائش پر شاہی محل میں جشن کی تفصیل ہے یہ ساری معلومات ہندوستانی کی تمدنی تاریخ کا نہایت اہم اور قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔

ہر چند کہ سلطان مبارک خلجی کے تعلقات امیر خسرو کے شیخ حضرت محبوب الٰہیؒ سے اچھے نہ تھے اور بقول ضیاء الدین برنی وہ کھلے دربار میں اُن کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہا کرتا تھا۔ امیر خسرو نے نہایت دلیری اور ہمت کے ساتھ "نہ سپہر" میں اپنے مرشد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

من از دے لعاب دہان یافتم
کہ زیں گونہ آب دہان یافتم

"تغلق نامہ" میں امیر خسرو نے خلجیوں کی بربادی اور تغلق خاندان کی سریر آرائی کی پوری داستان بیان کی ہے۔ غازی ملک نے کس طرح خسرو خاں سے خاندانِ علائی کو نیست و نابود کر دینے کا بدلہ لیا اور کن ناسامعد حالات میں علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس کی تفصیل "تغلق نامہ" کے علاوہ اس عہد کی کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ امیر خسرو کی آخری تصنیف تھی۔ اس کے ساتھ تاریخی مثنویوں کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا جس کی ابتدا "قرون السعدین" سے ہوئی تھی۔ اگر امیر خسرو کی یہ تصانیف میسر نہ ہوتیں تو قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اور تمدن کے کتنے گوشے تشنۂ تفسیر و تعبیر رہ جاتے!

بقیہ ۔ امیر خسرو کے عہد کا دہلی

ڈاک کا انتظام

ڈاک دو قسم کی ہوتی تھی۔ ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو اولاق کہتے تھے مقررہ فاصلہ کے بعد گھوڑا بدلا جاتا تھا۔ لیکن سوار ڈاک لے کر سفر جاری رکھتا تھا گھوڑوں کا انتظام حکومت کی جانب سے ملازمان دیہی کے توسط سے ہوتا تھا۔ گھوڑا بدلنے اور تازہ دم گھوڑوں کو مہیا اور تیار رکھنے کی وجہ سے تیز رفتاری کو قائم رکھا جا سکتا تھا۔ پیدل ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ہر گاؤں کے باہر ہرکاروں کی چوکیاں ہوتی تھیں جن کو داوہ کہتے تھے۔ یہاں برجیاں بنی ہوتی تھیں اور ہرکارہ کمر کسے بیٹھے رہتے تھے جب شہر سے ڈاک چلتی تو ہرکارہ ایک ہاتھ میں ڈاک رکھتا اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھڑی دو گز لانبی ہوتی۔ جس کے سرے پر گھنگرو بندھے ہوتے مقررہ فاصلہ پر دوسرا ہرکارہ گھنگرو کی آواز سن کر تیار ہو جاتا۔ اور جب ہرکارہ برجی تک پہنچ جاتا تو اس سے ڈاک لے کر فوری روانہ ہو جاتا اس طرح ڈاک مسلسل حرکت میں رہتی۔ کبھی اس ڈاک کے ذریعہ دور دراز کے تازہ میوے اور کبھی کسی خاص مقام کا صحت بخش پانی بھی بادشاہ کو پہنچایا جاتا خبریں بھی اسی ذریعہ سے بھیجی جاتی تھیں۔

بقیہ ۔ "امیر خسرو کی حب الوطنی"

مسلمان ہو یا ہندو، جو بھی خلوصِ نیت و دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ اپنے اس عمل میں حق بجانب ہے۔ ہر ایک پجاری اللہ کی عبادت محبت سے کرتا ہے۔ محبت اُسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ جس شخص کو پوری باطنی نظر حاصل ہے وہ ہر چیز میں اللہ کا جلوہ دیکھتا ہے چاہے وہ یہ عبادت کسی وسیلے سے ہی کیوں نہ کرتا ہو۔

عمیق حنفی

امیر خسرو اور عصرِ جدید

ہم نے سمجھنے سمجھانے کے کام کو آسان بنانے کے لئے بعض تصورات کی تخصیص و تحدید کے لئے اور تمیز و شناخت کے مدارج طے کرنے کے لئے چند مفروضات وضع کئے اور انھیں تعریف و تسمیہ کے احاطے میں گھیر لیا۔ انسانی مقدرات کی ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی سہولت اور اعانت کے لئے اسماء، صفات، اصطلاحات و تعریفات کی تخلیق کرتا رہتا ہے اور پھر اپنی ہی مخلوق کا تابع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنے تصورِ عصر ہی کو لے لیجئے۔ زمین کا اپنے محور پر گردش کرتے رہنا یا اپنے مدار پر سورج کے طواف کے مسلسل عمل پر قائم رہنا ایک مستقل آہنگ کا حامل ضرور ہے۔ بے شک شب و روز کا تغیر اور بہار و خزاں کا تبدل ایک بنی ہوئی گھڑی ہوتی، بندھنے والی لے کا دائرہ بناتا ہے جسے ہم عصر، زمان یا وقت کہتے ہیں۔ گھڑیاں، جنتریاں، تقویمیں،... مدتہا ہیں اسی بنیادی لے کو تال میں بانٹ کر اس کی خالی بھری ماترائیں گنتی رہتی ہیں بس اتنی سی بات ہے جس نے قصۂ جدید و قدیم کا طول اختیار کر لیا اور لاانتہا ہی بحث کی طرح ڈال دی۔ اساطیر، داستانیں، تاریخ، سوانح، روزنامچے اسی بحث کے مختلف ابواب ہیں۔ انسانی تجربے کی اس ایک جہت نے دوسری تمام جہات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ کائنات کے رقص کی یہ لَے جسے ہم عصر یا زمان یا وقت کہتے ہیں اُس کے مرکزی سُر اور بنیادی نغمے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

دراصل زیرِ قلم مضمون ہی طرحی ہے اور اس کے عنوان کے ترکیبی الفاظ نے مجھے اس پر اُونچی آواز میں سوچ بچار کرنے کی ترغیب دی ہے عصر، زمان یا وقت تقدیم و تاخیر تسلسل و تواتر اور حقائق کے ترتیبی تناظر اور آہنگ کا نام ہے۔ زمان کا تصور مکان سے علیحدہ اور ماورا ایک نقطۂ موہوم بن کر رہ جاتا ہے۔ کوئی عہد بالکلیہ نہ ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل۔ حرکت و رفتار، خواہ اجسام کی ہو خواہ اذہان و افکار کی فصلِ مکانی ہی کی طرح فصلِ زمانی کو بھی کم کرتی چلی جاتی ہے۔ قدامت میرے نزدیک جمود و تعطل کا نام ہے تو جدت حرکت و ارتقا کا۔ فاصلوں کو مکانی اکائیوں سے ناپنے کے بجائے اگر زمانی اکائیوں سے ناپ کر دیکھا جائے تو یہ تجربہ صرف دلچسپ ہی نہیں مفید بھی ہوگا۔ مثلاً دہلی سے بمبئی کتنے گھنٹے کا فاصلہ ہے؟ یا زمین سے چاند کتنے دنوں کی دوری پر ہے۔؟

عمرانی مظاہر، معاشی وسائل، سیاسی نظام اور تصورات جرم و سزا اور اب تاریخ کو ایک دوسرے سے متمائز بے شک کرتے ہیں لیکن یہ اختصاص زمان و مکان آدم تا ایندم کی داستان کے کلی تناظر میں محض تدریجی اور ارتقائی نوعیت رکھتے ہیں۔ خطوط الطول و العرض نقشوں ہی پر نظر آتے ہیں، کائنات میں نہیں سیکنڈوں اور منٹوں اور گھنٹوں کے نشانات گھڑیوں پر ہی ملتے ہیں سورج کے ڈائل پر نہیں۔ زمان و مکان کی مغائرت کا انحصار اس پر زیادہ ہے کہ محسوس کرنے والے کا احساس کس حد تک زمان و مکاں کے کسی خاص نقطے پر ساکت و جامد ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ میر و میرزا کے اکثر و بیشتر اشعار ہمیں کسی مغائرت یا اجنبیت کا احساس نہیں دلاتے بلکہ ہمیں اپنے عہد کے محسوس ہوتے ہیں لیکن جانشینانِ داغ کے اکثر و بیشتر اشعار ہمیں کھنڈروں کا احساس دلاتے ہیں۔ انسان اور اس کی معاشرت کی کلیت اور قانونِ ارتقا کی بنیادی وحدت کا عرفان و شعور جن شعراء کو حاصل ہے انھیں میں کلی شاعر TOTAL POET قرار دیتا ہوں اور ان کے باسی پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امیر خسرو اور ہمارے درمیان ساڑھے چھ صدیاں حائل ہیں لیکن دراصل یہ فاصلہ اتنا ہے جتنا ہمارے اور الماری یا کتب خانے یا کتب فروش کی دکان کے درمیان ہے۔ اور جب کلامِ خسرو کا سحرِ حلال مساماتِ جاں تک اتر جاتا ہے تو فضائے شعر کی اجنبیت یا محاورے کی قدامت اس قلبی اور روحانی ارتباط میں حائل نہیں ہوتی۔ جیسے ہمارا استغراق، زمان و مکان کے فاصلوں کو بیک جست طے کر کے پیدا کر لیتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم احساس کی سطح پر امیر خسرو کا فیض صحبت حاصل کریں، شعور کی سطح پر تاریخ اور معاشرت کے علمی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے تقابل ادوار سے استفادہ کریں۔ امیر خسرو کی جامع الصفات شخصیت تاریخ ہند کے ایک ایسے دور میں طلوع ہوئی تھی جو کئی اعتبار سے عبوری نوعیت رکھتا تھا۔ ہند کی سیاست، عمرانیات، اقتصادیات، فکری اور ذہنی اعتقادیات ایک نئی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ تخت اور تختے کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ بھی نہ تھا زندگی کا نشیمن شاخِ آہو پر تھا۔ انتشار کے سمٹنے اور پھیلنے پر اس دور کی تاریخ کے ورق بدلتے تھے۔ عیش و عشرت کے ادوار خوابِ خرگوش کی طرح جب لمحۂ ہوش کی گرفت میں آجاتے تھے تو شاہی خاندان کے معصوم افراد کے خونِ ناحق کا منظر سامنے ہوتا تھا شمال مغرب سرحدوں سے قتل و غارت کے خوگر غول کے غول پنجاب اور دہلی کی طرف تباہی کی آندھی بن کر لپک رہے تھے میوات

کے جنگل میواتیوں کے لوٹ مار اور قتلِ عام کی ترغیب دے دے کر دلی کی طرف اکسا رہے تھے۔ سیاست میں مرکزیت اور لامرکزیت کی کشمکش نمایاں تھی۔ دلی کا سلطان ہر صورت زیادہ سے زیادہ حصوں کو اپنے حیزِ اقتدار کے سائے میں لانا چاہتا تھا اور علاقائی سردار، امیر اور راجگان آزادی اور خود مختاری کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ علمائے شریعت ہاتھ سلطنت کے مطیع و فرمانبردار تھے تو اولیائے طریقت عوام الناس کی اخلاقی روحانی اور انسانی قدروں کے عقاب احتیاج کو اپنے ہاتھوں پر بٹھائے ہوئے تھے۔ ملتان کے مسلمان سود خور بھی ہندو سود خوروں سے کم نہ تھے۔ اجناس کی قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا، ساہوکاروں کے اشارۂ ابرو کا تابع تھا۔ ملاوٹ اور کم تولنے کا رواج بھی عام تھا۔ علاء الدین خلجی کی اصلاحات کا باعث یہی سبب تھا۔ ملکِ "بالا" سے آنے والے ترک سرزمینِ ہند کی اجنبی آب و ہوا اور تہذیبی فضا میں اپنے آپ کو الگ تھلگ پاتے تھے۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو اس سرزمین کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو کر اپنے آپ کو گم کر دیں یا تعلّی و تکبر کی ہواؤں میں لئے ہوتے اپنے شیرازی، سمرقندی، بخاری اور ماوراء النہری ہونے پر فخر کرتے رہیں اور اپنے محدود حلقے میں بند رہیں۔ پھلنے پھولنے والے درختوں کی طرح اپنی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اتار دیں یا بے برگ و ثمر اکاس بیل کی طرح سایہ دار درختوں کا خون چوسنے کے لئے ان کی پھننگوں پر اپنے وجود کے جال پھیلا دیں۔

امیر خسرو نے ۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء تک کتنی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ ان کے حساس ذہن نے اپنے سامنے بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کا بہت قریب سے ادراک کیا اور ان تبدیلیوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر آنے والی کتنی پیڑھیوں کے لئے محفوظ کر دیا۔ ایک مورخ کی حیثیت سے امیر خسرو ہمہ زمانی اہمیت رکھتے ہیں۔ عہدِ بلبن سے لے کر عہدِ غیاث الدین تغلق تک کے بہت سے واقعات اور ان کے سن و سال کی معلومات کے واحد، مستند اور معتبر راوی امیر خسرو ہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض بے لطف واقعات کے سلسلے میں وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک ایسی خاموشی جسے آج کے بعض مورخین مجرمانہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جلال الدین خلجی کا قتل۔ نظامی خانقاہ اور سیری اور تغلق آباد کے درباروں میں بیک وقت یکساں سرفرازی اور دل نوازی کا حاصل کرنا ابھی آج کے بعض مورخوں کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہے اور اس حقیقت کو وہ امیر خسرو کے حق میں نہیں سمجھتے۔ امیر خسرو کے اطوار و اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں "ناوابستگی" کے قائل تھے اور جیب و دامن کے رشتے کو قلب و روح کا رشتہ نہیں بناتے تھے۔ ملازمت کے باوجود ذہنی وابستگی اور فکری تلوث سے اوپر رہنا پسند کرتے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو تیرہویں چودہویں صدی کے مورخین تنقید و تصفیہ کے فرائض سے کم آشنا ہوتے تھے اور احوالِ واقعی کے اظہار یا اخفا ہی پر اپنے فرائضِ منصبی کا دار و مدار رکھتے تھے۔

امیر خسرو کا رویہ ایک محبِ وطن کا رویہ ہے، وہ اپنے ہندی ہونے پر فخر نہ کرتے ہیں اور اپنے ہم عصر ترک دانشوروں کے برعکس ایک خوشگوار استعار بن جاتے ہیں۔ وہ سرزمینِ ہند کے بارے میں صرف یہی نہیں کہتے کہ "ہست مرا مولد و مادی و وطن" بلکہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

وین ز رسول آمدہ کای زمرہ دین	حبِ وطن ہست ز ایمان بیقین

مثنوی "نہ سپہر" میں ملکِ ہند اور اہلِ ہند کی فضیلت و افضلیت کی کئی حجتیں پیش کرتے ہیں اور کھلے دل سے ہند کی برتری کے راگ الاپتے ہیں۔ اس مثنوی کے ایک سو بارہ اشعار عرب و عجم پر ہند کی برتری کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ افراطِ اشیاء و اسباب نا و نوش، اعتدالِ آب و ہوا، طائرِ فردوس یعنی طاؤس کا کمالِ رقص اور طاؤس و مار کا ایک ساتھ رہنا، ہندی پھولوں کی دلاویز رنگت اور خوشبو، اہلِ ہند کی وفاداری اور مسلمانانِ ہند کا راہِ حق پر ہونا، ان جذباتی دلائل کے علاوہ امیر خسرو دس عقلی حجتیں بھی پیش کرتے ہیں ؎

ترجیحِ اہلِ ہند بر اہلِ عجم ہمہ	در زیرکی و دانش و دہقانی ہوشیار الخ

ہندوستانی زبانوں بالخصوص سنسکرت کو امیر خسرو دری و عربی کے درمیان مقامِ فضیلت عطا کرتے ہیں۔ ہندی علمِ ریاضی و ہیئت و نجوم، وید مقدس وغیرہ کی تقدیس و تعریف سے امیر خسرو کا کلام پرہیز نہیں کرتا۔ امیر خسرو دوآبے کو .... "ہندوستان" کہتے ہیں اور سارے ملک کو یعنی برِّ صغیر کو "ہند" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ "ہند" کے اس کلی تصور کو رکھنے کے سلسلے میں کبھی انھیں داد ملنی چاہئے۔

امیر خسرو کے ذہنی اور فکری مسائل میں سے کئی ایک ہمارے مسائل سے مماثلت رکھتے ہیں۔ وہ اس برِّ صغیر اور اس کی آب و ہوا اور تہذیبی فضا میں اپنی شخصیت کی جڑیں اتارنا چاہتے تھے اور ہم ان جڑوں کی تلاش کر رہے ہیں۔ یعنی امیر خسرو کے سامنے مکانی سطح پر جو سوال تھا وہی سوال زمانی سطح پر ہمارے سامنے ہے۔ دہلی، ملتان، اودھ، لکھنوتی، دیوگیری، وارنگل، دوار سمدر وغیرہ کی شہری معاشرت انھیں بے حد پُرکشش معلوم ہوتی ہے۔ ہند کے تیوہار اور شاہانہ تقریبات میں انھیں دل کشی نظر آتی ہے۔ محنت، ہنرمندی، فن کاری کے وہ مداح ہیں اور ہندی مصنوعات کی عظمت اور افادیت کے قائل، اس طرح امیر خسرو ہمیں ایک سیکولر اور متحد ہمہ رنگ تہذیب کے وطنِ واحد کے تصور کی ابتدائی شکل دکھاتے ہیں، جو ان کے عہد کی اصلی اور تحفظات کی محدود فضا سے اوپر اٹھا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کی فضا ایرانی تورانی سے زیادہ ہندوستانی ہے۔ ہندی الفاظ اور محاورے کا بے تکلف استعمال ان کی "دری" کو "سبکِ ہندی" کا بے مثال نمونہ بنا دیتا ہے۔

"اعجازِ خسروی" کے رسائل اور "غرۃ الکمال" کا دیباچہ امیر خسرو کی شوخیات اور ہزلیات سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔ ان کے اسالیب کا مطالعہ آج بھی دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ "مدرستوں" کا اسلوب تیرہویں چودہویں صدی میں بھی ناپسندیدہ تھا۔ طنز و مزاح میں ابتذال کو گوارا کر لیا جاتا تھا اور طنز و تمسخر میں طبع آزمائی کرنا امیر خسرو جیسے سربلند ادیبوں کے لئے بھی ہیٹی کی بات نہ تھی۔ "اعجازِ خسروی" کے رسائل میں ہمیں امیر خسرو کی ذات سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو شاعری کی زبان و اسلوب کو مقفیٰ، فطری،

سادہ اور راست رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی زبان و اسلوب کو مرصع و مسجع امیر خسرو کی شاعری میں تدبر، تعقل، اور تحقیق کے رویئے نمایاں ہیں۔ اور جذبہ و احساس کی معقول صورت زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کی مثنویوں کا انحصار زیادہ تر ذاتی تجربات اور ماحول پر ہے اور ان کا تخیل حقیقت سے دامن کشاں نہیں ہوتا۔

شاعری میں ہیئت و اسالیب کے تجربوں کے سلسلے میں بھی امیر خسرو کا مطالعہ تہی دامن نہیں لوٹاتا۔ استعمالِ قوافی اور صنعت معرہ کے علاوہ مثنوی ... "نہ سپہر" میں نو بحروں کا تجربہ قابل غور ہے۔ آج کی مخالف البحور اور کثیر الاوزان نظموں کا نسب نامہ سات سو برس پہلے سے شروع کیا جاسکتا ہے۔ ملوکیت اور تصوف سے قریبی تعلق کے باوصف امیر خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے انسانی وجود کا احاطہ کرنے والے رنج و غم اور انبساط و مسرت کے لمحات ان کی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں۔ فطرت اور تمدن دونوں سے بیک وقت لطف اندوز اور مستفیذ ہونے والی طبیعت امیر خسرو کو ملی ہے۔ "جدید" شاعر کی بہت سی جہات امیر خسرو کو بھی درپیش تھیں، جن میں سے ایک بہت بڑی مہم یہ تھی کہ اس زمانے کے سیاسی ESTABLISMENT سے روزی اور خانقاہ سے آشیرواد حاصل کر کے بھی اپنی انفرادیت اور ذات کی شناخت کو کیسے قائم رکھا جائے۔ وہ ہر محفل اور ہر صحبت میں گھل مل کر جاتے ہیں۔ بالکل پانی کی طرح کہ جس میں مل جاتا ہے ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتا ہے، لیکن اپنی نمی و روانی کو نہیں کھوتا۔

امیر خسرو کی ہشت پہلو اور جامع صفات شخصیت کے تین پہلو ہر زمانے کے لوگوں کے لئے دلچسپی، افادیت اور معنویت رکھتے ہیں۔ ایک ذہین اور حساس انسان کی حیثیت سے جس نے اپنے عہد کے تقریباً تمام علوم کی آگاہی حاصل کی، ایک مورخ جس نے منظوم پیرائے میں اپنے عہد کے واقعات و حالات اور مظاہر و مناظر کو شاعرانہ حسن و خوبی کے ساتھ بیان کر دیا اور اپنے عہد کی سماجی، معاشی اور معاشرتی حقیقتوں کو عمرانی نقطہ نگاہ سے کریدنے کی کوشش کی، اور ایک شاعر جس نے فارسی کو "ہندیا" لیا اور ترک ہونے کے باوجود مقامی زبانوں اور اسالیب کو اپنایا اور برتا۔ امیر خسرو کی موسیقی دانی پر تو کوئی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا اس میں ذاتی دخل اور تجربہ کسی اندرونی یا ہم عصر شہادت کے بغیر مشکوک ضرور ہے۔ اسی طرح ان کی ہندی شاعری کے نمونے بھی تاحال مستند و معتبر قرار نہیں دیئے جاسکتے عصرِ حاضر میں امیر خسرو کے متعلق عقیدتوں کے بنے ہوتے جالوں سے گزر کر امیر خسرو کی ذات تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ ان کے دواوین کے دیباچے اور "اعجازِ خسروی" کے رسائل کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ نہ صرف سبک ہندی کی فارسی بلکہ تیرہویں چودہویں صدی کی ہندوستانی لسانیات، معنویات اور اسلوبیات کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ مثلاً "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں عربی اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ تنقیدی شعور کا ثبوت بین ہے اسی دیباچے میں شعر میں چار اشکال کا ذکر ملتا ہے۔ یابس، معتدل، رطب اور محرق۔ یابس میں صنعت لفظی کا غلبہ ہوتا ہے جو نظم میں عیب اور نثر میں بہر مستقل وہ شکل ہے جس میں صنعت لفظی موجود تو رہتی ہے مگر سلاست نہیں کھوتی اور طراوت

معنی رکھتی ہے۔ رطب میں سلاست و جذالت غالب رہتی ہے اور رعایت لفظی بہ تکلف نہیں برتی۔ محرق میں رعایت بے ارادہ طریقے سے آجاتے تو آجائے ورنہ یہ شکل ایسی ہے کہ آگ کی طرح پنبۂ دل کو اپنی پیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ وہ روحانی شراب ہے جو کاسۂ سر شاعر میں کھینچی جاتی ہے اور وجدانی لذت رکھتی ہے اسی دیباچے میں شاعری کی پانچ پہچانیں بتائی گئی ہیں۔ فاضلانہ، حکیمانہ، نیکو طبعانہ، عاشقانہ اور شاعرانہ۔ فاضلانہ وہ ہے جس میں صنعت لفظی کا جی کھول کر استعمال کیا گیا ہو اور فارسی میں عربی کی (غیر متوازن و غیر متناسب) آمیزش کی گئی ہو۔ حکیمانہ یعنی وہ جسے سنائی و ناصر خسرو وغیرہ نے برتا اور پسندکیں "ودیگِ سودش از یں زبانہا جوش زند"، نیکو طبعانہ طرز کی شاعری غزلوں میں بہت ملتی ہے یہ انچنا است کہ یکے گرہ با معین غزلہا ی تبرید آید و سفینہا ساز دو ازاں نتواند گزشت"۔ عاشقانہ وہ جس میں رقت، غلبات، سوزش و شورش ہو۔ شاعرانہ وانش وہ جس میں جملہ طرزوں کا معتدلانہ امتزاج پایا جاتا ہو۔

باشی چو بعلم سست بنیاد شاعر باشی ولی نہ استاد

کیا یہی تقاضا ہر دور میں نہیں کیا گیا؟ کیا ہمارے دور میں جدید شعراء و ناقدین اسی بنیادی تقاضے کو لے کر اپنی شعریات کی عمارت نہیں اٹھا رہے ہیں۔؟

خسرو اپنی حقیقت پسندی کے باعث ہمارے اور قریب آجاتے ہیں اپنی مثنویوں میں وہ جس واقعات نگاری، منظر کشی اور خاکہ نگاری کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے تجربے کے عینی اور معروضی مگر حساس شاہد ہی بن جاتے ہیں۔ یہ وہی رویہ ہے جسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے شاعری کے لئے تجویز کیا کہ شاعر کی شخصیت اس کے شعری اور تخلیقی تجربے میں ملوث نہ ہو بلکہ محض CATALYTIC AGENT کی حیثیت رکھے۔

"اعجازِ خسروی" میں اسالیب کا ذکر آج کے متعلمین ادب کے لئے بہت اہم ثابت ہوسکتا ہے۔ علمائے محقق کا اسلوب، داستان نگاروں کا اسلوب فضلا کا اسلوب، خطیبوں کا اسلوب، مدرسوں کا اسلوب، عوام کا اسلوب، اہل حرفہ (کرخنداروں) کا اسلوب اور مزاح نگاروں، مسخروں اور نقالوں کا اسلوب۔ ان تمام اسالیب میں قابل مذمت ٹھہرا ہے۔ مدرسوں کا اسلوب اور آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شاعری میں بھی خسرو "استادی" کے قائل نہیں۔ ان گذارشات سے مقصود یہ ہے کہ آپ اس نکتے کو نظر انداز نہ کریں کہ امیر خسرو محض شاعر یا وقائع نویس نہیں ہیں بلکہ باشعور اور صاحبِ علم متعلم جمالیات و شعریات بھی ہیں)۔

امیر خسرو کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ جس تالاب میں بھی رہے کنول کی طرح رہے بیشتر مقامات پر انھوں نے آنکھیں اور کان تو کھلے رکھے مگر زبان و لب کو جنبش نہ دی۔ وہ معروضی حیثیت کا مثالی کردار ہیں۔ ان کی تحریر میں روشن ترین عبارتیں وہ ہیں جن میں ان کی اپنی دھرتی کا حسن، رنگ، دلولہ اور مایۂ ولولہ موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق غالب اور فاتح طبقے سے تھا۔ لیکن ان کا شعری اور فکری رویہ کسی احساس برتری اور عصبیت کی بدولت نہیں رکھتا

حسن الدین احمد

خسرویات

جب کسی ادیب یا شاعر کے فن، فکر و خیال اور اس کی قائم کی ہوئی راہوں اور روایات پر مختلف انداز سے اور مختلف پہلوؤں سے لکھا جاتا ہے اور تنقیدیں کی جاتی ہیں تب یہ سب ذخیرہ ایک باضابطہ علم کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ ہمارے ملک میں قریبی زمانہ میں دو عظیم شاعروں غالب اور اقبال کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تمام تحریرات کو علی الترتیب "غالبیات" اور "اقبالیات" کا نام دیا جاتا ہے "غالبیات" میں غالب کے کلام پر تبصروں اور تنقیدی بحثوں کے علاوہ غالب نے اپنی شاعری میں جو روایات قائم کیں، عام روش کے خلاف جو بغاوت کی اور حیات و کائنات کا جو مخصوص تصور پیش کیا ان سب کو شامل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح "اقبالیات" میں اقبال کے کلام پر تنقیدوں اور ان کے فلسفہ اور پیام کی تصریحات و توضیحات کو شریک کیا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے "خسرویات" حضرت امیر خسرو دہلوی کی عظیم شاعرانہ صلاحیتوں، ان کی جامع الکمال، زندگی سے ان کے گوناگوں تجربوں اور ان کی فکر و نظر کی وسعت سے متعلق ساری بحثوں کے مجموعہ کو سمجھنا چاہئے۔ لیکن جب ہم اس افسوسناک حقیقت پر نظر کرتے ہیں کہ عوام میں اس بلند پایہ شخصیت کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود ادبی اور علمی حیثیت سے اس بارے میں گذشتہ سات سو سال کے عرصہ میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے تو نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ ایک بڑی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن وقت نے حضرت امیر خسرو کے پیام کے مقابلہ میں ہار مان لی ہے۔ امتداد زمانہ سے ان کے کلام کا بڑا حصہ ضائع تو ہوا لیکن ان کا مجموعی تاثر اور مقصد آج بھی انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے۔ اور سات سو سال کے بعد پہلی دفعہ ان کی یاد منظم طور پر عالمگیر پیمانہ پر منائی جا رہی ہے۔ ایک سے زیادہ ملکوں کی جانب سے ان کی خدمت میں خراج ہائے عقیدت پیش کئے جا رہے ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ "خسرویات" کو ایک سوچے ہوئے منصوبہ کے تحت اور علم کی حیثیت سے ترقی دی جائے اور اس کی افادیت کو پوری طرح واضح کیا جائے۔

آج "خسرویات" کی اس لئے ضرورت ہے کہ آج سے پہلے اس طرف کم دھیان دیا گیا "خسرویات" کی اس لئے ضرورت ہے کہ آج دنیا کو زیست کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے خسرو کا حیات بخش پیام ناگزیر ہے وہ پیام جو انسان دوستی بھائی چارگی اور محبت و اخوت کا پیام ہے آج بھی خسرو کی اختیار کی ہوئی راہیں دانشوروں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہیں "خسرویات" کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کی تصانیف میں علم و دانش اور ادبی شاہکاروں کا ایک عظیم خزانہ تحقیق و جستجو کی نظروں سے بڑی حد تک اوجھل رہا ہے۔ اس بارے میں اختلافی امور کی حد تک باقاعدہ جانچ پڑتال کی ضرورت ہے تاکہ بحث و مباحثہ کے بعد کسی معقول نتیجہ کو سامنے لایا جا سکے۔

ہندستان کی ثقافتی تاریخ میں نواب عماد الملک (۱۸۴۴ء تا ۱۹۲۵ء) کے دور کو علمی اور تحقیقاتی نقطۂ نظر سے زریں دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کا شمار حیدرآباد کی ایسی شخصیتوں میں کیا جا سکتا ہے جن کی بلند پایہ علمی خدمات اور تعلیمی کارناموں پر دکن ہی نہیں سارا ہندستان بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ اگر اس دور میں دائرۃ المعارف کا قیام عمل میں آیا (۱۸۸۸ء) جس کی جانب سے سیکڑوں عربی اور فارسی مخطوطات کی اشاعت عمل میں آئی۔ کتب خانہ آصفیہ قائم کیا گیا جہاں ملک بھر میں السنہ مشرقی کا اہم اور بیش قیمت ذخیرہ ہے، جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی جہاں اپنی نوعیت کا ایک انوکھا منفرد اور تاریخی تجربہ کیا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ نواب عماد الملک کی دور رس نگاہوں نے آج سے ٹھیک ۶۲ سال قبل ہی خسرویات کی ضرورت اور اہمیت کو حیدرآباد میں محسوس فرمایا اور (مئی ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ سے متعلق نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے فرزند نواب اسحاق خاں صاحب سے (جب کہ وہ نواب وقار الملک کے بعد علی گڑھ کے آنریری سکریٹری تھے) جو مراسلت ہوئی تھی اس میں ارشاد فرمایا کہ۔

"نہایت وثوق کے ساتھ لاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا جس کی تصنیفات اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو۔ لہٰذا اگر آپ کی کوشش سے مشہور زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم و نثر جو جملہ اصناف سخن میں بزبان فارسی ہندی اردو میں موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے اجمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نفع غیر محدود ہوگا، جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی اور مجھے یقین ہے کہ یورپ میں خصوصیات کے ساتھ امیر خسرو کی بہت مانگ ہوگی اور تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ ٹھکانے لگ جائیں گے"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

وہیں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔ بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا کام شروع کرنے کے لئے فوراً ایک ہزار روپیہ اس وقت دیتا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار اور دوں گا ؎

اس کے بعد نواب اسحاق خاں صاحب بالکل آمادہ ہوگئے۔ نواب عمادالملک نے دو ہزار روپیہ سرکار عالی سے ساڑھے سات ہزار نواب سرسالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی افاراللہ خاں صاحب (فضیلت جنگ) سے پانچ سو کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اس تجویز کو حقیقی معنوں میں "خسریات" کی بنیاد کہا جا سکتا ہے اس تحریک اور بروقت مالی امداد پر نواب اسحاق خاں صاحب نے اس دشوار کام کی ذمہ داری قبول کر لی اور ۳۰ ستمبر ۱۹۱۵ء کو اپنی رپورٹ پیش فرما دی۔ اسی رپورٹ کے نتیجے کے طور پر ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۷ء کے دوران علی گڑھ سے امیر خسرو کی حسب ذیل کتابوں کی اشاعت کا کام ہوا۔

نام تصنیف	نام مرتب	سال اشاعت
۱۔ آئینہ سکندری	سعید احمد فاروقی	۱۹۱۷ء
۲۔ دول رانی خضر خاں	رشید احمد سالم	۱۹۱۷ء
۳۔ مجنوں لیلیٰ	حبیب الرحمٰن شیروانی	۱۹۱۷ء
۴۔ ہشت بہشت	سلیمان اشرف	۱۹۱۸ء
۵۔ قران السعدین	ایم۔ اسماعیل	۱۹۱۸ء
۶۔ جواہر خسروی	ایم۔ امین چریا کوٹی	۱۹۱۸ء
۷۔ دیوان وسط الحیات	فضل احمد حافظ	۱۹۲۰ء
۸۔ مطلع الانوار	مقتدی خاں شیروانی	۱۹۲۶ء
۹۔ شیریں خسرو	علی احمد اسیر	۱۹۲۷ء

اس طرح ۱۹۱۴ء میں نہ صرف شعوری طور پر "خسریات" کی بنیاد رکھی گئی بلکہ امیر خسرو کی تمام تصانیف کو احاطہ کرنے اور طباعت کے ذریعہ محفوظ کرنے کا مبارک اور مستحسن اقدام کیا گیا۔

امیر خسرو کا ذکر میر خورد نے کیا ہے جو امیر خسرو کے ہم عصر تھے۔ جامی نے ان کی تصانیف کی تعداد ۹۲ ظاہر کی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے اپنی تصانیف کی حفاظت کا کافی اہتمام کیا تھا۔ وہ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جن کا شہرہ ان کی زندگی ہی میں دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتابوں کے نسخے کتابت کروا کر تقسیم کئے تھے جن کی مانگ بڑھتی گئی۔ اور نقلیں دور دور تک پھیل گئیں۔ خود حافظ شیرازی نے ان کی بعض تصانیف کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ تاشقند کے علوم مشرقیہ کے انسٹی ٹیوٹ منسوب بہ البیرونی میں حافظ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تین مثنویاں "شیریں خسرو" "ہشت بہشت" اور "آئینہ سکندری" موجود ہیں، پھر بھی سات سو سال کا عرصہ کافی طویل ہوتا ہے۔ کتابت کے ذریعہ محدود تعداد ہی میں اشاعت ہو سکتی ہے انقلابات زمانہ کے باعث اور خصوصاً مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد کتابوں کا پتہ چلانا کہ کہاں کہاں ہیں اور تمام کتابیں ہیں بھی یا نہیں مشکل مسئلہ ہو گیا فارسی دانی میں کمی کی وجہ سے یہ مشکل بڑھ گئی۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں اگر ان تمام معلومات کو اکٹھا کرنے کی قابل قدر کوشش نہ کی جاتی اور تصانیف کا احاطہ کرنے کا مستحسن اقدام نہ کیا جاتا تو آج خسریات پر کام کرنا مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن کام بن جاتا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۷ء کے درمیان مختصر سی مدت میں خسریات پر جو بنیادی کام ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اس کام سے جو لوگ وابستہ رہے وہ بلند پایہ عالم تھے اور انھوں نے نہایت و محنت سے اپنے اس کار منصبی کو انجام دیا۔ نہ ایسا شاندار کام ۱۹۱۴ء سے پہلے کبھی ہوا نہ ۱۹۲۷ء سے آج تک ہوا۔ البتہ ۱۹۱۴ء سے قبل کے سناٹے کے مقابلہ میں ۱۹۲۷ء کے بعد وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ کام ہوتے۔ چنانچہ جہاں تک امیر خسرو کی تصانیف کا تعلق ہے حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

نام تصنیف	نام مرتب	مقام و سال اشاعت	
۱۔ تغلق نامہ	ہاشمی فریدآبادی	حیدرآباد	۱۹۳۳ء
۲۔ نہ سپہر	ڈاکٹر وحید مرزا	کلکتہ	۱۹۴۸ء
۳۔ خزائن الفتوح	"	"	۱۹۵۳ء
۴۔ لیلیٰ مجنوں	طاہر احمد محرم اوف	ماسکو	۱۹۶۵ء
۵۔ ہشت بہشت	ظ۔ انصاری غضنفر علیف	"	۱۹۷۲ء

ان کے علاوہ حسب ذیل کتب بعد تصحیح و مقابلہ تیار ہو چکی ہیں اور اشاعت کے لئے تیار ہیں۔

نام تصنیف	نام مرتب	مقام
۱۔ بقیہ نقیہ	سید منال شاہ القادری	کلکتہ
۲۔ تحفۃ الصغر	"	"
۳۔ غرۃ الکمال	ڈاکٹر غلام دستگیر رشید	حیدرآباد
۴۔ اعجاز خسروی	سنٹر آف ایڈوانس اسٹڈیز	علی گڑھ

ان ہسٹری

حضرت امیر خسرو پر جو قابل لحاظ کام ہوتے ہیں ان میں ڈاکٹر اسپرنگر کے مقالہ کو شامل کیا جا سکتا ہے جو جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بھی خسرو کے کلام کا ذکر دلکش انداز میں کیا ہے۔ منشی سید احمد مارہروی کی حیات خسرو (۱۹۰۹ء) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ مولانا شبلی کی حیات خسرو بھی نہایت پر از معلومات کتاب ہے۔ پروفیسر محمد حبیب کا انگریزی مقالہ بھی علمی انداز کا حامل اور قابل قدر کام ہے۔ ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر وحید مرزا نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اپنا مقالہ "امیر خسرو۔ زندگی اور کام" لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ نہایت جامع کتاب ہے ڈاکٹر وحید مرزا کا کام خسرویات میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے کا مستحق ہے۔ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں اور حفظ اللسان معروف بہ خالق باری میں خالق باری کو ضیاء الدین خسرو کی تصنیف قرار دے کر خسرویات میں اہم بحث چھیڑ دی ہے۔ علی عباس حسینی صاحب نے امیر خسرو کا علمی ڈھنگ کی ایک کہانی لکھی

ہے ۔ ڈاکٹر صفدر آہ کی کتاب امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر میں اہم مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ غلام سامانی نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کو نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب پر از معلومات ہے ۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ایک مفید کام ہے ۔ ادارہ تعلیم و ترقی مکتبہ جامعہ سے ایک مختصر رسالہ امیر خسرو کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے شائع ہوا ہے ۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا علمی مقالہ ہے جس میں بڑی محنت سے قیمتی مواد جمع کیا گیا ہے اور امیر خسرو کے کلام کے حوالے دیئے گئے ہیں ۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر تاراچند کا ایک مضمون کتابچہ کی شکل میں امیر خسرو اکیڈمی سے شائع ہوا ہے "انڈو ایرانکا" کے امیر خسرو نمبر (۱۹۷۱ء) میں امیر خسرو پر آٹھ نہایت پر از معلومات مضامین شامل ہیں ۔ اس کے علاوہ مختلف رسالوں میں علمی اور تحقیقاتی مضامین شائع ہوتے ہیں ضرورت ہے کہ ان کی تفصیلی فہرست شائع کی جائے ۔

روس میں بھی خسرویات پر کام ہوا ہے ۔ خمسہ کی پانچوں مثنویوں کی ایڈیٹنگ کا کام ہوا ہے جس سے ہندوستان کے اسکالر ڈاکٹر ظ ۔ انصاری بحیثیت چیف ایڈیٹر وابستہ رہے ہیں ۔ ایران سے انتخاب کلام امیر خسرو نہایت آب و تاب سے شائع ہوا ہے ۔

یہ سب کوششیں جو اس وقت تک ہوئی ہیں اس ضرورت کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں جو خسرویات کے تعلق سے محسوس کی جاتی ہے ۔

خسرویات کے سلسلہ میں جو کام ہونے ضروری ہیں ان میں امیر خسرو کی ان کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دی جانی چاہیے جو اس وقت شائع نہیں ہوئی ہیں ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور سب کی ایڈیٹنگ ہو چکی ہے یعنی بقیہ نقیہ غرۃ الکمال ۔ تحفۃ الصغر اور اعجاز خسروی ۔ یہ کام قومی کمیٹی کے پیش نظر ہے ۔

ان کے علاوہ جو کتابیں قبل ازیں شائع ہو چکی ہیں لیکن دستیاب نہیں ہوتیں ان کی تکرار اشاعت کی ضرورت ہے ۔ اس پراجکٹ کو بھی قومی کمیٹی نے منظور کیا ہے ۔

جو کتابیں امیر خسرو کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان میں سے بعض ان کی نہیں ہیں مثلاً ڈاکٹر وحید مرزا نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ چہار درویش انشائے خسروی ، قصیدہ امیر خسرو مشتمل بہ داستان ، شاہنامہ امیر خسرو کی تصانیف نہیں ہیں ۔ اسی طرح خسرو کے ہندی کلام پر شک کیا جاتا ہے ۔ مخطوطات کی عدم موجودگی میں یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ جو ہندی کلام امیر خسرو سے موسوم ہے اس میں کتنا کلام ان کا ہے اور کتنا الحاقی ۔ اس سلسلے میں اندرونی شواہد سے مدد لینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب امیر خسرو نے ہندی میں بھی شاعری کی ہے ۔ اور صراحت سے اس کا ذکر کیا ہے تو پھر ان کا ہندی کلام کیوں ضائع ہوا اور مخطوطات کی شکل میں کیوں ہم تک نہیں پہنچا خسرویات کے سلسلے میں ان تمام سوالات کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور اس بات کا تعین بھی ضروری ہے کہ کونسی کتابیں امیر خسرو کی ہیں اور کون سی نہیں ۔

قوال ستار وغیرہ کو بھی عام طور پر امیر خسرو کی ایجاد و اختراع خیال کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں بھی قطعی شواہد کی عدم موجودگی میں بعض گوشوں سے اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے ۔ اس سلسلہ میں رسالہ فنون لاہور اکتوبر، نومبر ۱۹۶۴ء میں رشید ملک نے ایک دلچسپ اور پر از معلومات مقالہ موسیقی اور امیر خسرو لکھا ہے ۔ اور طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قوالی اور ستار امیر خسرو سے پہلے کی چیزیں ہیں ۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس سلسلے میں تحقیق کر کے ان اختلافی مباحث کا حل تلاش کیا جائے ۔

امیر خسرو کے کلام میں بعض الفاظ اصطلاحات ۔ تراکیب ۔ استعارے عہدے مناصب لباس ۔ سامان آرائش کے نام استعمال ہوتے ہیں جو امیر خسرو کے زمانہ میں مستعمل تھے ۔ یا تو متروک ہو گئے ہیں یا ان کا تلفظ اور معنی بدل گئے ہیں ۔ ایسی فرہنگ کی ضرورت ہے جو ان تمام الفاظ پر حاوی ہو ۔ ڈاکٹر ظ ۔ انصاری یہ فرہنگ تیار کر رہے ہیں ۔ ان تشریحات کی مدد سے مغلیہ دور سے پہلے تک کی فارسی ادبیات کی مشکلات حل کی جا سکیں گی ۔

حضرت امیر خسرو نے چونکہ بادشاہوں کے دربار میں رہ کر شاعری کی اس لئے ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر وقائع نگاری بھی ملتی ہے ۔ بقول مولانا شبلی قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندیوں کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام محفوظ رکھی گئی ہیں ۔ اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا یہی حال دول رانی خضر خاں خزائن الفتوح (مفتاح الفتوح) کا بھی ہے ۔ دنیا کے کسی اور ادب میں یہ خصوصیت شاید ہی ملے گی کہ شاعری تاریخ کا اتنا اہم ماخذ قرار پائے ۔

اس سلسلے میں ان کے کلام کا ایسا استفادہ نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کا حق تھا ۔ اب ضرورت ہے کہ ان کے کلام کا محتاط ترجمہ اور علمی تجزیہ کیا جائے اور اس مواد پر تحقیقی نظر ڈالی جائے ایسا کرنے سے تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آنے کا امکان ہے ۔

امیر خسرو بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں لیکن ان کا کلام وسیع خطہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو ایک سے زیادہ ملکوں پر مشتمل ہے ۔ اس روس کے علاقوں ، افغانستان اور ایران میں مقبولیت حاصل ہے ۔ اس لئے خسرویات کی صرف قومی نہیں بین الاقوامی اہمیت بھی ہے ۔ اور اس کو اہم مضمرات کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے

خسرویات کے ذریعہ ہم ایک بڑے خطہ کے طرز تخیل کو تشکیل دے سکتے ہیں اور خسرو کے پیام کو عام کر سکتے ہیں اور اس سے دنیا کی بھلائی کے لئے دور رس نتائج حاصل ہو سکتے ہیں ۔

حضرت امیر خسرو کی قلمی تصانیف اب تک معلوم ہو سکی ہیں اُن کی تعداد (۱۸) ہے

ن کے فارسی کلام کا مجموعہ باعتبار ترتیب زمانی پانچ حصوں میں ہے [1]

۱۔ تحفتہ الصغر (۶۶۹ھ) جس میں (۱۹) برس کی عمر تک کہا ہوا کلام شامل ہے

۲۔ وسط الحیات (۶۸۲ھ) اس میں ۳۲ سال کی عمر تک کی شعری تخلیقات ہیں

۳۔ غرۃ الکمال (۶۹۲ھ) اس میں ۴۲ سال کی عمر تک کہا ہوا کلام ہے۔ اس کے

ل دیباچے سے امیر خسرو کی سوانح حیات کے کچھ اشارے بھی ملتے ہیں۔

۴۔ بقیہ نقیہ۔ (۷۱۴ھ)

۵۔ نہایت الکمال (۷۲۵ھ)

ان کے علاوہ امیر خسرو کی ۹ مثنویاں ملتی ہیں جو سب چھپ چکی ہیں۔

۱۔ قران السعدین [2] (۶۸۸ھ)

۲۔ پنج گنج (در جواب خمسۂ نظامی) اس میں یہ پانچ مثنویاں ہیں۔

(۱) مطلع الانوار (۲) شیریں خسرو (۳) لیلیٰ مجنوں (۴) آئینہ سکندری

(۵) ہشت بہشت

۳۔ نہ سپہر (۷۱۸ھ) یہ قطب الدین مبارک شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ وحید مرزا نے اسے ایڈٹ کر کے چھاپ دیا ہے [3]

۴۔ دول رانی خضر خاں [4] (۷۱۵ھ) اس کا نام "عشیقہ" عشقیہ۔ آغاز عشق اور منشور شاہی بھی ہے۔

۵۔ تغلق نامہ [5]۔ (۷۲۵ھ)

فارسی نثر میں ان سے چار کتابیں منسوب ہیں۔

(۱) خزائن الفتوح۔ یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ سے چھپ چکی ہے۔ اسے ڈاکٹر سید معین الحق نے ایڈٹ کیا تھا۔ اور پروفیسر محمد حبیب نے مقدمہ لکھا تھا۔

(۲) اعجاز خسروی۔ اس کا دوسرا نام دلائل الاعجاز بھی ہے۔ اور بعض کتب خانوں کی فہرست میں منشات امیر خسرو کے نام سے درج ہوئی ہے۔

۳۔ افضل الفوائد۔ یہ ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ دونوں چھپ چکے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب میں تصانیف امیر خسرو کا تفصیلی جائزہ موجود ہے۔ انھوں نے تصانیف کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔ لیکن ہم نے یہاں صرف (۱۸) کتابوں کے نام درج کئے ہیں تفصیلی بحث اس مضمون کے دائرے سے خارج ہے۔ اس طرح وحید مرزا نے امیر خسرو کی تصانیف کی ترتیب کا جو زمانہ متعین کیا ہے اس سے متعدد مواقع پر راقم الحروف کو اختلاف ہے۔ اس سلسلہ کی بحث کسی دوسرے مضمون میں ہوگی۔

[2] قران السعدین میں کیقباد اور اس کے باپ بغرا خاں کی ملاقات کا حال ہے۔ تاریخی پس منظر میں اس کی شرح مولوی عبد الحق حقانی دہلوی (مفسر قرآن) متوفی ۱۹۳۲ء کے فرزند مولوی محمد فہمی (متوفی ۱۳۶۲ھ) نے نور العینین فی شرح قران السعدین کے نام سے کی تھی۔ اس کا ابھی تک امیر خسرو کے کسی محقق نے تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتوبہ ۷۵۰ھ انڈیا آفس لندن میں ہے دوسرا نسخہ ۸۰۰ھ کا لکھا ہوا ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں ملتا ہے۔ تیسرا نسخہ ۷۵۰ھ کا لکھا ہوا کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں اور چوتھا انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب خانے میں ہے۔

PUBLISHED FOR THE ISLAMIC RESEARCH ASSOCIATOIN BY GEOFFREY CUMBERLEGE, OXFORD UNIVERSITY PRESS 1950

[3] اس کا ایک بہت نفیس اور خوشنما قلمی نسخہ جو شاہان مغلیہ کے کتب خانے میں رہ چکا ہے، نیشنل میوزیم نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اسے ۸۹۰ھ میں ابن امیر نظام نے لکھا تھا۔ دیکھئے: (No. L. 53. 2/7)

[4] امیر خسرو کی تصانیف میں سب سے کمیاب یہی ہے۔ اب تک اس کا صرف ایک نسخہ ملا ہے جو کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں ہے۔ پروفیسر محمد حبیب کا خیال ہے کہ اسے مغلوں کے زمانے میں تلف کیا گیا ہوگا۔ فرشتہ نے بھی اپنے زمانے میں اس کے کمیاب ہونے کی شکایت کی ہے۔ اب یہ حیدرآباد دکن سے چھپ چکا ہے (۱۹۳۳ء)

۳۔ راحت المحبین اور ان کے نسخے بھی مل جاتے ہیں۔ راحت المحبین کے قلمی نسخے کم ملتے ہیں۔ افضل الفوائد کے خطی نسخے پٹنہ[1]، اعظم گڑھ، دیوبند[2]، نیشنل میوزیم اور علی گڑھ میں موجود ہیں۔ اس مضمون میں انھیں دونوں کتابوں کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

ان کے علاوہ ایک متفرقات کا مجموعہ لالی خمقان معروف بہ جواہر خسروی کے نام سے چھپا تھا (۱۹۱۰ء) جس میں ان کا ہندی کلام اور نصاب بدیع، خالق باری وغیرہ شامل ہیں۔ مگر ان سب کا استناد مشتبہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے خالق باری کا تفصیلی مطالعہ کر کے ثابت کیا ہے کہ عہد جہانگیری کے ایک شاعر ضیاء الدین خسرو شاہ کی تصنیف ہے۔ امیر خسرو سے منسوب ہندی کلام اور پہیلیوں وغیرہ کی بھی کوئی قدیم سند نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ بعض اور کتابوں کا انتساب بھی امیر خسرو سے ہوا ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ قصہ چہار درویش" فارسی ان کی تصنیف ہے[3]۔ اور انھوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے زمانے میں یہ داستان انھیں سنائی تھی۔ ہم نے یہاں مشکوک یا غیر مستند تصانیف کو شامل نہیں کیا ہے۔

(۲)

مردست ہمیں صرف آخری دو کتابوں کا جائزہ لینا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء (وصال ۲۵، ھ/۱۳۲۵ء) کے ملفوظات دو جلدوں میں فراہم کئے تھے۔ پہلی جلد کا نام افضل الفوائد اور دوسری کا راحت المحبین ہے[4]۔ ملفوظات صوفیا کے بعض اور مجموعوں کی طرح ان دونوں کتابوں کا بھی، تصنیف امیر خسرو ہونا مشتبہ سمجھا گیا ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب[5] میں ان کا کہیں نام تک نہیں لیا۔ لیکن وحید مرزا نے افضل الفوائد کو امیر خسرو کی تالیف مانا ہے[6]۔ اور جا بجا اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس وقت پروفیسر محمد حبیب ان کتابوں کے وجود سے بے خبر تھے ورنہ انھوں نے راحت القلوب کو اپنے ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ اور بعد کو انھوں نے خواجگان چشت کے ملفوظات کا تنقیدی مطالعہ کیا[7]۔ تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان میں سے بیشتر جعلی ہیں۔ راحت القلوب، فوائد السالکین اور اسرار الاولیاء کا ایک تنقیدی جائزہ راقم الحروف نے بھی رسالہ منادی" دہلی کے "بابا فرید نمبر" (۱۹۷۳ء) میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب نے ان ملفوظات کے جعلی ہونے کی جو دلیلیں دی ہیں ان سے جناب صباح الدین عبدالرحمٰن کو اختلاف ہے[8]۔ اگرچہ وہ ان ملفوظات کی حمایت میں قوی تر دلائل فراہم نہیں کر سکے ہیں۔

ان ملفوظات کو جعلی قرار دینے کے سلسلہ میں جو خارجی شواہد پیش کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی (وصال ۷۵۷ھ) نے ایک مجلس میں فرمایا کہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء اور ہمارے شجرے کے دوسرے مشائخ میں سے کسی نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے۔ اس پر حمید قلندر جامع خیر المجالس نے بطور تائید کہا، فوائد الفواد میں ہے[9] کہ کسی شخص نے حضرت نظام الدین سے عرض کیا کہ ادھر مجھے ایک شخص نے ایک کتاب دکھائی تھی اور کہا تھا کہ یہ آپ کی تصنیف ہے۔ حضرت نظام الدین نے فرمایا کہ اس نے غلط کہا۔ میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے۔ پھر حمید قلندر نے پوچھا کہ یہ نسخے جو اب ملتے ہیں کیا اس زمانہ میں نہ تھے؟ حضرت چراغ دہلی نے فرمایا کہ نہیں۔ اگر ہوتے تو حضرت شیخ ان کا تذکرہ کرتے اور یہ دستیاب ہوتے۔

حضرت چراغ دہلی نے یہ بھی فرمایا کہ ان ملفوظات میں بہتیری باتیں ایسی ملتی ہیں جو ان بزرگوں کے شایان شان نہیں ہیں[10]۔

۲۔ ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی دو مستند کتابیں فوائد الفواد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء فراہم کردہ امیر حسن علاء سجزی دہلوی) اور سیر الاولیاء مصنفہ سید محمد میر خورد کرمانی میں ان ملفوظات کے مجموعوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ حالانکہ مصنف سیر الاولیاء نے تا بمقدور تمام ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔ اور اسے خاص طور پر ان کتابوں سے باخبر ہونے اور ان تک دسترس حاصل کرنے کے مواقع خوب حاصل تھے۔

۳۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ اور جانشین حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مجلس میں ایک بار ان ملفوظات کا تذکرہ ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت

---

۱ مرآۃ العلوم جلد ۳/۷۱۶ ۲ فہرست مخطوطات دار العلوم دیوبند جلد ۲/۳۶ و ۲/۳، ۳ میراں دہلوی: باغ و بہار (دیباچہ) ۴ یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ ہشت بہشت نامی مجموعے میں شامل ہے جو اللہ والے کی قومی دکان، لاہور (۱۹۵۶ء) اور اس وقت وہی میرے سامنے ہے۔

۵ MOHAMMAD HABIB: HAZRAT AMIR KHUSRAU OF DELHI, (ALIGARH UNIVERSITY PABLICATION, 1927)

۶ WAHID MIRZA (MOHAMMAD): THE LIFE & WORKS OF AMIR KHUSRAU, (PANJAB UNIVERSITY PABLICATION, 1935)

۷ MOHAMMAD HABIB: CHISHTI MYSTIC RECORD OF THE SALTANATE PERIOD, 'MEDIEVAL INDIA' QUARTERLY, VOL. I, II, (1950)

۸ خیر المجالس (مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی) ۵۲ - ۵۳

۹ فوائد الفواد (مرتبہ لطیف ملک) ۷۶، ۱۰ خیر المجالس: ۵۲

۱۱ شائع کردہ: چھاپ اول۔ مطبع محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء صہ

۱۲ جامع الکلم (قلمی) ورق ۹۸ ب

…الدین کے جو ملفوظات امیر حسن شاعر نے جمع کئے ہیں وہ معتبر ہیں، باقی جن لوگوں نے … کے ملفوظات لکھے ہیں "ہم برباد ہوا ہے"۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اجودھن میں … فرید الدین کے ملفوظات کا ایک مجموعہ دیکھا تھا جسے سید بدرالدین اسحاق نے کچھ … مرتب کیا تھا۔ پھر ایک واقعہ سنایا کہ مولانا محمد نامی خواجہ بدرالدین اسحاق کے مرید تھے … انھوں نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات جمع کئے تھے اور ایک بڑی جلد … ہو گئی تھی۔ جب حضرت چراغ دہلی ٹھٹھہ (سندھ) سے واپس آئے تو مولانا محمد وہ … لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت چراغ دہلی نے اپنے بھانجے سید … زین العابدین کو بلایا اور کہا۔ ایک تغار لاؤ۔ وہ لے آئے تو فرمایا۔ اسے پانی سے بھر دو … بھر لیا تو کہا اس کتاب کو پھاڑ کر اس میں دھو ڈالو۔ چنانچہ اپنے سامنے اسے دھلوا دیا۔

جوامع الکلم میں یہ بھی ہے کہ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ مولانا کمال الدین … وہ جز ان ملفوظات کے دکھائے جو حمید قلندر نے فراہم کئے تھے (یہ خیر المجالس … کی طرف اشارہ ہے) حضرت نے فرمایا کہ (من چیزے دیگر گفتہ ام و مولانا حمید الدین چیزے … دیگر گفتہ ام و مولانا حمید الدین چیزے دیگرے نوشتہ است) اور ان اوراق کو لے کر … پھینک دیا۔ لیکن خیر المجالس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حمید قلندر نے ان … ملفوظات کی صحت کے لئے بہت اہتمام کیا تھا۔ اور اسے دوران تالیف میں حضرت … چراغ دہلی کے ملاحظہ کے لئے پیش کرتے رہتے تھے۔

فوائد الفواد کے حسن ترتیب، صحت اور جامعیت کو ملفوظات کا دوسرا کوئی … مجموعہ نہیں پہنچتا۔ امیر حسن علاء سنجری نے بارہ سال میں (۱۸۸) مجلسوں کے ملفوظات … بڑے اہتمام سے جمع کئے۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے دست مبارک سے ان … کی تصحیح کی تھی۔ اس میں کہیں فوائد السالکین، راحت القلوب یا اسرار الاولیاء … وغیرہ کتابوں کا نام تک نہیں آیا۔ جس زمانہ میں فوائد الفواد مرتب ہو رہی تھی اس عہد … کے ملفوظات دُرر نظامیہ میں بھی ملتے ہیں۔ اور دونوں میں امیر خسرو کی افضل الفوائد یا راحت المحبین کا کوئی بھی حوالہ نہیں ہے۔ حالانکہ امیر خسرو نے بھی تقریباً وہی تاریخیں درج کی ہیں۔ امیر حسن دہلوی امیر خسرو کے گہرے دوست تھے۔ اتنے کہ دونوں کی محبت کے افسانے مشہور ہو گئے ہیں۔ مگر فوائد الفواد میں امیر خسرو کا نام صرف ایک جگہ ضمناً آیا ہے۔ ورنہ وہ حاضرین مجلس کے درمیان بھی نظر نہیں آتے۔ اسی طرح افضل الفوائد میں حسن علاء سنجری صرف دو جگہ ملتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل کئی مجموعے فراہم کئے گئے۔ فوائد الفواد کے علاوہ ایک مجموعہ انوار المجالس سید محمد امام بن خواجہ بدرالدین اسحاق دہلوی نے مرتب کیا تھا۔ تیسرا عزیز الدین صوفی نے تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار ترتیب دیا۔ اسے بھی حضرت نظام الدین نے ملاحظہ فرما کر تصحیح کی تھی۔ چوتھا مجموعہ حضرت کے بھانجے ابوبکر مصلی بردار کے فرزند عبدالعزیز نے تیار کیا تھا۔ اور اس کا نام مجموع الفوائد رکھا تھا۔ پانچویں کتاب ملفوظات المشائخ تھی۔ جسے خواجہ شمس الدین دہلوی نے ترتیب دیا تھا۔ زبان عربی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ایک تالیف خلاصۃ اللطائف مولانا علی بن محمود جاندار نے لکھی تھی۔ جس کا ایک اقتباس سیر الاولیاء میں موجود ہے۔ اور وہیں سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے۔ ساتواں مجموعہ دُرر نظامیہ ہے۔ اس کے مؤلف بھی یہی علی بن محمود جاندار ہیں۔ اور صرف اسی کتاب کا قلمی نسخہ ملتا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ اردو ترجمہ البتہ چھپ گیا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی ذات میں بقول حضرت بابا فرید گنج شکرؒ علم اور عقل اور عشق تینوں جوہر جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے بہترین علماء سے پڑھا تھا۔ جن میں مولانا امین الدین محدث تبریزی، مولانا کمال الدین زاہد، مولانا علاء الدین اصولی اور حضرت بابا فرید گنج شکر جیسی باکمال ہستیاں ہیں۔ جو اس وقت تک جو کتابیں تصوف، فقہ اور حدیث کی رائج تھیں وہ حضرت کے مطالعے

۵۔ اسرار الاولیاء کی طرف اشارہ ہے۔ اس کتاب کا بھی تنقیدی جائزہ "بابا فرید نمبر" میں شامل ہے۔ ۶۔ جوامع الکلم (قلمی) ورق ۸۹ ب۔ یہ مولانا سید محمد امام کی طرف اشارہ ہے۔ جو … بابا بدرالدین اسحٰق کے فرزند تھے۔ بستی نظام الدین اولیاء میں ان کا مزار ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے مورث اعلیٰ تھے۔ (حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ سیر الاولیاء/۲۰۰-۲۰۱) انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات بھی انوار المجالس نامی کتاب میں جمع کئے تھے۔ اس کے کچھ اقتباسات سیر الاولیاء صفحہ ۲۰۰، ۲۰۹ میں آئے ہیں۔ اور انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے ہی "بے تکلف" اظہار کی وجہ سے اس مجموعے کو قصداً نظر انداز کیا گیا ہو گا۔ ٹھٹھہ سے واپسی انتقال سے چھ سال قبل ہوئی تھی۔ جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۰ ب۔ ۹۰ الف جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۰ الف خیر المجالس ص ۲۱۸ خیر المجالس صفحہ ۱۲ فوائد الفواد: ۴۹۔ سیر الاولیاء/۳۰۸

دُرر نظامیہ کے بارے میں میرا ایک تفصیلی مضمون منادی کے بابا فرید نمبر میں شامل ہے۔ فوائد الفواد: ۲۴۲ افضل الفوائد (اردو ترجمہ) صفحات ۲۰-۴۵

سیر الاولیاء: ۱۴۷ سیر الاولیاء: ۲۰۲ سیر الاولیاء: ۲۰۷ سیر الاولیاء/ ۳۱۸ سیر الاولیاء/ ۳۳۹ اخبار الاخیار/ ۹۴-۹۵۔ … میں خلاصۃ اللطائف کا جو اقتباس عربی میں ملتا ہے وہی دُرر نظامیہ۔ باب ۱۶ صفحہ ۱۳۹ میں پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ خلاصۃ اللطائف میں وہی … مطالب عربی زبان میں بیان ہوں گے جو دُرر نظامیہ میں فارسی میں ہیں۔

بوہار کلکشن (نمبر ۱۸۳) کتب خانہ نذیریہ، اردو بازار دہلی سنہ ندارد دُرر نظامیہ باب ۲۱ ص ۱۸۸ نیز فوائد الفواد: ۲۴۳ سیر الاولیاء ص ۱۰۱، اخبار الاخیار …

فوائد الفواد: ۲۷۸، ۳۴۰، ۳۴۱ وغیرہ۔ خیر المجالس: ۱۹۰، ۱۹۱ تذکرۃ الواصلین: ۹۰

بابا فرید سے انھوں نے عوارف المعارف کا درس لیا تھا۔ فوائد الفواد/۴۳۔ اس کے علاوہ ملاقات نامہ میں تمہید ابوشکور سلمی کا حوالہ بھی آیا ہے۔ سیر الاولیاء/ ۱۱۷

سیر الاولیاء/ ۱۰۱

میں رہتی تھیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ بحّاث "اور محفل شکن مشہور تھے۔[1] فوائد الفواد میں فقہ، حدیث، تفسیر، اخلاق، تصوّف اور سلوک کے جو نکتے بیان ہوئے ہیں یا خیرِ نظامیہ میں جو معارف ہیں انھیں دیکھ کر کسی کو بھی یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہو سکتی کہ حضرت نظام الدین اعلیٰ درجہ کا علمی ذوق رکھتے تھے اور ان کی مجلسوں میں بہترین علمی نکات بیان ہوتے تھے۔ غیاث الدین تغلق نے سماع کے موضوع پر جو مناظرہ اپنے دربار میں منعقد کرایا تھا[2] اس میں حضرت تنہا تھے۔ مگر آپ نے تمام علماءٔ کی زبان بند کر دی تھی۔ لیکن جعلی ملفوظات کے مجموعوں میں یا تو وہ روایات ہیں جنھیں اسرائیلیات کہا جاتا ہے یا قصص الانبیاء کے اقتباسات ہیں یا فوق الفطرۃ عناصر، غیر معمولی مجاہدات و کرامات اور مبالغہ آمیز فضائل کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اگر فوائد الفواد یا خیرِ نظامیہ کے مطالب کا موازنہ مثلاً افضل الفوائد اور راحت المحبّین کے مندرجات سے کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے اور اس سے یہ شبہ قوی تر ہو جاتا ہے کہ یہ ملفوظات بعد میں دوسری کتابوں کو سامنے رکھ کر وضع کر لیے گئے ہیں۔ ضیاء الدین برنی نے یہ تو ہمیں بتا ہی دیا ہے کہ ایسی کتابوں کی مانگ اس زمانے میں اچانک بڑھ گئی تھی۔[3]

وہ تمام ملفوظات جن پر جعلی ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر باہم مماثل بھی ہیں۔ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیاء، افضل الفوائد یا راحت المحبین ان سب کتابوں کی ساخت ایک سی ہے۔ کسی میں بھی تاریخیں قلم بند کرنے کا وہ اہتمام نہیں ہے جو فوائد الفواد میں پایا جاتا ہے۔ حاضرین بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے نہیں ملتے۔ بات چیت اکثر بغیر کسی سیاق و سباق کے شروع ہوتی ہے اور اسی طرح اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ مختلف کتابوں کے حوالے ان سب ملفوظات میں بار بار آتے ہیں کہ "میں نے فلاں کتاب میں لکھا دیکھا ہے...." اس کے برعکس فوائد الفواد کا انداز ایک حقیقی ملفوظ کا ہے۔ اس کی مجلسوں میں زندگی کی مہک اور موضوعات میں تنوع ہے اور اس کے مطالعے سے دل کو سرور اور دماغ کو نور حاصل ہوتا ہے۔

"جعلی ملفوظات" کی تاریخیں بھی اکثر غلط ہیں۔ اور ان کا تطابق دوسرے ماٰخذ کی مدد سے نہیں ہوتا۔ اگر ان میں دیئے ہوئے سنین پر بھروسہ کیا جائے تو کسی واقعے کی صحت بھی قابل اعتبار نہیں رہتی۔ مگر صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ان کے دفاع میں کہتے ہیں کہ سنین کا غلط ہونا کاتبوں کا تصرف ہے۔ اگر انھیں کاتبین کی کرامات سمجھ کر ان سے صرف نظر کیا جائے اور صرف مطالب پر نظر کی جائے تو گتھی حل ہو جاتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کاتبوں کو تاریخ و سال ہی سے کیا دشمنی تھی۔ ہم ایک دو مواقع پر تو یہ عذر قبول کر سکتے ہیں مگر یہاں تو "پنبہ کجا کجا نہم" والا معاملہ ہے۔

ان سب ملفوظات کا گہرا تحلیلی مطالعہ کرنے کے بعد فی الحال میری رائے بھی یہی ہے کہ موجودہ صورت میں ان کی صحت مشکوک ہے اور ان صوفیا رہے عوام کی عقیدت و محبت کو دیکھتے ہوئے بعض کتب فروشوں نے تصوف کی کچھ معتبر اور کچھ نامعتبر کتابوں کے اقتباسات کو زبانی روایات سے مخلوط کر کے انھیں وضع کیا ہے۔ یہ کچھ ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ سیکڑوں مصنفوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوتی ہے۔ جاحظ کی زندگی میں اس کے نام سے کتابیں لکھ کر بیچی جاتی تھیں۔ خواجہ فرید الدین عطار سے کتنی ہی کتابوں کا غلط انتساب ہوا ہے۔ دیوان بو علی شاہ قلندر، دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، دیوان خواجہ معین الدین اجمیری اور دیوان زیب النساء مخفی اس کی چند مثالیں ہیں۔

مذکورۂ بالا شبہات امیر خسرو کی افضل الفوائد اور راحت المحبّین پر بھی اسی طرح وارد ہوتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا تذکرہ نہ تو خود امیر خسرو نے اپنی کسی دوسری تصنیف میں کیا ہے۔ نہ ان کا حوالہ فوائد الفواد۔ خیرِ نظامیہ، خیر المجالس، سیر الاولیاء، جوامع الکلم یا اخبار الاخیار جیسی قدیم تالیفات میں پایا جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ میں امیر خسرو سے منسوب ان دونوں کتابوں کے جعلی ہونے کا اعلان قطعیت کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ بعض شواہد ان کے حق میں بھی مل جاتے ہیں، جن میں سب سے قوی شہادت یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریب ہانسوی (متوفی ۷۳۸ھ) کے مریدوں میں تین بھائی تھے۔ ایک خواجہ حماد کاشانی (متوفی ۷۶۱ھ) جنھوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات احسن الاقوال کے نام سے جمع کیے تھے[4] اور اس کے علاوہ منافع المسلمین، اسرار الطریقۃ اور حصول الوصول بھی ان کی تصانیف ہیں۔ دوسرے بھائی خواجہ مجد الدین کاشانی تھے جنھوں نے غرائب الکرامات اور بقیۃ الغرائب نامی دو کتابوں میں حضرت برہان الدین غریب کے ملفوظات کو جمع کیا تھا۔[5] تیسرے بھائی خواجہ رکن الدین دبیر کاشانی نے ایک قابل قدر کتاب شمائل الاتقیا و دلائل الاشقیا[6] لکھی تھی۔ جو چشتی سلوک کا مستند اور مفصل ضابطہ ہے۔ رکن دبیر نے بھی حضرت برہان الدین کے ملفوظات نفائس الانفاس نامی مجموعے میں فراہم کیے تھے۔

---

[1] سیر الاولیاء/۱۰۱ [2] اس کی روداد سیر الاولیاء/۵۲۵ - ۵۳۲ میں ملے گی۔ مولانا فخر الدین زرّادی کا رسالہ کشف القناع عن وجوہ السّماع بعد کو اسی سلسلے میں لکھا گیا ہے اور اس میں بھی مناظرے کی کچھ روداد موجود ہے۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں [3] ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی (بحوالہ وحید مرزا/۱۱۲) [4]

SEE MY ARTICLE AHSAN AL-AQWAL AN EARLY SOURCE ON HAZRAT SHEIKH FARID. PUBLISHD THE 'JOURNAL OF SIKH STUDIES' VOLUME 1, No. 2 (AUGUST, 1974) P 86

[5] یہ دونوں کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں مگر نقشی رونق علی کی تصنیف روضۃ الاقطاب میں ان کے حوالے موجود ہیں۔ [6] یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے۔ دکنی زبان میں اس کا ترجمہ میراں یعقوب نے کیا تھا۔ اس کا انتخاب ایک طویل مقدمہ کے ساتھ بدیع حسینی نے رسالہ تذاکیم اردو (جلد دوم) میں چھاپا ہے۔ شمائل الاتقیا کے قلمی نسخے نیشنل میوزیم نئی دہلی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری، درگاہ شاہ امین الدین اعلیٰ (بیجاپور) انڈیا آفس اور برٹش میوزیم میں ملتے ہیں۔ راقم الحروف نے نیشنل میوزیم کے نسخوں کو دیکھا ہے۔ [7] یہ کتاب بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ابھی تک صرف ایک قلمی نسخہ معلوم ہے جو کتب خانہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں محفوظ ہے۔

ایک تیسری کتاب معروف العارفین ہے جس کے متعدد اقتباسات شمائل الاتقیا میں آئے ہیں۔

شمائل الاتقیا کی تالیف کا انداز یہ ہے کہ سلوک کے مختلف موضوعات پر مشائخ صوفیہ کی مستند کتابوں سے اقتباسات جمع کئے گئے ہیں۔ جن کتابوں سے عبارتیں ماخوذ ہیں ان میں ان کے حوالے آئے ہیں۔ دیباچہ میں بھی مولف نے طویل فہرست اپنے مصادر کی درج کر دی ہے۔ اس کتاب کی تالیف نفائس الانفاس کے بعد ہوئی ہے۔ اور دوران تالیف ہی میں (۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء) حضرت برہان الدین غریب کا انتقال ہو گیا تھا۔ یعنی شمائل الاتقیا کی تالیف کا آغاز تو حضرت کے ایما سے ہوا۔ مگر آپ اس کو تکمیل کے بعد ملاحظہ نہ فرما سکے تھے۔

دیباچۂ شمائل الاتقیاء میں مآخذ کی جو فہرست ہے اس میں انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب اور اسرار المتقربین کے علاوہ راحت المحبین ملفوظ شیخ نظام الدین جمع تالیف امیر خسرو بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شمائل الاتقیا حضرت امیر خسرو کے انتقال (۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) سے چودہ سال بعد حضرت برہان الدین غریب کے حکم سے لکھی گئی۔ جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں گزارا تھا۔ اور عمر کے آخری دور میں اپنے مرشد کے حکم سے ہی دکن تشریف لے گئے تھے[۱]۔ حضرت امیر خسرو سے بھی ان کے قربت اور اختصاص کے تعلقات تھے[۲]۔ اگر یہ کتابیں امیر خسرو کی وفات کے بعد لکھی گئی ہوتیں اور ان کا تصنیف امیر خسرو ہونا مشتبہ ہوتا تو حضرت برہان الدین غریب شمائل الاتقیاء کی تالیف میں ان سے استفادے پر ضرور اعتراض کرتے۔ یہ باور کرنے کے لئے بھی قرینہ موجود ہے کہ چشتی سلسلہ کے صوفیا کی یہ کتابیں حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ ہی دکن پہنچی ہوں گی کیونکہ آپ دکن کو ہجرت کرنے والے متقدمین چشتی صوفیا میں سے ہیں۔ آپ سے پہلے صرف آپ کے برادر خورد حضرت شیخ منتجب الدین ہانسوی (متوفی ۷۰۹ھ) دولت آباد تشریف لے گئے تھے۔[۳]

افضل الفوائد کا نام شمائل الاتقیاء میں نہیں آیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا تھا کہ وہ مستند نہیں ہے یا اس وقت تک وجود میں نہ آئی ہوگی۔ اور راحت المحبین امیر خسرو کی تالیف ہے۔ لیکن موخر الذکر کے دیباچہ میں ہے۔

> "بیسویں رجب ۷۱۹ھ کو... قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے جو کچھ میں نے جناب کی زبان مبارک سے سنا اسے قلم بند کرتا رہا اور اس کا نام افضل الفوائد رکھا جو منظور نظر عالی ہو چکا۔ اب بھی اگر فرمان ہو تو جو کچھ جناب کی زبان مبارک سے سنا جائے وہ قلمبند کیا جائے تاکہ دوسری جلد مرتب ہو جائے۔ لیکن اس جلد میں زیادہ تر انبیاء اور سلوک کی حکایات ہوں تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو۔ آپ نے فرمایا کہ بہتر۔ پھر مسکرا کر فرمایا کہ چونکہ تمہارے دل میں ایسی تمنا تھی اس لئے میں نے نماز کے بعد انبیاء کا ذکر شروع کیا ہے[۴]..."

اس سے ظاہر ہے کہ افضل الفوائد پہلی جلد ہے اور راحت المحبین کو اس کی جلد ثانی کی حیثیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور دوسری جلد کے دیباچے میں جلد اول کا حوالہ ملتا ہے۔ لہٰذا دونوں کتابوں کا انتساب حضرت امیر خسرو سے درست ہے۔

یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے جو سرسری طور پر غیر متعلق معلوم ہوگی۔ مگر اس سے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ ہمارے اس مطالعے کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔ راحت القلوب کا حوالہ بھی شمائل الاتقیاء میں موجود ہے۔ یہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات ہیں جن کے مولف حضرت نظام الدین اولیاء (وصال ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) بتائے جاتے ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور خود راقم الحروف نے راحت القلوب کے جعلی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے دیکھے ہیں۔ اور سب سے قدیم نسخہ جو میری نظر سے گزرا ہے وہ ۱۰۲۴ھ کا مکتوبہ تھا۔ اس سے میرا خیال تھا کہ راحت القلوب دسویں یا گیارہویں صدی ہجری میں کسی نے گڑھ لی ہے مگر شمائل الاتقیاء میں اس کا حوالہ دیکھ کر میں اس رائے سے رجوع کر چکا ہوں۔ اگرچہ ابھی تک اس کتاب کے "مستند" ہونے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ مطمئن نہیں ہوں۔

راحت القلوب کے جعلی ہونے کی دوسری دلیل جس پر بعض اور امور کی صحت کا بھی دارومدار ہے یہ ہے کہ اس میں پہلی مجلس کی تاریخ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ روز چہارشنبہ درج ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کی تاریخ وفات ۵ محرم ۶۶۴ھ تسلیم کی گئی ہے[۵]۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں فرمایا کہ میں نے اجودھن کے ۷ یا ۸ سفر کئے[۶]۔ جن میں تین سفر شیخ کی حیات میں ہوئے۔ اور باقی سفر ان کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے کئے گئے۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ بابا صاحب نے (۹۸) سال کی عمر پائی تھی[۷] اور حضرت نظام الدین اولیاء نے بابا صاحب کی زندگی کے آخری تین یا چار برسوں میں ملاقات کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں اکثر رمضان کا مہینہ وہیں گزارتے تھے۔ آخری رمضان ہی میں خلافت ملی تھی۔ اور اسی شوال میں دہلی کو واپسی ہوئی تھی[۸]۔ جس کے تین ماہ بعد محرم میں بابا صاحب کا وصال ہو گیا تھا۔

اگر ۶۶۴ھ بابا صاحب کی وفات کا سال مانا جائے تو حضرت نظام الدین اولیاء کی پہلی حاضری ۶۶۰ھ یا ۶۶۱ھ میں ہو سکتی ہے۔ دُرر نظامیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب حضرت بابا فرید نے خلافت نامہ لکھوا کر دیا تو حضرت نظام الدین سے فرمایا کہ اسے ہانسی (ہریانہ) میں شیخ جمال الدین کو اور دہلی جا کر قاضی منتجب الدین کو دکھا دینا[۹]۔ حضرت نظام الدین نے دل میں سوچا کہ انھوں نے اپنے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کو اجازت نامہ دکھانے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ شاید آپ ان سے کچھ ناراض ہیں۔ دہلی آ کر معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور دُرر نظامیہ سے صراحت کے ساتھ ان کی تاریخ وفات

---

[۱] سیر الاولیاء/۲۸۲ - روضۃ الاقطاب/۱۲۱ [۲] اخبار الاخیار (شیخ عبدالحق محدث دہلوی) ص ۹۳-۹۴ [۳] رونق علی: روضۃ الاقطاب ص ۱۲۱ [۴] راحت المحبین (اردو ترجمہ): ۱۰۵ [۵] اخبار الاخیار ص ۵۴ (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۲ھ) [۶] فوائد الفواد/۲۰۰ [۷] محمد علی سامانی نے سیر محمدی (تالیف ۸۳۱ھ) میں لکھا ہے کہ ۲۴ رجب ۸۱۸ھ کو حضرت بندہ نواز نے فرمایا کہ آج کے روز میری عمر بھی حضرت شیخ الاسلام فرید الدین مسعود قدس سرہ کی عمر کے مساوی ہو چکی۔ یعنی آپ کی عمر شریف ہنگام رحلت ۹۸ سال تھی [۸] سیر الاولیاء/۹۹ [۹] دُرر نظامیہ (باب ۱۴) ص ۴۷

میں ۶۶۰ھ معلوم ہوئی ہے۔[1] اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بابا صاحب سے خلافت نامہ ان ۶۶۰ھ میں ملا تھا۔ اور اسی مہینہ میں حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد بابا صاحب تقریباً چار سال تک حیات رہے۔

لیکن شمائل الاتقیاء کا جو قلمی نسخہ (مکتوبہ ۱۰۹۰ھ / ۱۶۷۹ء) یہاں نیشنل میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کے آخری ورق پر کسی شخص نے جس کی تحویل میں یہ کتاب رہی کچھ یادداشتیں قلم بند کر دی ہیں۔ اس میں حضرت برہان الدین غریب کا نسب نامہ درج ہے ان کے بھائیوں کے نام بھی بتائے ہیں۔

"اول۔ برہان الدین قتال۔ دوم۔ بابا محمد عرف حضرت شاہ برہان الدین، سوم۔ الفتح، چہارم۔ منتخب الدین۔"

اور بہنوں کے نام بی بی عائشہ، بی بی امینہ، بی بی خدیجہ اور بی بی مریم لکھے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ آپ کی والدہ کا نام بی بی حاجرہ تھا۔ اور الرضوان کو ان کا عرس ہوتا ہے۔ اس کے بعد بعض تاریخی مادّے درج کئے ہیں جو یہ ہیں۔

۱۔ حضرت نظام الدین اولیاء — شہنشاہِ دین۔ (۷۲۵ھ)

۲۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری۔ آفتابِ ملکِ ہند (۶۳۳ھ)

۳۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی — خواجہ جیو (۶۳۴ھ)

۴۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ۔ کلید گنجِ شکر (۶۵۷ھ)

۵۔ امیر حسن دہلوی۔ طوطیٔ شکر مقال (۷۲۵ھ) [2]

۶۔ حضرت برہان الدین غریبؒ — نورِ عشق بود (۷۳۸ھ)

اگر ان مادّہ ہائے تاریخی کو درست مانا جائے تو کچھ نئے سوالات ابھرتے ہیں بعض کتب ملفوظات میں لکھا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے ایک ہی سال میں رحلت کی[3] اور یہ ۶۳۳ھ کا واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ فوائد الفواد میں التمش کی تاریخ وفات درج ہے۔[4]

"از آنجا تاریخ نقلِ سلطان شمس الدین یاد کردند خواجہ ذکرہٗ اللہ بالخیر ایں بیت بر زبانِ مبارک راندند

سال ششصد وسی وسہ از ہجرت ∴ نماند شاہجہاں شمس، دین عالمگیر (کذا)

سیر الاولیاء میں بھی ہے کہ قاضی محی الدین کاشانی نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ جس سال سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہوا ہے اسی سال شیخ قطب الدین بختیار کاکی اور مولانا قطب الدین کاشانی نے بھی رحلت فرمائی ہے یہ سن کر حضرت نظام الدین نے یہ شعر پڑھا[5]

بسال ششصد وسی وسہ بود کز ہجرت
نماند شاہجہاں شمس دین عالمگیر (کذا)

لیکن اس شعر کا پہلا مصرع دونوں کتابوں میں ساقط الوزن ہے۔ اس کی طرف "فوائد الفواد" کے نئے ایڈیشن کے مرتب نے بھی توجہ نہیں کی۔ صحیح شکل یہ ہے۔

بسال ششصد وسی وچہار از ہجرت
نماند شاہجہاں شمس دین عالمگیر

اور یہی فوائد الفواد کے بعض قلمی نسخوں میں پائی جاتی ہے[6] اس سے معلوم ہوا کہ ۶۳۴ھ میں التمش نے انتقال کیا اور یہی اعداد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مادۂ تاریخ وفات "خواجہ جیو" سے برآمد ہوتے ہیں۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے بھی اسی سال رحلت فرمائی تھی۔ اسے ماننے میں ذرا سی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ مادۂ تاریخ وفات "آفتاب ملک ہند" سے ۶۳۳ھ مستفاد ہیں۔ علی بن محمود جاندار نے دُررِ نظامیہ میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے آخری سفرِ دہلی کا حال لکھا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت ..... ہنوز اجمیر نہ پہونچے تھے کہ دہلی میں حضرت خواجہ قطب الدین نے انتقال فرمایا[7]

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ۱۴ ربیع الاول ۶۳۴ھ کو انتقال فرمایا اور اس سے تین ماہ کے بعد (رجب ۶۳۴ھ) میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کا وصال تسلیم کیا جائے گا۔ اس اشکال کو رفع کرنے کی یہ صورت ہے کہ "آفتاب" کو "افتاب" سمجھا جائے۔ یعنی قدیم رسم الخط میں الف ممدودہ کو دو الف کا قائم مقام سمجھتے تھے۔ اس طرح اس مادے سے بھی ۶۳۴ھ برآمد ہوں گے۔ تاریخ نگاروں نے ایک عدد کی کمی بیشی کو جائز بھی رکھا ہے۔

اب رہا حضرت بابا فرید گنج شکر کے انتقال کی تاریخ کا مادہ "کلید گنج شکر" تو اس سے ۶۵۷ھ / ۱۲۵۸ء برآمد ہوتے ہیں۔ اگر اسے صحیح مانا جائے تو بعض اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض رفع بھی ہو جاتے ہیں۔

(الف) ۶۵۷ھ تاریخ وفات مانیں تو حضرتِ نظام الدین اولیاء کی پہلی حاضری کا سنہ ۶۵۵ھ ہو جاتا ہے۔ جو راحت القلوب میں دیا ہوا ہے۔

(ب) حضرتِ امیر خسرو اپنے والد امیر سیف الدین محمود کے ساتھ آٹھ سال کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ امیر خسرو کی ولادت[8] ۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا انتقال ۶۵۹ھ / ۱۲۶۱ء میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امیر خسرو جس سال پہلی بار اپنے والد کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں باریاب ہوئے ہیں اسی سال یا اس سے ایک سال کے بعد ان کے والد نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہے۔ اگر امیر سیف الدین حضرت نظام الدین کے مرید بھی تھے تو حضرت اس وقت تک کسی کو بیعت نہیں کر سکتے تھے، جب تک خود آپ کو خلافت و اجازت نہ ملی ہو۔ لہذا یہ ماننا لازم آئے گا کہ ۶۵۹ھ تک حضرت نظام الدین کو اجازت مل چکی تھی اور اس سے بھی بابا فرید گنج شکرؒ کا سنہ وفات ۶۵۷ھ تسلیم

۱؎ دُررِ نظامیہ (باب ۱۴) ص ۱۲۰ ، ۲؎ یہ تاریخ وفات حضرت امیر خسرو کی ہے اور ان کے مزار کے کتبہ پر یہی کندہ ہے۔ امیر حسن دہلوی کا انتقال ۷۳۸ھ میں ہوا تھا۔ ۳؎ اخبار الاخیار/ ۲۳

۴؎ فوائد الفواد: ۲۹۵ ، سیر الاولیاء/ ۵۶ ، ۵؎ سیر الاولیاء: ۵۶ ۶؎ فوائد الفواد (قلمی نسخہ برٹش میوزیم۔ ورق ۸۲ ، ۷؎ دُررِ نظامیہ (باب ۲۴) ص ۲۱ ، ۸؎ یہاں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کا موقع نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی ولادت کا زمانہ ۶۵۲ھ متعین کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ۶۵۰ھ ہونا چاہیئے۔ اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں۔ شہزادہ سلطان شہید کے مرثیہ میں بھی امیر خسرو نے لکھا ہے کہ اب ۶۸۳ھ ہے۔ اور میری عمر ۳۲ سال ہو چکی ہے (دیکھو وحید مرزا) ص ۶۳ وغیرہ۔

کہ اسکا ایک قوی دلیل مل جائے گی۔

مگر اس کے سوا ۷۲۵ھ کو تاریخ وفات مان لینے سے کچھ اور عقدے پیدا ہوں گے جن کی تفصیل موجودہ موضوع کے احاطے سے باہر ہے۔ اس لئے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں اور فی الحال راحت القلوب کے بارے میں اپنی سابقہ رائے پر قائم ہوں۔

دراصل بزرگان چشت کے بارے میں تاریخوں کا زیادہ تر دار و مدار سیر الاولیاء پر ہے۔ اور اس کا یہ حال ہے کہ صرف ایک بار (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) دلی سے چھپی ہے اور اس کا متن بھی ایک اٹھارہویں صدی عیسوی کے مخطوطے پر مبنی ہے۔ اس میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ تحریف اور رد و بدل بھی ہوا ہے۔ اور بیشتر مواقع پر ناشر یا مرتب سے صحیح عبارت پڑھی ہی نہیں گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کا ایک تنقیدی متن تمام معلوم خطی نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا جائے۔ اور یہ کام راقم الحروف نے شروع کر رکھا ہے۔

افضل الفوائد میں (۳۴) مجلسوں کے ملفوظات ہیں جن میں پہلی مجلس کی تاریخ ۲۴ ذی الحجہ ۷۱۲ھ اور آخری مجلس ۱۰ ذی قعدہ ۷۱۵ھ یکشنبہ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر تاریخوں کا مقابلہ تقویم سے کیا گیا تو مطابقت نہیں پائی گئی۔ اس کی تفصیل یہاں شاید غیر دلچسپ ہوگی۔ مگر اشارۃً ایک مثال لکھنا کافی ہے۔

(الف) افضل الفوائد کی تیسری مجلس کی تاریخ ۱۰ محرم (۷۱۴ھ) بتائی گئی ہے۔ اور دن پنجشنبہ لکھا ہوا ہے۔ اس حساب سے ۱۲ محرم کو شنبہ ہونا چاہیئے۔ مگر وہاں اس تاریخ کو دن چہار شنبہ بتایا ہے۔

حاضرین مجلس میں مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا برہان الدین غریب، مولانا فخر الدین زرادی مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی اکثر مجلسوں میں موجود ہیں۔ لیکن ایک مجلس میں مولانا جمال الدین ہانسوی بھی حاضر ہیں۔ اور ان کی موجودگی میں محفل سماع برپا ہوئی ہے۔ اگر کتابت کی غلطی نہیں ہے اور تمام قلمی نسخوں میں شیخ جمال ہانسوی ہی کا نام ملتا ہے تو یہ افضل الفوائد کے جعلی ہونے کی قوی ترین داخلی شہادت مانا جائے گا۔ کیونکہ شیخ جمال الدین ہانسوی کا انتقال حضرت بابا فرید گنج شکر کی حیات ہی میں ہو چکا تھا۔ اور اس کا حوالہ دُرر نظامیہ میں بھی موجود ہے۔[1] ۷۱۴ھ میں وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں کیسے موجود ہو سکتے ہیں۔ ان کا حال بھی اس طرح لکھا ہے[2] کہ جب وہ آئے تو آداب بجا لاکر بیٹھ گئے۔ حالانکہ حضرت شیخ جمال ہانسوی حضرت بابا فرید کے خلیفۂ اول تھے۔ اور جب بابا فرید صاحب کسی کو خلافت نامہ لکھ کر دیتے تھے تو اسے یہ حکم بھی ملتا تھا کہ اسے ہانسی میں شیخ جمال کو (تصدیق کے لئے) دکھا دینا۔ خود حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی اپنا خلافت نامہ انھیں لاکر دکھایا تھا۔ تو انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا۔[3]

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس

ان کے ساتھ ہی محفل سماع میں رقص کرنے والے شیخ عثمان سیاح ہیں۔ یہ حضرت ابو الفتح شیخ رکن الدین سہروردی کے مرید تھے۔ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی مجالس میں اکثر آیا کرتے تھے۔ شیخ جمال ہانسوی سے عمر اور رتبہ میں یقیناً بہت کم تھے۔ ان کے ساتھ سماع میں وجد کرنا یوں بھی ادب کے خلاف ہوتا۔ اور شائد جس شیخ کے وہ مرید تھے اگر سنت پر عامل ہوں تو ممکن ہے کہ سماع سے بالکل ہی محترز رہتے ہوں۔

افضل الفوائد کی پہلی مجلس ۷۱۲ھ کی ہے۔ اور اسی سنہ کی سترہ (۱۷) مجلسیں فوائد الفواد کی جلد سوم میں موجود ہیں جن میں آخری محفل ۲۱ ذی قعدہ ۷۱۳ھ کی۔ ان تاریخوں کے آس پاس ہی افضل الفوائد کی مجلسیں قلم بند ہوتی رہیں۔ مگر فوائد الفواد میں نہ وہ شخصیات نظر آتی ہیں نہ وہ موضوعات ہیں جو ہمیں امیر خسرو کے مرتب کردہ ملفوظات میں ملتے ہیں۔

ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ افضل الفوائد کا مسودہ امیر خسرو نے حضرت نظام اولیاء کے ملاحظہ میں پیش کیا تھا۔

"ستائیسویں ماہ جمادی الثانی کو پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس روز میں نے جز جن میں خواجۂ راستان کے الفاظِ دربار لکھے تھے حاضر خدمت کئے اور عرض کیا کہ آج تک کچھ بندہ نے جناب کی زبان مبارک سے سُنا، اپنی سمجھ کے مطابق اسے قلم بند کرتا رہا۔ اور اس کا نام افضل الفوائد رکھا۔ جناب نے یہ سن کر ان اجزا کا مطالعہ کر کے فرمایا کہ اچھا لکھا ہے اور عمدہ نام رکھا ہے۔ اور جہاں کہیں مجھ سے کوئی بات رہ گئی تھی اپنے دست مبارک سے لکھدی۔"[5]

ایسا ہی بیان فوائد الفواد کو شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کے بارے میں امیر حسن نے بھی لکھا ہے۔ ۲۴ محرم ۷۱۴ھ کی مجلس میں ہے۔

"سعادت پابوس بدست آمد۔ آن روز بندہ مجلدِ اول کہ ہم از ین فوائد الفواد جمع کردہ شدہ است، بحکم فرمان پیش برد۔ چون مطالعہ فرمودہ مشرفِ استحسان ارزانی داشت و فرمود کہ نیکو نوشتہ ای و درویشانہ نوشتہ ای و نام ہم نیکو کردہ ای۔"[6]

ان دونوں بیانوں کا لفظاً و معناً ایک ہونا خاصا قوی شبہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ ان "جعلی" ملفوظات میں ایسا مواد بالکل نہیں ہے جو اس عہد کے سیاسی یا اور معاشی حالات پر روشنی ڈالتا ہو۔ یہی کیفیت افضل الفوائد کی بھی ہے۔ مگر اس کے بجائے فوائد الفواد، دُرر نظامیہ، سیر الاولیاء، خیر المجالس یا احسن الاقوال تاریخ کے طالب علم کو بہت سی مختصر مگر قیمتی معلومات بکھری ہوئی مل جاتی ہیں۔

تصوف اور مذہب کی کتابوں کے حوالے بھی ان ملفوظات میں کثرت سے آتے ہیں اور ان کا انداز بھی شک انگیز حد تک ماثل ہے۔ افضل الفوائد میں بھی چالیس کتابوں کے حوالے آئے ہیں۔ ان میں کچھ کتابیں اوراد و وظائف کے مجموعے ہیں، کچھ تصوف کے موضوع پر ہیں۔ تیسرے نمبر پر فقہ اور تفسیر کی کتابیں ہیں۔ جن میں تفسیر کشاف للزمخشری، تفسیر امام زاہدی، تفسیر امام ناصری اور تفسیر امام مجاہد کے علاوہ ایک نام تفسیر خواجہ شفیق بلخی بھی ملتا ہے

لہ دُرر نظامیہ (باب ۲۸) ص ۲۴۰ ۔ سیر الاولیاء / ۱۰۷ ۔ کہ افضل الفوائد (اردو ترجمہ): ۹ ۔ کہ دُرر نظامیہ (باب ۱۳) ۲۱۱-۲۱۰ ، گہ اخبار الاخیار: ص ۱۳۱

ھہ افضل الفوائد: ۸۸ ، ٦ہ فوائد الفواد: ۱۹۰

تی کی کتابوں میں ابو اللیث سمرقندی کے رسائل اس زمانے میں بہت مقبول تھے۔ ایک موقع پر صرف اس طرح حوالہ دیا ہے: خواجہ امام ابو اللیث سمرقندی کی کتاب میں دیکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنی معروف تصنیف تھی کہ اس کا نام لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ دوسری نفوی تب میں ہدایہ کے علاوہ صلوٰۃ مسعودی کا نام بھی صرف ایک مجلس میں آیا ہے۔ اس کے مصنف شیخ ابو عطا مسعود بن محمود بن یوسف سمرقندی ہیں۔ خواجہ حمید الدین ناگوری کی دو کتابوں کے نام آئے ہیں۔ ایک راحت الارواح دوسری لوائح۔ ایک اور تصنیف تحفۃ العارفین کا نام تین مجلسوں میں آیا ہے۔ اور ایک موقع پر اسے مولانا علاء الدین بدایونی کی تصنیف بتایا ہے۔ یہ بظاہر مولانا علاء الدین اصولی بدایونی ہو سکتے ہیں۔ جن سے حضرت نظام الدین اولیاء نے فقہ کی کتاب قدوری کا درس بھی لیا تھا۔ تذکرۃ الاولیاء نامی کتاب جس کا حوالہ دو بار آیا ہے۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار کی مشہور زمانہ تالیف ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا حوالہ حضرت نظام الدین کے دوسرے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد یا دُرر نظامیہ میں نہیں ملتا۔ اگرچہ بعض باتیں صریحاً اس سے ماخوذ ہیں یا دونوں کتابوں میں بڑی حد تک مشترک ہیں۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ افضل الفوائد کے نصفِ اول میں کتابوں کے حوالے زیادہ ہیں۔ اور آخری نصف حصے میں بہت کم ہو گئے ہیں۔ راحت المحبین جو اسی کا حصہ دوم ہے اس میں اور بھی کم ہیں۔

افضل الفوائد میں ۷۱۵ھ کی بیس مجلسیں قلم بند ہوئی ہیں۔ اور فوائد الفواد کی جلد چہارم میں اسی سنہ کی (۱۱) مجلسوں کے ملفوظات ہیں۔ دونوں کتابوں کے مشمولات اور مطالب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق نظر آئے گا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ امیر حسن دہلوی ایک ہی ماہ و سال میں جو ملفوظات قلمبند کر رہے ہیں دقیق مضامین اور بہترین علمی نکات ہوں اور اسی زمانے میں امیر خسرو جن ملفوظات کو لکھیں وہ معمولی مضامین اور قصص الانبیاء وغیرہ پر مشتمل ہوں؟

دوسرا پہلو ان کتابوں کے اسلوبِ نگارش کا ہے۔ امیر حسن دہلوی نے حتی الامکان وہی الفاظ قلم بند کئے ہیں جو حضرت نظام الدین اولیاء کی زبان مبارک سے سنے ہیں[1]۔ اس لحاظ سے فوائد الفواد نہ صرف اس دور کی معیاری فارسی گفتگو کا نمونہ ہے بلکہ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کا طرزِ کلام کیا تھا۔ اس کے برخلاف اگر امیر خسرو نے بطورِ خود یعنی اپنے الفاظ میں افضل الفوائد کے مطالب کو لکھا ہے تو اس کی فارسی امیر خسرو کے اسلوب اور مرتبۂ نگارش سے کمتر ہے۔ اور ان کی دوسری سب تصانیف سے مختلف بھی ہے۔ خزائن الفتوح میں تو وہ بہت ہی مرصع نگار بن گئے ہیں۔ لیکن اعجازِ خسروی کے رسائل میں انھوں نے فارسی نثر کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان میں سے کسی کا اسلوب بھی افضل الفوائد سے نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ امیر خسرو نے حسبِ منشاء وہی قلم بند کیا ہے جو مجلس میں سامعین ملفوظات کرتے ہیں تو افضل الفوائد کا اسلوب کو فوائد الفواد کے طرز سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہیے۔ جن لوگوں نے اس تالیف کے جعلی ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کی دلیلوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

افضل الفوائد اور راحت المحبین میں حضرت نظام الدین اولیاء یا آپ کے شیوخ یا معاصرین کے بارے میں کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں نہ ملتا ہو۔ یا اس میں زیادہ صحت، وضاحت یا جزئی تفصیلات کے ساتھ درج ہو۔ البتہ بہت سے مضامین وہ ہیں جو دوسری کتابوں میں بھی تقریباً اسی انداز سے بیان ہوئے ہیں۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔

افضل الفوائد میں ہے کہ ایک مرتبہ مولانا کیتھلی میرے پاس آئے۔ کھانا موجود تھا۔ بشر کو کہا کہ لاؤ۔ اس نے لانے میں دیر کر دی۔ میرے پاس ایک چھوٹی چھڑی تھی اس کی پیٹھ پر ماری۔ مولانا کیتھلی نے اس طرح آہ کی کہ گویا انھیں کی پیٹھ پر لگی ہے۔ میں نے پوچھا۔ آپ نے آہ کیوں بھری؟ فوراً پیٹھ سے کرتا اٹھا کر مجھے دکھایا۔ جب میں نے نگاہ کی تو دیکھا اس چھڑی کا اثر آپ کی پیٹھ پر موجود تھا[2]۔ یہ واقعہ سیر الاولیاء وغیرہ میں بھی بیان ہوا ہے۔

اسی طرح افضل الفوائد میں ہے: سلطان شمس الدین انار اللہ برھانہ کی یہ عادت تھی کہ آدھی رات کے وقت عبادت میں مشغول ہوتا۔ اور جب جاگتا تو خود پانی لے کر وضو کرتا۔ غلاموں میں سے کسی کو نہ جگاتا۔ جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ اپنی تکلیف دوسرے کو کیوں دوں کہ انھیں نیند سے جگاؤں[3]۔

فوائد الفواد میں یوں ہے: از عقیدۂ خوب او (التمش) حکایت فرمود کہ شبہا بیدار بودے و چوں از خواب بیدار شدے وضو ساختے دوگانہ گزاردے، و باز در خواب شدے و ہیچ کس را بیدار نکردے[4]۔

افضل الفوائد میں ہے کہ خواجہ بایزید بسطامی کا ایک ہمسایہ یہودی تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ تو اس نے کہا۔ اگر مسلمانی وہ ہے جو بایزید کو حاصل ہے تو مجھ سے ہو نہیں سکتی۔ اور اگر یہ ہے جو تمہیں حاصل ہے تو اس کے حاصل کرنے سے مجھے شرم آتی ہے[5]۔

فوائد الفواد کی ۴ رمضان ۷۱۰ھ کی مجلس میں ہے: حکایت فرمود کہ یہودے در جوار خانۂ بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ العزیز خانہ داشت۔ چون خواجہ بایزید نقل کرد آں یہود را گفتند کہ تو چرا مسلمان نمی شوی؟ یہود گفت چہ مسلمان شوم اگر اسلام آنست کہ بایزید داشت آن اسلام از من نیاید و اگر اینست کہ شما دارید مرا ازیں اسلام عار می آید[6]۔

ان دونوں کتابوں سے پہلے یہ واقعہ شیخ فرید الدین عطار کے تذکرۃ الاولیاء میں اس طرح آیا ہے: گبرے را گفتند کہ مسلمان شو۔ گفت اگر مسلمانی اینست کہ بایزید می کند من طاقت ندارم و نتوانم کرد، و اگر اینست کہ شما می کنید بدین ہیچ اعتبار ندارم[7]۔

ایک مجلس میں امیر حسن علا سجزی حاضر ہیں اور انھوں نے "رباعی" پڑھی ہے[8]۔ مگر وہ رباعی کے وزن میں نہیں ہے۔ امیر حسن یا امیر خسرو جیسے شاعروں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اوزانِ رباعی سے ناواقف ہوں گے۔

---

[1] امیر خورد کا بیان ہے کہ عین تقریر سلطان المشائخ بقدر امکان رعایت کرد (سیر الاولیاء / ۳۰۸) [2] افضل الفوائد: ۱۴، [3] افضل الفوائد: ۱۴، [4] فوائد الفواد: ۲۵۹، [5] افضل الفوائد: ۲۱
[6] فوائد الفواد: ۲۰۸، [7] تذکرۃ اولیاء: ۹۸ (مطبع محمدی لاہور، ۱۳۰۲ھ)، [8] افضل الفوائد: ۲۰

افضل الفوائد میں ایک موقع پر یہ شعر آیا ہے۔[1]

دار کی سرِ ما دگرنہ دور از برِ ما
ما دوست کشیم و تو نداری سرِ ما

یہی شعر فوائد الفواد میں بھی دو جگہ آیا ہے[2] مگر یہ ایک رباعی کے آخری دو مصرعوں میں پہلی بار شیخ فرید الدین عطار کے تذکرۃ اولیاء میں ہے۔[3]

خون ریز بود ہمیشہ در کشورِ ما
جان عود بود ہمیشہ در مجمرِ ما
داری سرِ ما دگرنہ دور از برِ ما
ما دوست کشیم و تو نداری سرِ ما

افضل الفوائد میں نظامی گنجوی کے یہ دو شعر حضرت نظام الدین اولیاء کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں[4]

چو مستِ عشق تش گشتہ فلک راخیمہ برہم زن
ستون عرش در جنباں طناب آسماں درکش
طر لقیش بے قدم می رو حدیثش بے زباں میگو
شرابش بے دہاں درکش

اور ۴ جمادی الثانیہ ۱۲، ھ کی مجلس میں جو فوائد الفواد میں ہے[5] آپ نے اس غزل کا صرف مقطع پڑھا ہے اور فرمایا کہ ایک دن حضرت بابا فریدؒ اسے تمام دن پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ افطار کا وقت آگیا۔

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر عیاں کردی
کسے سرّش نمی داند زبان درکش زباں درکش

پھر رات بھر اسی کو پڑھتے رہے حتیٰ کہ سحری کا وقت آگیا" یہی ملفوظ دُرَرِ نظامیہ میں بھی ملتا ہے[6]

افضل الفواد[7] میں حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کی آخری علالت اور وفات کا حال بھی ہے۔ اور وہ دوسرے تمام ماخذوں سے قدرے مختلف ہے۔

" فرمایا کہ خواجہ فرید قدس اللہ سرّہ العزیز نے پانچویں محرم کو انتقال فرمایا۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ جس رات انتقال ہونے والا تھا۔ مجھے یاد فرمایا کہ مولانا نظام الدین موجود نہیں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے خواجہ شیخ قطب الدین کے انتقال کے وقت موجود نہیں تھا۔ وہ بھی موجود نہیں (پھر فرمایا کہ جب آپ کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اور صبح سے دس بجے تک پانچ مرتبہ قرآن شریف پڑھا۔ پھر ذکر الٰہی میں ایسے مشغول ہوئے کہ آپ کے ہر بُنِ مو سے خون جاری ہوا۔ اور جو قطرہ خون کا زمین پر گرتا اس سے اللہ ہو کا نقش زمین پر بنتا) اور یہ رباعی پڑھ کر سجدہ کرتے اور پھر سر اٹھا لیتے:

بوے خوش تو ز ہر چمن می شنوم
شرح غم تو ز خویشتن می شنوم
گر ہیچ نباشد کہ کسے بہ نشانم
تا نام کوئی گوید و من می شنوم

جب ذکر سے فارغ ہوئے تو لوگ نزدیک آ بیٹھے۔ آپ نے انھیں فرمایا کہ باہر جا کر بیٹھو۔ جس وقت میں بلاؤں گا اندر آجانا۔ دیر بعد آواز آئی کہ اب دوست دوست سے ملے گا۔ وہ سب اندر آئے تو خواجہ صاحب کو کسی اور ہی عالم میں مشغول پایا۔ جب عشاء کا وقت قریب ہوا تو آپ نے چار مرتبہ عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر سجدے میں سر رکھ کر جان خدا کے حوالے کی۔ پھر یہ آواز آئی جیسے اجودھن کے سارے باشندوں نے سنا کہ روئے زمین پر امانت تھی سو خدا کے سپرد ہوئی"

اس بیان میں جس عبارت کو ہم نے قوسین میں بند کر دیا ہے مجھے اس کے الحاقی ہونے کا شبہ ہے کیونکہ ایسی مبالغہ آمیز باتیں حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنی مجلسوں میں بیان نہیں کیں جو دوسری جعلی ملفوظات کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

اسی طرح ایک مجلس میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو صحابی ظاہر کیا ہے حالانکہ وہ تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ داتا گنج بخش کی کشف المحجوب حضرت کے مطالعے میں رہتی تھی۔ اور فوائد الفواد میں اس کا حوالہ بھی آیا ہے۔ اس میں بھی خواجہ حسن بصریؒ تابعی کہا گیا ہے۔ مگر افضل الفوائد میں ہے۔

" بعد ازاں خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ کے برکت حاصل کرنے کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو زبان مبارک سے فرمایا کہ خواجہ صاحب ابھی بچے ہی تھے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے کوزے سے پانی پی لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کوزے سے کس نے پانی پیا؟ عرض کیا کہ حسن نے۔ فرمایا چونکہ اس نے کوزے سے پانی پی لیا ہے اس لئے علم اس میں اثر کرے گا"[8]

دوسرے موقع پر یہ بیان ہوا ہے کہ خواجہ حسن بصری کی والدہ حضرت ام سلمہ ام المؤمنین کی مولاۃ تھیں۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن حسن بصری کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں (غالباً ۲۱ھ یا ۲۲ھ) ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کے صحابی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ روایات میں یہ آیا ہے کہ جب آپ کا شیر خوارگی کا زمانہ تھا آپ کی والدہ حضرت ام سلمہ اپنا دودھ پلا دیا کرتی تھیں۔ اس کی برکت سے آپ کی حکمت و فصاحت کا یہ مرتبہ ہوا۔[9]

خواجہ حسن بصری کا نام فوائد الفواد میں صرف پانچ جگہ آیا ہے[10] مگر افضل الفوائد میں متعدد بار آپ کا تذکرہ ہوا ہے[11] اور اس میں بیشتر وہ روایات و حکایات ہیں جو شیخ فرید الدین عطار کے تذکرۃ الاولیاء میں بھی ملتی ہیں[12]

افضل الفوائد[13] میں ہے: "فرمایا کہ میں نے شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ

---

[1] افضل الفوائد: ۲۵، [2] فوائد الفواد ص ۴، ۵-۷، [3] تذکرۃ الاولیاء: ۶۰ [4] افضل الفوائد: ۹۹، [5] فوائد الفواد: ۱۷۴، [6] دُرَرِ نظامیہ (باب ۲) ص ۲۲۸-۲۳۹،
[7] افضل الفوائد: ۹۳، [8] افضل الفوائد: ۸۹ (یہی عبارت تذکرۃ الاولیاء / ۱۸ میں ملتی ہے) [9] طبقات ابن سعد جلد، ص ۱۵۱-۱۷۸ (طبع بیروت ۱۹۵۸) [10] فوائد الفواد، ص: ۱۱۹-۱۲۰-۱۳۸-۱۸۶-۲۶۲ [11] مثلاً صفحات: ۸۹ وغیرہ [12] تذکرۃ الاولیاء: ص ۱۲-۱۷ [13] افضل الفوائد: ۴۸

ہ زبان مبارک سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مغلوں نے نیشاپور پر حملہ کیا تو اس شہر کے خلیفہ نے کسی کو خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا کہ دعا کریں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا طلب دعا کا وقت گزر چکا ہے۔ اب تقدیر پر شاکر رہ کر بلائے الٰہی کے لئے مستعد رہو۔" یہ روایت بھی فوائد الفواد[1] میں ۱۰ ربیع الآخر ۷۰۸ھ کی مجلس میں بیان ہوئی ہے۔ "در ایّام خروجِ کفارِ تتار شد چون بلائے مغل بہ نیشاپور رسید بادشاہ سے کرآں بجا بود کس بر شیخ فرید الدین عطار فرستاد کہ دعائے بکن۔ اوجواب گفت کہ وقت دعا بگذشت وقت رضا است. یعنی بلائے خدا نازل شد تن برضا باید داد"

افضل الفوائد[2] کی مکرّر روایتوں میں سے ایک یہی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ایک بار حوض شمسی میں ہاتھ ڈال کر گرم گرم کاک (روٹیاں) نکال لی تھیں۔ اسی دن سے ان کا لقب "کاکی" ہو گیا۔ حالانکہ خود حضرت نظام الدین نے دوسرے مواقع پر کاکی کی وجہ تسمیہ کے لئے دوسری روایات بیان کی ہیں۔ اور اس روایت میں افضل الفوائد منفرد ہے۔

دوسری جلد کا نام راحت المحبّین ہے اور جیسا کہ ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے اس کتاب کا حوالہ شمائل الاتقیا میں متعدد بار آیا ہے۔ لیکن پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب میں افضل الفوائد یا راحت المحبّین کا قطعاً نام نہیں لیا۔ وحید مرزا نے افضل الفوائد پر ایک نوٹ لکھا ہے اور اس سے اخذ بھی کیا ہے۔ مگر ان کی کتاب میں راحت المحبّین کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے وجود سے بے خبر ہیں۔ اور جن قلمی نسخوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے ان میں راحت المحبین شامل نہیں رہی ہوگی۔ اس میں صرف سترہ (۱۷) مجلسوں کا حال ہے۔ جن میں سے پہلی مجلس کی تاریخ ۲۰ رجب ۱۹، ھ تائی لکھی ہے۔ اور آخری مجلس ۵ محرم ۲۱، ھ کی ہے۔ حاضرین محفل میں پندرہ (۱۵) حضرات کے نام آئے ہیں جن میں اکثر وہی ہیں جو افضل الفوائد کی مجلسوں میں بھی ملتے ہیں۔ امیر حسن علا سنجری کا نام صرف دو جگہ آیا ہے۔ مولانا جلال الدین، خواجہ قطب الدین ہانسوی شیخ عثمان سیاح اور شیخ حسین نبیرۂ خواجہ بختیار کاکی بھی حاضر محفل رہے ہیں۔

راحت المحبین میں کتابوں کے حوالے حیرت انگیز حد تک کم ہیں۔ پوری کتاب میں صرف سات حوالے آئے ہیں۔ آثار الاولیاء، ریاحین، قصص الانبیاء، حالات خواجہ جنید بغدادی، تنبیہ ابو اللیث سمرقندی، فتاویٰ اور اسرار الاولیاء۔ لیکن یہ آخری کتاب غالباً اس مجموعہ ملفوظات سے مختلف ہے جسے حضرت سید بدر الدین اسحاق دہلوی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ اور یہاں بھی نام "آثار الاولیاء" کا ہو۔ اس صورت میں کل حوالے صرف چھ ہی رہ جائیں گے۔

راحت المحبّین میں گیارہ مجلسیں تو صرف قصص الانبیاء ہی پر مشتمل ہیں۔ یہ زیادہ تر ان کتابوں کے مضامین ہیں جو حالات انبیاء میں لکھی گئی ہیں اور اسلام کے ابتدائی عہد ہی سے بہت مقبول رہی ہیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ خدا نے ہر قوم میں انبیاء کو مبعوث کیا تھا۔ لیکن صرف چند پیغمبروں کے نام قرآن میں ملتے ہیں۔ اور ان میں بھی صرف بعض کا نام ہی آیا ہے اور کوئی تفصیل نہیں ہے۔ لیکن جن نبیوں کا تذکرہ عہد نامہ قدیم میں موجود ہے ان کے حالات یہودی علماء نے قصص و اساطیر کی شکل میں جمع کر رکھے تھے۔ بعد کو مسلمانوں میں بھی وہی شائع ہو گئے اور ان کی نیم تاریخی حیثیت کے پیش نظر علماء اسلام نے انھیں "اسرائیلیات" کا نام دیا ہے۔ پہلے یہ قصے وعظ و تذکیر کی محفلوں میں بیان کئے جاتے تھے اور جب ہندوستان آیا تو ان پر مشتمل کتابیں بھی معرض وجود میں آ گئیں۔ راحت المحبین میں وہی سب مواد ہے۔ مگر اس کے وجود پر اس لئے حیرت ہے کہ جس محفل میں مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا فخر الدین زرّادی، مولانا وجیہہ الدین پائلی اور مولانا نصیر الدین محمود چراغ دہلی جیسے عالم فاضل موجود ہوں وہاں ان قصوں کے بیان کرنے کی افادیت کیا ہو سکتی ہے؟

یہاں میں نے دونوں کتابوں کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ جن دلائل کی بنیاد پر ان کتابوں کو جعلی سمجھا گیا ہے ان کے ساتھ ہی وہ پہلو بھی پیش کر دیئے ہیں، جن سے ان کا پایۂ استناد معتبر ہوتا ہے۔ لیکن جب تک دونوں کتابوں کے متعدد قلمی نسخے سامنے نہ ہوں۔ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں قطعاً جعلی سمجھا جائے یا امیر خسرو کی مستند تصانیف میں ان کا شمار کیا جائے۔ ایک دشواری یہ ہے کہ ان کا متن تحقیق کے ساتھ مرتب ہو کر ابھی تک نہیں چھپا ہے۔ اور جو تراجم شائع ہوئے ہیں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] فوائد الفواد: ۸۹ [2] افضل الفوائد: ۹۴ [3] راحت المحبّین (اردو ترجمہ): ۱۴۱، ۱۵۱

بشکریہ نیا دور

تختۂ ملکیت اوقاف سہ ماہی

مقام اشاعت	۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ
وقفۂ اشاعت	سہ ماہی
پرنٹر پبلشر ایڈیٹر	حکیم اجمل خاں۔ ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	پنجاب وقف بورڈ (اوقاف) انبالہ کینٹ

میں حکیم اجمل خاں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط
اجمل خاں

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

امیر خسرو کی وطن شیفتگی

امیر خسرو دنیا کے ان ارباب کمال میں تھے، جن کو عبقری کہا جاتا ہے، قدرت کاملہ نے ان کو عبقریت کے تمام لوازم و ادصاف سے نوازا۔ وہ ایک اچھے فرزند، ایک اچھے باپ اور ایک اچھے انسان تھے، شاہی دربار کے ایک بہت ہی محبوب ہم جلیس اور ندیم رہے، ایک عظیم قصیدہ گو، ایک عظیم مثنوی نگار، ایک عظیم غزل گو، ایک عظیم نثر نگار، ایک عظیم صوفی اور ایک عظیم ماہر فن موسیقی بھی تھے۔ جب ان کے والد بزرگ وار سیف الدین ایک لڑائی میں جاں بحق ہوئے تو ان کی موت کو شہادت سے تعبیر کیا اور اپنے رنج و غم کا اظہار یہ کہہ کر کیا۔

سیف از سرم برفت و دلم بس دو نیم ماند
دریائے من روان شد و درم یتیم ماند[1]

یعنی آنسو

اپنی ماں کا جب ذکر کرتے ہیں تو زیر قدم مادر بہشتی قدم سمجھتے ہیں[2]

ان کے ایک بیٹے محمد کی وفات ان کی زندگی میں ہو گئی تھی۔ اس کی یاد میں ایک بہت ہی پُر درد مرثیہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

یارب این شب چہ شب آمد کہ دل من گم شد
چشم تاریک مرا دیدۂ روشن گم شد[3]

انسان کی حیثیت سے ان کا مسلک یہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے میٹھی زبان سے پیش آئیں کہتے تھے۔

خسروا گرانگبیں می خواہی از شکر لباں
اول اندر کام شیریں کن زبان خویش را[4]

اپنی زبان کی شیرینی کی وجہ سے اپنے تمام معاصر سلاطین کے دربار کے یوسف بنے رہے، سلاطین خواہ مذہبی، یا سنگدل یا درشت مزاج یا رنگین طبع رہے، سب ان کو اپنا ندیم خاص بنانے میں مسرت محسوس کر کے اپنی زبان حال سے کہتے۔

یوسف عہدی اگر خسرو بروقیمت کرت
در دو ہم ملک دو عالم رایگاں بستانمت[5]

جب قصیدہ نگاری میں طبع آزمائی کرنے لگے تو انوری، خاقانی اور کمال اصفہانی کو یہ کہہ کر للکارا۔

تا کشد گردوں بہ چشم انوری
خاک من کحل سپاہانی شدہ است[6]

خاقانی ار ز خاک برآید بہ صد زمان
انصاف ایں قصیدہ عزہ بر اور شود[7]

مثنوی کہنے پر آئے تو قران السعدین میں لکھتے ہیں۔

اوج معانی نہ بمقدار طبع
بلکہ گزشتہ ز سماوات سبع[8]

اپنی مثنوی مجنوں و لیلیٰ میں کہتے ہیں۔

زندہ است بمعنی اوستادم
در نیست منش حیات دادم[9]

مطلع الانوار میں یہ بھی کہہ گئے ہیں۔

کو کبۂ خسروم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی افگند[10]

اور جب اپنی غزلوں کی نغمہ سرائیوں اور زمزمہ سنجیوں سے لوگوں کو محظوظ کرنے لگے تو

---

[1] غرۃ الکمال، دیباچہ، قلمی نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین [2] ایضاً [3] وسط الحیوٰۃ، علی گڑھ اڈیشن، ص ۷ [4] دیوان امیر خسرو دہلوی مرتبہ ڈاکٹر انصار الحسن ص ۹۵ [5] ایضاً ص ۱۲۹ [6] بزم صوفیہ از راقم مقالہ ص ۲۹۶ [7] ایضاً ص ۲۹۶ [8] قران السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ۹۵ [9] مجنوں و لیلیٰ علی گڑھ اڈیشن ص ۱۶۹ [10] شعر العجم جلد دوم ص ۱۴۵۔

بجا طور پر یہ دعویٰ کیا ۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی ریخت
شیرہ از خم خانہ مستی کہ در شیراز بود

اور جب ہندی شاعری کا شوق پیدا ہوا تو معلوم نہیں کتنے ہندی گیت دوہے، ٹھمریاں، چوپائیاں اور پہیلیاں لکھ کر فخر کے ساتھ یہ آواز بلند کی ۔

چو من طوطی ہندم راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم[1]

اور جب نثر لکھنے پر آمادہ ہوتے تو اعجاز خسروی کی پانچ جلدوں میں ایک ہزار ایک سو اناسی صفحے لکھ کر اپنی قوت تحریر کی صاحبقرانی دکھا دی اور جب تصوف کی راہ پر گامزن ہوتے تو جس عشق مجازی کا راگ اپنی غزلوں میں الاپنا شروع کیا تھا، وہ عشق الہی سے بدل گیا جس میں رفتہ رفتہ ایسی سوزش پیدا ہوئی کہ ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے: "روز حشر کے روز مجھ کو امید ہے کہ اس ترک بچہ کے سوز سینہ کی وجہ سے بخشائش ہو جائے گی ،"[2] اور بقول مولانا شبلی امیر کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے وہ اسی وادی ایمن کی شرر باریاں ہیں[3] اور جب فن موسیقی کی تحصیل میں مشغول ہوئے تو بقول محمد حسین آزاد ان کی طبیعت ایک بین ہو گئی تھی جو بن بجائے پڑی بجتی تھی[4]، پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ انھوں نے عام بول چال کی ہندی میں جو گیت لکھے وہ نہ صرف ان کی زندگی میں مقبول ہوتے بلکہ ایسی مثال نہیں ہے کہ جو گیت چھ سو برس پہلے لکھے گئے، وہ اب تک مقبول ہیں اور وہ کسی ترمیم کے بغیر اب تک عوام میں گائے جاتے ہیں[5]

ان تمام محاسن کے ساتھ ان کا نمایاں وصف یہ بھی رہا کہ جس طرح ان کو اپنے شاہی آقاؤں سے والہانہ لگاؤ رہا جس طرح ان کو اپنے فن شاعری سے وارفتگی رہی یا جس طرح ان کو اپنے مرشد سے عشق رہا اسی طرح ان کو اپنے وطن، اور اس کی ہر چیز سے شیفتگی، سرشاری اور سرمستی رہی ۔

دھلی کے فراق سے بے چینی

ان کی پیدائش پٹیالی ضلع ایٹہ (یوپی) میں ۱۲۵۲ء میں ہوئی، لیکن ان کی نشو و نما دہلی میں ان کے نانا عماد الملک کے یہاں ہوئی، جو سلطان شمس الدین التمش کے عہد سے بلبنی دور تک عارض ممالک کے عہدہ پر فائز تھے۔ نانا کی وفات کے بعد پہلے سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے کشلی خاں کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے، پھر بلبن کے لڑکے شہزادہ بغرا کے یہاں سامانہ چلے گئے، وہ ۱۲۸۰ء میں اپنے باپ کے ساتھ لکھنوتی گیا تو اس کی معیت میں خسرو بھی تھے، لکھنوتی پہونچے تو دہلی کو یاد کرکے تڑپنے لگے، ان کے دوستوں میں اس زمانہ کے مشہور شاعر شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے ان کی ہر قسم کی دل جوئی کی لیکن وہ وہاں نہ رکے، اور جب سلطان غیاث الدین بلبن کے ساتھ دہلی واپس ہوئے تو اپنے دیوان غرۃ الکمال، نوشتہ ۱۲۹۳ء کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ وہ لکھنوتی سے نکلے تو ان کو معلوم ہوا کہ گویا حضرت یوسف چاہ زندان سے نکل آئے ہیں، جب وہ دہلی پہونچے تو ان کو محسوس ہوا کہ حضرت یوسف مصر پہونچ گئے ہیں یہیں سے ان کی وطنی محبت پیدا ہوئی جو آگے برابر بڑھتی گئی ۔

لکھنوتی سے واپسی کے بعد سلطان غیاث الدین کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کے ندیم خاص ہو کر اس کے ساتھ ملتان چلے گئے، ان کے ساتھ ان کے محبوب دوست امیر حسن دہلوی بھی تھے، شہزادہ محمد سلطان کی صحبت میں ان کے شاعرانہ ذوق کی تشنگی بجھتی رہی، وہ ان کو اپنی عنایتوں سے نوازتا رہا، لیکن ان کو دہلی کی یاد برابر ستاتی رہی، اس کو وہ قبۃ الاسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کی سر بفلک عمارتوں، محل سراؤں، لالہ زاروں، باغوں کی خوشبوؤں اور یہاں کے حسینوں اور مہ پاروں کو یاد کرکے ملتان میں بے چین ہو جاتے، ملتان سے دہلی سال میں ایک بار آتے، اور جب یہاں سے رخصت ہو جاتے تو دہلی چھوڑتے وقت ان کو انتہائی شاق گذرتا ہے

بیرونی حملے پر اظہار تشویش

ملتان ہی کے قیام کے زمانے میں چنگیز خانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس موقع پر خسرو کی وطنی محبت میں وسعت پیدا ہوتی نظر آتی ہے : دہلی کے بجائے اب پورے ہندوستان کے جاں نثار فرزند بن کر ان بیرونی حملہ آوروں کے خلاف انھیں جذبات کا اظہار کرتے ہیں جو ایک محب وطن کو کرنا چاہئے، ہندوستان پر چنگیز خانیوں کے حملے کو آسمانی بلا اور سیل فتنہ قرار دیتے ہیں ۔

واقعہ است ایں یا بلا کز آسماں آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت کز جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را
رخنہ کامسال در ہندوستاں آمد پدید[6]

ہندوستانی فوج کی نبرد آزمائی پر اظہار مسرت

شروع میں ہندوستان کی فوج نے ان بیرونی دشمنوں کو پسپا کیا تو بہت خوش ہو کر لکھتے ہیں ۔

کہ ہندوستانی بہادروں کا دستہ باہر نکل کر ان دشمنوں کے خلاف کوہ قاف بن کر کھڑا ہو گیا ۔

رخش بیروں راند بر عزم مصاف
راست کردہ لشکرے چوں کوہ قاف
قاف تا قاف از الف بائے قلم
کردہ طغرائے شہنشاہی رقم[7]

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال قلمی نسخہ دار المصنفین [2] تذکرۃ دولت شاہ سمرقندی ص ۲۳۹ [3] شعر العجم جلد ۲ ص ۱۲۹ [4] آب حیات ص ۹۸
[5] ڈسکوری آف انڈیا ص ۵۸ ـ ۲۵۷
[6] دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو دہلوی از وحید مرزا ص ۵۱ [7] وسط الحیوٰۃ علی گڑھ اڈیشن، ص ۱۷۱ [8] ایضاً ص ۱۰۵ ـ

فخر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ان ہندوستانی سواروں کی تیزی اور حرکت سے شیر کے جسم پر بھی لرزہ طاری ہو گیا۔

جنبش تیزی سواران دلیر
لرزہ می افگند در اندام شیر

ہندوستان کی فوج کی تلواروں کو کافرسوز کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔

ہندوستان را کہ رسد از لشکر کافر زیان
از تیغ کافرسوز تا ہست آب اندر میان

تاتاریوں کے حملے روکنے کے لئے ہندو مسلمان جس طرح ایک ہو گئے، اس پر اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

بر دن شد دو دستے از سر ترک و ہندو
کہ ہندوستان با خراماں یکے شد

تاتاریوں نے پہلے حدود ملتان پر حملہ کیا، لیکن وہ بری طرح پسپا ہو کر ان کی طرف بھاگے، تو لکھتے ہیں کہ وہ الو کی نحوس صورت کے ساتھ کلنگوں کی طرح صف آرا ہوئے مگر بھاگے تو ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئے۔

گرچہ درساتے مغل با پَرِ بوم در روے شوم
صف کشیدہ چوں کلنگاں از خراساں می رسد
لیک در وقت گریز از بیم کشور گیر شاہ
ریزہ ریزہ می شود آنگہ بہ کہساں می رسد

ہندوستان کی طرف سے شہزادہ محمد سلطان نے ان تاتاریوں کو پہلے جس طرح پسپا کیا اس سے خوش ہو کر لکھتے ہیں کہ شہزادہ نے اپنی تلوار سے مور و ملخ کی چنگیز خانی فوج پر حملہ کیا وہ نہ صرف فرار ہوئے بلکہ پر دار چونٹیوں کی طرح ہلاک ہو گئے۔

دست او شمشیر براورنگ چنگیز خاں زند
چوں بہ عزم رزم سوئے لشکر کافر شود
گر پر ند ایشاں از لشکر ہائے پُر مور و ملخ
پاک نبود مور را در وقت مردن پر شود

ہندوستان کی فوج ان حملہ آوروں کے خلاف جس بہادری اور پامردی سے لڑی اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ان کے خنجروں نے بہادروں کے ناف کو پارہ کر کے رکھ دیا، ان کے گرزوں نے پہلوانوں کو پسپا کر کے رکھ دیا، وہ شیروں کی طرح ہر طرف بڑھے اور کشتوں کا ڈھیر لگا دیا، زمین سے خون کا دریا ابلنے لگا، دنیا سے روشنی جاتی رہی مغلوں کی طرف سے آہ و زاری بلند ہونے لگی اور قیامت کا سماں بندھ گیا۔

از ترنگ خنجر پہلو شگاف
پارہ می شد مرد را پہلوئے ناف
وز طراق گرزہ پولاد دست
پہلوئے ہر پہلوانے می شکست
کشتہ می شد چوں ز شیری آمدے
پشت پہلوئے زہر سش پہلوئے
سر کہ برید تیغ کینہ جو
مرگ بر آب رواں می باخت گو
بر زمیں از خوں شدہ دریا پدید
روشنی گشتہ ز عالم ناپدید
از مغل ہر سو فغاں برداشتہ
رستخیز از جہاں برخاستہ

ہندوستان کی فوج کی پسپائی پر اظہارِ غم

مگر ایسا موقع بھی آیا جب ہندوستان کی فوج ان چنگیز خانی وحشیوں سے پسپا ہو گئی شہزادہ محمد سلطان اس تصادم میں شہید ہوا، اس سے متاثر ہو کر ایک بہت ہی پر درد مرثیہ کہا جو سحر حلال کا درجہ رکھتا ہے اس پسپائی پر خود بھی خون کے آنسو بہائے اور جس طرح ہندوستان کے لوگ روتے ان کی بھی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی، دو چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

مہر و مہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند
روز و شب ہر سال آں اندک بقا بگریستند
آسماں ہا با ہزاراں دیدہ بر اہل زمیں
ہمچو باران بہاری بر کیا بگریستند
خلق ملتاں مرد و زن گریہ کناں و نوحہ کناں
کو بکوی و سو بسوی و جا بجا بگریستند

ملک اور تاج و تخت کے دشمنوں سے اظہارِ نفرت

بیرونی حملہ آوروں سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے خسرو میں بھی یہی نفرت چنگیز خانیوں کے خلاف پیدا ہوئی، ان کی بہت ہی بری تصویر یہ کھینچی ہے کہ ان کا سر گھٹا ہوا ہوتا جس پر الو کے پر ہوتے، ان کا سر انڈے کی طرح دکھائی دیتا، ان کا چہرہ چوڑا چکلا ڈھال کی طرح معلوم ہوتا، آنکھیں ماتھے میں گھسی ہوئی ہوتیں، ناک چپٹی ہوتی، جس سے ریزش برابر جاری رہتی، اور بہ پانی کے مینڈک کی طرح دکھائی دیتیں، وہ چوہے کھاتے کتے کی طرح کھانے کی چیزوں کی طرف دوڑتے میلے کچیلے بدبودار ہوتے، کوئی ان کے پاس بیٹھ جاتا، تو اس کو قے ہو جاتی، وغیرہ وغیرہ۔

اپنی مرنجان مرنج طبیعت اور انسان دوستی کے باوجود وہ ان لوگوں کا ذکر بہت ہی نفرت سے کرتے ہیں جو ملک یا تاج و تخت کے دشمن ہوتے مثلاً سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں بنگال میں طغرل نے بغاوت کی تو اس کے لئے خسرو نے بوم، شوم، سوائی بے دولت، اور نامبارک جیسے ناخوش گوار الفاظ لکھ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا، اور اس کی پسپائی پر خوش ہوئے اسی طرح ہندوستان کے اندر جو راجا شاہی تخت و تاج

ا۔ ایضاً ص ۹۲۰ ۲۔ ایضاً ص ۱۲ ۳۔ وسط الحیوۃ علی گڑھ ۱۳ فطین ص ۱۲ ۵۔ ایضاً ص ۱۰۸ ۶۔ ایضاً ص ۱۹۶ ۷۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں از راقم مقالہ ص ۸۔

کے مخالف ہوتے، ان کے لئے بھی سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے، جہائیں، گجرات، سمانہ اور رودنگل کے راجاؤں سے سلاطین دہلی کی جنگ ہوئی تو ان کے خلاف ایسے ایسے ناخوش گوار الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد آج کل گرانی ہوتی ہے لیکن جب یہی زیب تخت و تاج کے وفادار ہو جاتے تو پھر ان کی اور ان کے ہم مذہبوں کی مدح میں ان کا قلم طرب انگیز ہو جاتا۔ مثلاً ۱۳۱۱ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے ملک کافور کی نگرانی میں دھور سمندر میں ایک فوج بھیجی، تو دیوگیر کے راجہ رائے رایان رام دیو نے شاہی لشکر کی ہر قسم کی مدد کی، امیر خسرو نے اس کی تعریف اصیل و اصیل زادہ لکھ کر کی ہے، ان کے بیان کے مطابق جب شاہی لشکر دھور سمندر جاتے وقت دیوگیر سے گذرا تو رام دیو نے پورے اخلاص سے شہر کو فردوس کی طرح آراستہ کیا اور حکم دیا کہ لشکر کی ضروریات کی تمام چیزیں بازار میں موجود رہیں، اگر شاہی لشکریوں کے پہلوانوں کو اپنے تیروں کے لئے سیمرغ کے پروں کی ضرورت ہو تو بھی فراہم کئے جائیں، دیوگیر کا بازار بھی ارم کی طرح سجایا گیا، جب شاہی لشکر کے سوار اس میں سے گذرے تو ان کو معلوم ہو رہا تھا کہ بہشت شداد میں سے گذر رہے ہیں، بازار کا ہر حصہ نئے انداز سے آراستہ کیا گیا تھا، صراف سونے اور چاندی کے سکے لئے بیٹھے تھے، بزازوں نے ہندوستان اور خراسان کے عمدہ کپڑوں کی دکانیں لگا رکھی تھیں، پھلوں کا انبار لگا ہوا تھا، ان میں سے بعض تو انار اور آم سے زیادہ شیریں اور بہتر تھے، لشکریوں کے لئے اون، چمڑے، پیتل اور لوہے کی ساری چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو بھی چاہے، مناسب قیمت پر خریدے، عدل و انصاف ایسا تھا کہ

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے
نہ ہندو را مخالف بود رائے[1]

دھلی کی جدائی پر اظہارِ غم

امیر خسرو اپنے مربی شہزادہ محمد سلطان کی شہادت کے بعد ملتان سے دہلی آئے، تو بلبنی دربار کے ایک ممتاز امیر حاتم خاں جہاں کے ندیم ہو گئے، وہ ان کو شاہی لشکر کے ساتھ اودھ لے گیا تو دہلی چھوڑتے وقت وہ بہت روئے، اور راستہ بھر خون کے آنسو بہاتے رہے۔

برعزم سفر عنان کشادم
خونابہ ز دیدگاں کشادم
با لشکر شاہ کوچ بر کوچ
در گریہ ہمی شدم بہر کوچ[2]

اودھ کی تعریف لیکن دھلی کے لئے بے چینی

اودھ یعنی اجودھیا میں وہ دو سال میں رہے، یہاں ان کو ہر قسم کی راحت میسر تھی، حاتم خاں ان کو مال و دولت سے نوازتا رہا، ان کے اصلی وطن پٹیالی سے اودھ قریب تھا، اس لئے اجودھیا کی ہر چیز ان کو بھلی معلوم ہوئی، وہ ایک خط میں بہت ہی طرب انگیز طریقہ سے لکھتے ہیں کہ یہ سرزمین سبزہ زار، مرغزار، انگور، انار، نشتر، کیلے، مولسری، چمپا، جوہی، کیوڑا، صندل، عود، عنبر، مشک اور کافور سے بھری ہوئی ہے یہاں کے لوگ بھی ان کو خوش مزاج، خوش اطوار، خوش کردار اور فیاض معلوم ہوئے لیکن ان کا دل دہلی کے لئے تڑپتا رہا، دہلی سے دوری اور وہاں کے دوستوں کی جدائی سے ان پر جو گذر رہی تھی، اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

دل سوختہ چوں چراغ گشتہ
صد جائے درونہ داغ گشتہ
دردے و ہزار جاں سوز
آہے و ہزار تیر دل دوز
دل رفتہ و تن بخاک ماندہ
جاں بر شرف ہلاک ماندہ[3]

جب ان کو وہاں سے دہلی جانے کی اجازت ملی تو لکھتے ہیں ہمہ تن شوق بن کر دھلی کی طرف چل کھڑے ہوتے، ایک تیز پیکان کی طرح راستہ طے کیا، بلکہ تیر کی طرح اڑتے نظر آتے، ایک مہینہ کے سفر میں گھوڑے کی لگام کو برابر پکڑے رہے، ہلال عید کی طرح دہلی مسرور اور شاداں پہونچے، تو چمن کے گلاب کی طرح ہنس رہے تھے، دوستوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچی، ان کے دیدار کا جام پی کر سیراب ہوتے، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ خزاں دیدہ پرندہ اپنے باغ میں پہونچ گیا ہے، ایک پیاسا آب حیات کے چشمہ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ مر کر پھر زندہ ہو گئے ہیں، مہربان ماں کے قدموں سے آنکھیں ملیں، جدائی سے خستہ ماں نے بھی اشکبار آنکھوں میں ساتھ اپنے سینے سے لگایا، اس وطنی محبت کی کیفیت ذرا ان کے اپنے الفاظ میں بھی سنیے۔

قطع کناں راہ چوں پیکان تیز
بلک چو تیر آمدہ اندر گریز
یک مہ کامل بہ کشیدم عناں
راہ چنیں بود و کشش آں چناں
ہمچو مہ عید خوش و شادبہر
در مہ ذی القعدہ رسیدم بہ شہر
خندہ زناں ہمچو گل بوستاں
چشم کشادم برخ دوستاں
یافتم از لذت دیدار کام
وز مے مقصود شدم سیر جام
مرغ خزاں دیدہ بہ بستاں رسید
تشنہ بسر چشمۂ حیواں رسید
مردہ دل از حال پریشان خویش
زندہ شد از دیدن خویشان خویش

---

[1] خزائن الفتوح، علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۲۵ [2] دیباچہ قران السعدین ص ۱۰ [3] دیباچہ مثنوی قران السعدین ص ۱۱۔

دیدہ نہادم بہ ہزاران نیاز
بر قدم مادر الزم ساز
مادر من خستہ تیمار من
چون نظر افگند بدیدار من
پردہ ز روئے شفقت بر گرفت
اشک فشانان نیرم در گرفت[1]

دہلی کی تعریف

اودھ کے قیام کے زمانے میں خسرو نے بغرا خان اور سلطان معزالدین کیقباد کی ملاقات کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، باپ بیٹے کی شاہانہ ملاقات اودھ میں گھاگرا اور سرجو ندی کے بیچ میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کو خسرو نے کیقباد کی فرمائش پر قران السعدین میں قلم بند کر کے اپنی سخن وری اور سحر بیانی کا ثبوت دیا ہے، یہ مثنوی نظامی گنجوی کی مخزن الاسرار کے طرز پر خوب تر لکھی گئی، اپنی جدت ذہنی، واقعہ نگاری، وصف نگاری، تخیل آفرینی، لفظی صنعت گری اور تمثیل نگاری کے لحاظ سے یہ ادب العالیہ میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، اس سے اس عہد کی بہت سی تاریخی، تمدنی، ثقافتی اور عمرانی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ خسرو کو دہلی سے جو محبت رہی، اس کا اظہار کرنے میں ان کا قلم بہت ہی رقصاں ہو گیا ہے۔ حمد، نعت اور بادشاہ کی مدح کے بعد ہی دہلی کی تعریف شروع کر دی ہے، کہتے ہیں کہ اس کے دین و انصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، یہ عدن کی جنت ہے، اپنی صفات اور خصوصیات کے لحاظ سے باغ ارم ہے۔

حضرت دہلی کنف دین وداد
جنت عدن ست کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات
فرسہا اللہ عن الحادثات[2]

ایک راسخ مسلمان ہونے کے باوجود اس شہر کی محبت میں اس کو مکہ پر ترجیح دے دی ہے، اس کے لئے یہ شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ اس بوستان کا قصہ سن کر مکہ بھی ہندوستان کا طواف کرنے لگے، اس کی شہرت سن کر مکہ بہرہ ہو جائے، یہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے دنیا میں قبۂ اسلام بن گیا ہے، اسی سے ساتوں آسمان کا قبہ بندھا ہوا ہے۔

گر شنود قصہ این بوستان
مکہ شود طائف ہندوستان
شہر ہی رابہ سر او قسم
شہر خدا گشتہ زینتش اصم

قبۂ اسلام شدہ در جہان
بستہ او قبۂ ہفت آسمان[3]

خسرو کو دہلی پیاری تھی، اس لئے اس کی ہر چیز پیاری بن گئی ہے جس کی تعریف میں ان کا قلم بے قابو ہوتا گیا ہے، اس کے حصار کے متعلق لکھا۔

چرخ بہ زیر است و حصارش زبر[4]

اس کے قلعہ کو مینو سرشت بتایا، اس کے کنگرہ کے بارہ میں ان کے قلم سے یہ نکل آیا ہے

کنگرہ او گشتہ زبان حملۃ تن
وآمدہ با ماہ و سما در سخن[5]

اس کے در و دیوار کی تعریف میں یہ طرہ ہے کہ

چرخ نماند در و دیوار کس
تکیہ بدیوار و درش کردہ بس[6]

یکایک ان کا خیال دہلی کے گھروں کی طرف چلا گیا، تو کہہ اٹھے کہ اس کے ہر گھر کا گوشہ بہشت ہے، اس کی زینت و آرائش میں بے حد روپے خرچ کئے جاتے ہیں، ہر گھر میں عیش و نشاط ہے جہاں ایسی چہل پہل رہتی ہے کہ ایک آدمی کے گھر میں سینکڑوں آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

گوشہ ہر خانہ بہشتے شگرف
گشتہ بہ صفت زر بہ مرد صرف
مردم یک خانہ و صد خرمی
خانۂ یک مردم و صد مردمی[7]

یکایک ان کو اپنے شہر کی جامع مسجد کا خیال آیا ہوگا، تو پھر اس کی تعریف یہ کہہ کر کی کہ یہ فیض الٰہی کی جامع ہے، اور اس کے خطبہ کی آواز چاند تک پہونچتی ہے، اس کے گنبد میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔

مسجد او جامع فیض الہٰ
زمزمہ خطبۂ او تا بماہ
گنبد او سلسلہ پیوند راز
سلسلہ چون کعبہ شدہ حلقہ ساز[8]

یہ مثنوی لکھتے وقت ان کے خیال کی آنکھوں کے سامنے قطب مینار آ گیا ہوگا پھر تو اپنے پرواز خیال میں یہ خیال آفرینی کی ہے کہ اس مینارہ کو دیکھ کر چاند نے اپنی ٹوپی اتار پھینکی، بلکہ اس کو دیکھتے ہی سے اس کی ٹوپی گر گئی، چاند اس کو دیکھ کر رات سے صبح تک نہیں سوتا ہے۔

دیدن او را افگندہ ماہ
بلک فتادش کہ دیدن ماہ
ماہ نہ خسپد ہمہ شب تا سحر
کز سر تخش خلد دارد بہ بر[9]

---

[1] قران السعدین علی گڑھ ایڈیشن ص ۲۲۳ [2] ایضاً ص ۲۸ [3] ایضاً ص ۲۸ [4] ایضاً ص ۲۹ [5] ایضاً ص ۲۸ [6] ایضاً ص ۲۹ [7] ایضاً ص ۲۹ [8] ایضاً ص ۲۹ [9] قران السعدین علی گڑھ ایڈیشن ص ۳۰

کاں خلد برزبا کہ در ابر داد
بہ کہ زجاجست و دگر جاں فشاند[1]

اور جب ان کو اسی شہر میں وہ حوض یاد آیا جس کو سلطان شمس الدین التمش نے بنایا تھا تو جہاں اس کے مرغ و ماہی کی تعریف کی ہے وہاں اس کے صاف و شفاف پانی کے متعلق کہہ گئے کہ اس کا پانی خضر پی لیتے تو اپنے چشمہ کو بھول جاتے ۔

تا خضر آب خوشش او نوش کرد
آب خوش چشمہ فراموش کرد

ان کا قلم دہلی کی آب و ہوا کا ذکر کرنے پر آیا تو کہتے ہیں کہ اس ملک کا پانی اگر کوئی پی لے تو پھر خراسان کا پانی پینا نہ چاہتے، غایت محبت میں ہندوستان کے گرم ہوا کی یہ شاعرانہ تاویل کرتے ہیں کہ آفتاب کو یہاں سے عشق ہے، اس کے عشق کی گرمی کی وجہ سے یہاں کی ہوا گرم ہوگئی ہے، اور یہیں سے ساری دنیا میں گرم ہوا پھیل گئی ۔

ہر کہ دریں ملک دمے آب خورد
گشت دل از آب خراسانش سرد
مہر فلک گرم شد اندر وفاش
گرم ازاں گشت جہاں را ہواش[2]

دہلی کی آب و ہوا کی تعریف کرتے ہوتے لکھتے ہیں کہ یہاں کی خوش گوار نسیم کی وجہ سے اس کے چمن میں پھولوں کی بہار پورے سال رہتی ہے، اس کی سرزمین پھولوں کی وجہ سے سونے چاندی سے بھری معلوم ہوتی ہے، بہشت کی طرح یہاں سبزہ زار ہے، اچھی آب و ہوا ہی کے سبب یہاں ہندوستان اور خراسان کے میوے برابر ملتے ہیں، بعض میوے ایسے ہیں جو خراسان میں کسی نے نہ کھایا ہوگا ۔

گل ہمہ سالہ بہ چمن خوش نسیم
خاک زگلہا شد و پر زور و سیم
خط تر سبزہ بہ صحرا و کشت
نسخہ گرفتہ ز سواد بہشت
میوہ ز ہند و خراساں بسے
زانچہ نخوردہ بہ خراساں کسے[3]

ایک بار پھر دہلی کے لوگوں کی تعریف میں ان کا قلم نشاط انگیز ہو جاتا ہے، اور یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ اس شہر کے لوگ فرشتہ سیرت اور جنت والوں کی طرح خوش دل اور خوش خو ہوتے ہیں ۔

مردم او جملہ فرشتہ سیرت
خوش دل و خوش خوئے چو اہل بہشت[4]

اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگ صنعت، علم و ادب، آہنگ و ساز، نغمہ و سرود، نیزہ، پیکاں اور تیر کے ہنر میں بے نظیر ہیں ۔

ہر چہ ز صنعت بہمہ عالم ست
ہست در ایشان و زیادت ہم ست
بیشتر از علم و ادب بہرہ مند
و اہل سخن خود کہ شمار و کہ چند
چو ز سخن بگذری آہنگ و ساز
نغمہ مرغان بریشم نواز
و از ہنر نیزہ و پیکان و تیر
ہر کہ در آید بہ نظر بے نظیر[5]

پھر دہلی کے محبوبوں کی مدح کرنے لگتے ہیں تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے چہیتے مرید، ہم جلیس اور ہم راز بھی ہیں، بلکہ محض حسن و عشق کے کوچے کے رہ نورد ہیں، دہلی کے ایسے تباں سادہ نے ان کو اپنی طرف مائل کیا تھا جو بگڑی باندھتے، سر پر ٹیڑھی ٹوپی رکھتے، اپنے ناز و ادا کی وجہ سے کسی کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے، جہاں گلگشت کرتے، وہاں کی گلی ان چلتے پھرتے پھولوں سے معطر ہو جاتی، وہ راستہ چلتے تو عشاق ان کے پیچھے ہوتے جن کی آنکھوں سے خون جاری رہتا، یہ محبوب اپنے حسن کا غرور اپنے سر میں رکھتے لیکن ان کے عشاق کا دل ہوا میں برباد ہوتا دکھائی دیتا، مثنوی لکھتے لکھتے ان محبوبوں کا ذکر والہانہ اور مضطربانہ انداز میں ایک غزل لکھ کر کیا ہے ۔

اے دہلی و اے بتان سادہ
پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ
فرماں نبرند از انکہ ہستند
از غایت ناز خود مرادہ
جائے کہ برہ کنند گلگشت
در کوچہ دمد گل پیادہ
شان در رہ و عاشقاں دنبال
خوں ناب ز دیدہ ہا کشادہ
ایشاں ہمہ باد حسن در سر
و اینجا ہمہ دل بباد دادہ[6]

ان محبوبوں کا تعلق کس طبقہ سے تھا، اور ان کے پجاری کون تھے، وہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ۔

خورشید پرست شد مسلماں
زیں ہندوگان شوخ و سادہ[7]

اس شعر سے وہ باہمی موانست و یگانگت ظاہر ہے جس کی تلاش اس بیسویں صدی میں ہمارے وطن ہندوستان کو ہے مگر خسرو کے بیان کے مطابق ہندوستان کی تیرہویں صدی میں پیدا ہو چکی تھی، خود خسرو ان ہندو محبوبوں کی محبت میں جس طرح خراب

---

[1] ایضاً ص ۳۱ [2] ایضاً ص ۳۲ [3] ایضاً ص ۳۳ [4] ایضاً ص ۳۴ [5] ایضاً ص ۳۳ [6] ایضاً ص ۳۴ [7] ایضاً ص ۳۴ [8] قرآن السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ۳۶ [9] ایضاً ص ۳۷ ۔

اس کا اظہار اس طرح کیا ہے:

گر خانہ مرا خراب و درست
این مغ بچگان تاک زادہ
بوسہ ستان بوئے مرغول
خسرو چو شکیست در قلادہ[1]

خسرو کی جو مذہبی اور پاکباز زندگی رہی اس سے کبھی یہ یقین نہیں کیا جا سکتا ہے وہ شراب پلانے والے نوجوانوں کے عشق میں خراب و درست اور پیچ دار زلف رکھنے والوں کے پیچھے پٹے دار کتے بنے رہے، یہ ان کی ایک غزل کے اشعار ہیں جو قران السعدین کی مثنوی میں نغمہ ترنم اور موسیقیت پیدا کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن اس متغزلانہ رنگ میں وہ اس انس و محبت کا اظہار کر گئے ہیں جو وہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ رکھتے تھے، یہی ان کی طرف سے ہندوستان کے لئے پیام بن سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی رواداری اور فراخ دلی میں ہندوؤں کے لئے کیا ہو سکتا ہے۔

خسرو دہلی کے مغ بچگان تاک زادہ کے لئے خراب و درست ہو سکتے تھے، تو پھر دہلی کے شاہی محلوں کے لئے ان کے محبت کیش جذبات کیوں نہیں پیدا ہوتے، ان کے عہد میں کیلوکھری میں ایک محل قصر نو کے نام سے تعمیر ہوا، اس کی مدح میں بکثرت اشعار کہے گئے ہیں، ایک شعر میں کہتے ہیں کہ یہ محل کیا ہے کوہ ہے، ایک بہشت ہے جس کے دروازے پر طوبیٰ کی شاخ چھائی ہوئی ہے۔

قصر نگویم کہ بہشتے فراخ
روضۂ طوبیٰ در او را بہ شاخ[2]

ایک دوسرے شعر میں اپنے پرواز تخیل کے ساتھ رقم طراز ہیں کہ اس کے سفید کوٹھے کی بلندی آفتاب کے لئے سفید ابر بن گئی ہے۔

بام سفیدش بہ فلک سودہ سر
کرد بخورشید سفیدے اثر[3]

اس محل کے نیچے جمنا بہتی تھی، ایک شاعر ہی یہ دل نواز نکتہ پیدا کر سکتا ہے کہ اس کا بہتا پانی محل جیسے عروس کے لئے آئینہ کا کام دیتا ہے۔

طرفہ عروسے شدہ آراستہ
آئینہ از آب رواں خواستہ[4]

دربار میں جشن نوروز میں جو چہل پہل ہوتی تھی، یا اس موقع پر چتر سیاہ، چتر سفید، چتر سرخ، چتر سبز، چتر گل، رایت لعل و سیاہ، گلستان سیم و زر، نخل موم اور دستہ گل دل فریب سے دربار کی جو زینت و آرائش کی جاتی تھی، اس کی مصوری اس مثنوی میں خسرو نے اپنا شاعرانہ آرٹ دکھا کر جو یہ کہا ہے کہ۔

قصر ہمایوں ز زمیں تا سماک
زیور زر بستہ چو فردوس پاک[5]

اس سے ان کے ان اندرونی جذبات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے وطن کے دربار کی زینت و آرائش کا مقابلہ ایران، توران اور خراسان وغیرہ کے درباروں سے نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا موازنہ صرف فردوس پاک سے ہو سکتا ہے۔

قران السعدین میں موضوع کی بڑی رنگا رنگی ہے، اس میں خسرو کا قلم مختلف سمتوں میں چلتا رہا، جہاں ان کو موقع ملا، دہلی یا دہلی کی کسی چیز کی تعریف کرنے لگے ہیں، کسی نہ کسی صورت سے ہندوستان کے خربزے کا ذکر لے آتے ہیں، یہ ان کے وطن کا پھل تھا، اس لئے دل کھول کر اس کی یہ تعریف کی کہ یہ بہشت کے تمام پھلوں سے بازی لے گیا ہے، اس میں قند کی ایسی مٹھاس ہے، اور آب حیات کی ایسی تاثیر ہے۔

خربزہ گوئی کہ بہ صحرا کشت
گوئے ربود از ثمرات بہشت
از مزہ گرد آمد وردے نبات
خام خضر پختہ چو آب حیات[6]

بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات کے وقت دونوں میں بڑے قیمتی تحائف کا تبادلہ ہوا، جن میں عود، مشک، عنبر، کافور، زر و جواہرات، موتی، یاقوت، گھوڑے، اونٹ، اسلحہ، حطائی، غلام اور حریر و پرنیان وغیرہ سب کچھ تھے، مگر خسرو کی نظر ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے کی طرف اٹھی، جس کو وہ جامۂ ہندی کہتے ہیں، اس کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ یہ اتنا باریک تھا کہ پہننے پر جسم نظر آتا تھا، بعض کپڑے ایسے بھی تھے کہ ان کو لپیٹو تو انگلیوں کے ناخن میں آ جائیں، اور کھولو تو دنیا کو ڈھانک لیں۔

جامۂ ہندی کہ ندانند نام
کز تنکی تن بہ نماید تمام
ماندہ بہ پیچیدہ بہ ناخن نہاں
باز کشائش بہ پوشد جہاں[7]

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی جو شاہانہ دعوتیں کیں، ان کی تفصیل بھی خسرو نے بڑے طمطراق سے بیان کی ہے، دسترخوان پر ایک ہزار سے زیادہ قسموں کی نعمتیں ہوتیں، ان کو مزے لے لے کر بیان کرنے میں خسرو کا وطنی جذبہ ابھرا ہے کہ اور ملکوں میں اتنی نعمتیں میسر نہیں، ان دعوتوں میں پان بھی تقسیم ہوا، یہ خسرو کے وطن کی خاص چیز تھی، اس لئے اس کی تعریف میں ان کا قلم چلا تو مشکل سے رکا، جہاں اس کی بہت کچھ مدح سرائی کی ہے وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی یہ بین نعمت ہے، یہ دیکھنے میں تو ایک گھاس ہے لیکن اس سے خون پیدا ہوتا ہے، یہ منہ کی بدبو کو دور کرتا ہے، کمزور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے، سیر ہو کر کھانے والوں کی بھوک بڑھاتا ہے اور بھوکوں کی بھوک میں کمی کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ[8]

ہندوستان کے ارباب علم کی تعریف

امیر خسرو کے سن کی پختگی کے ساتھ ان کی وطنیت اور بھی راسخ ہوتی گئی، وہ جب چالیس سال کے تھے تو اپنے کلام کا تیسرا مجموعہ ۱۲۹۳ء میں غرۃ الکمال کے نام سے مرتب کیا اس کا ایک طویل دیباچہ نثر میں لکھا ہے جس میں اور بہت سی باتیں لکھنے کے ساتھ

---

[1] ایضاً ص ۳۰ [2] ایضاً ص ۴۸ [3] ایضاً ص ۴۸ [4] ایضاً ص ۵۵ [5] ایضاً ص ۸۲ [6] قران السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ۱۰۹ [7] ایضاً ص ۱۲۲ [8] ایضاً ص ۸۶۔۱۸۵۔

ہندوستان کے فصحاء کا موازنہ ایران اور دوسرے ملکوں سے کیا ہے۔ ایران والے ہندوستانی کے فارسی بولنے والوں کو ہمیشہ نیچی نظر سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں، ان کو اپنی سبک ایرانی پر بڑا غرور ہے، خسرو نے بھی اپنے زمانہ میں اس کو محسوس کیا، ان کی وطن پرستی جوش میں آئی تو غرۃ الکمال میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً دہلی کے اہل علم دنیا کے تمام ارباب علم سے بہتر ہیں، کہتے ہیں۔

"ہندوستان خصوصاً حضرت دہلی کہ مسکنہ سکینۂ دہلی اند بہ طبع از نیکو خیان
ہمہ عالم غالب اند"

اس کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے دلائل دیئے ہیں، لکھتے ہیں کہ خراسان عراق، شیراز، بغداد اور ترکی کے لوگ یہاں آتے ہیں تو مجلسوں میں بہت کچھ بولتے اور چھا جاتے ہیں مگر اپنی زبان ہی میں بولتے اور شعر کہتے ہیں، ہندوستان کی زبان بولنے میں تو ان کو لکنت آجاتی ہے لیکن ہندوستان خصوصاً دہلی کے لوگ باہر جاتے ہیں تو وہیں کی زبان بولتے اور رہتے ہیں، اسی بین نظر و نثر بھی لکھنے لگتے ہیں، یہاں کے جو اہل علم عرب نہیں گئے، وہ بھی عربی میں ایسے اشعار کہہ سکتے ہیں کہ ان کی فصاحت و بلاغت سے عرب کے لوگ بھی مرعوب ہو جاتے ہیں، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بہت سے تازیک اور ترک ایسے ہیں جنہوں نے ہندوستان ہی میں ترکی زبان کی تعلیم پائی، لیکن وہ یہ زبان اس طرح بولتے ہیں کہ باہر کے فصحاء ان کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔

"چندیں تازیک و نہ ترک دیدم کہ زبان ترکی در ہندوستان بتعلیم و
کسب بیاموختند، چناں گفتند کہ فصحا آں طائفہ کہ از بالا بیایند فرد ماندند"

وہ تو ایران کی فصاحت سے بھی زیادہ متاثر نہیں تھے، لکھتے ہیں کہ ماوراءالنہر کی فارسی میں تو فصاحت پائی جاتی ہے لیکن ایران میں اس کی وہی حیثیت ہے جو ہندوستان میں ہے، خراسان اور خراسانیوں پر ہمیشہ قلمی ضرب لگانے کے لئے تیار رہتے، بڑی تحقیر کے ساتھ لکھتے ہیں وہ تو صحیح تلفظ بھی نہیں کر سکتے، کجا کو کجو اور چہ کو چی بولتے ہیں پھر بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی سندھ سے جنوب کے سمندری ساحل تک ایک طرح بولی جاتی ہے۔

"گفتار پارسی در ہندوستان از لب آب سندھ تا دامنہ دریائے
محیط یک زبان است"

اور پھر اسی فارسی پر ناز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ہندوستان کی فارسی شاعری میں ایسی وسعت ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین کا اظہار ہو سکتا ہے۔

آں را کہ زباں چنیں دراز است
شاید کہ سخن فراخ گوید

ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں اصل فارسی یعنی دری بولی جاتی تھی، ہندی تو یہاں ہر فرسنگ پر مختلف ہو جاتی لیکن یہاں کی فارسی ایک ہی طرح بولی جاتی، اور جس طرح بولی جاتی اسی طرح لکھی بھی جاتی۔

"پارسی است کہ او ای زبان بالنقش کتابت موافق و مطابق است"

آذربائجان اور سیستان کے لوگوں کے فارسی تلفظ کا تو یہ لکھ کر تمسخر کیا کہ ردہ کہتے وقت ان کی زبان سے کردہ کن نکلے گا، اسی طرح سیستان کے لوگوں کا یہ لکھ کر مذاق اڑایا کہ وہ افعال میں ہیں (یا سین) خواہ مخواہ بڑھا دیتے ہیں، وہ کردہ ہیں (سین) اور گفتہ ہیں (سین) بولیں گے، خسرو کا دعویٰ تھا کہ دہلی کے علماء فضلاء اور فصحاء یہاں آئے تو دہلی کے لوگ ان ہی کی طرح بول کر ان پر ہنستے ہیں، اور وہ لوگ دہلی کی زبان کو زرم لطیف درست اور فصیح پاتے ہیں[1]

معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی ملک کے لوگوں نے ہندوستان کے باشندوں کے سیاہ رنگ پر خسرو کے سامنے طنز کیا تھا، وہ اس طنز سے بے چین ہو گئے، اس کا جواب شاعرانہ انداز میں یہ کہہ کر دیا کہ اس رنگ کی ظلمت (تاریکی) کے اندر آب حیات کی تاثیر ہے، اس کی سیاہی اس کے لئے کوئی عیب نہیں، کیوں کہ یہ سواد اعظم ہے، اس کے سامنے ساری دنیا سیاہ ہو کر رہ گئی ہے۔

ہند را اے مدعی طعنی بہ تاریکی مزن
زانکہ اندر ظلمتا اد آب حیوان مدغم ست
گر کسے گوید سیہ ہندوستاں را عیب نیست
جملہ عالم رو سیاہ شد و ایں سواد اعظم ست[2]

قلعہ جھائین کی تعریف

اسی غرۃ الکمال کے مجموعہ میں ایک مثنوی مفتاح الفتوح بھی ہے، جس میں سلطان جلال الدین خلجی کی معرکہ آرائیوں کا ذکر ہے، وہ جب قلعہ جھائین (نزد رنتھنبور) کی تسخیر کے لئے گیا تو جب تک جنگ رہی امیر خسرو اپنے شاہی آقا کے دشمنوں کے لئے سخت الفاظ استعمال کرتے رہے، لیکن جب جھائین دہلی کی سلطنت کا حصہ ہو گیا تو پھر اس کے قلعہ کی تعریف میں بہت ہی تر زبان ہو گئے، ان کی اس تعریف میں ہندوؤں کے طرز تعمیر کے فن کو بھی خراج تحسین ادا کیا ہے، لکھتے ہیں کہ یہ آسمان کی طرح بلند تھا، سنگ خارا سے منقش تھا، ہندوؤں کی بہشت معلوم ہوتا تھا، اس کے نقش و نگار بہت ہی دل فریب تھے، انی کی تصویریں بھی اس کے سامنے مات تھیں پتھر کی ایسی سینکڑوں مورتیاں دیکھنے میں آئیں جو موم سے بھی نہیں بنائی جا سکتی تھیں۔ دیوار کی گچ آئینہ کی طرح صاف شفاف تھی، اس کی کہگل گھسے ہوئے صندل سے کی گئی تھی۔ اس کی لکڑیاں خالص عود کی تھیں، اس کے باغ میں بہت سے بت خانے تھے، جن پر سونے چاندی کی نقش آرائی تھی، شاعرانہ انداز میں یہ بھی کہہ گئے۔

گر آں فرہاد را دل گذشتی
دلش را قصر شیریں تلخ گشتی[3]

سنسکرت زبان کی قدردانی

ان کی حب الوطنی کے جذبات مثنوی دول رانی خضر خاں لکھتے وقت بھی ابھی

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال قلمی نسخہ دارالمصنفین [2] ایضاً [3] نیز دیکھو مفتاح الفتوح مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین لاہور ص ۳۶-۳۵

طرح ابھرے ہیں، جو انھوں نے اپنی عمر کے ۶۵ ویں سال یعنی ۷۱۵ھ میں لکھی، اس میں علاء الدین خلجی کے لڑکے خضر خاں اور گجرات کے راجہ کرن سنگھ کی لڑکی دول رانی کے عشق و محبت کی داستان لکھنے بیٹھے تھے، مگر جابجا وطنی محبت میں سرشار ہو کر ہندوستان کی مختلف چیزوں پر گل فشانی کرتے چلے ہیں، سنسکرت کی تعریف کرنی چاہتے تھے، اس لئے اس کا ذکر اس مثنوی میں لے آتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ فارسی زبان سے کم نہیں ہے۔

غلط کردم اگر از دانش زنی دم
نہ لفظ ہندیست از پارسی کم[1]

اس زبان کو عربی کے علاوہ جو تمام زبانوں پر فضیلت رکھتی ہے اور تمام زبانوں پر فوقیت حاصل ہے۔

بجز تازی کہ میر ہر زبانست
کہ بر جملہ زبانہا سامرانست

اس کی خوبی یہ بھی بتائی کہ عربی زبان کی طرح اس میں کسی اور زبان کی آمیزش نہیں، سنسکرت کے صرف و نحو کو عربی ہی کی طرح بتاتے ہیں۔

گر آئین عرب نحو است و گر صرف
ازاں آئین درین کم نیست یک حرف[2]

سنسکرت کے معانی و بیان کو دوسری زبان سے کم نہیں سمجھتے رہے،

دگر پرسی بیانش از معانی
دراں نیز از دگر ہا کم ندانی[3]

جامۂ ہندی کی تعریف

ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں میں ایک کپڑا دیوگیری کا ذکر آگیا ہے، یہ خسرو کو بہت پسند آگیا تھا، اس لئے کہتے ہیں کہ پری وش محبوب اس کو بہت پسند کرتے ہیں، یہ کتان سے بھی بہتر ہوتا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ چمک میں آفتاب معلوم ہوتا ہے، ٹھنڈک میں ماہتاب دکھائی دیتا ہے، اور پھر اس پر سایہ بھی چھایا نظر آتا ہے۔

نکو داننده خوبان پری کیش
کہ لطف دیوگیری از کتاں بیش
ز لطف آں جامہ گوئی آفتابے است
و با خود سایۂ یا ماہتابے است[4]

آم کی تعریف

ہندوستان کے قومی پھل آم کا بھی ذکر لے آتے ہیں، شاید کسی نے ان کے سامنے کہہ دیا ہوگا کہ انجیر آم سے بہتر ہوتا ہے، اس زمانہ میں کوئی اچھے قسم کی انجیر باہر سے آتی ہو، جسے ان کی وطنی محبت یہ گوارا نہیں کر سکی کہ ہندوستان کے اس بہترین قومی پھل کو کسی اور پھل سے بہتر قرار دیا جائے، اس لئے جھلا کر کہتے ہیں کہ جو لوگ انجیر کو ہمارے آم پر ترجیح دیتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اندھی عورت بصرہ کو شام سے بہتر بتائے۔

زہے انصاف نتواں یافت ایں کام
کہ عمیا بصرہ را گوید از شام
بگرس بوئے خود گرد و جہت گیر
نہد کم نغزک مار از انجیر[5]

ہندوستان کے پھولوں کی تعریف

خسرو کا ایک بے مثل شاعر ہونے کی حیثیت سے پھولوں کی رنگینیوں سے متاثر ہونا ضروری تھا مگر ان کے ان تاثرات میں جمالیاتی ذوق سے زیادہ وطنی محبت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے، وہ پھولوں میں سوسن، بنفشہ، کیوڑہ، بیلا، گل زریں، گل سرخ، ریحان، گل کوزہ، گل لالہ، گل سفید، سپرغم، صد برگ، نسترن، یاسمین، دونا، کرنا، نیلوفر، ڈھاک، چمپا، جوہی، کیوڑہ، سیوتی، گلاب، اور مولسری وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں، ان پھولوں کی تعریف تو سب ہی شاعر کرتے آئے ہیں، لیکن خسرو نے ان پھولوں کی جو تعریف کی ہے، اس میں اپنے وطنی جذبات سے جس طرح مسرور اور مغلوب نظر آتے ہیں، وہ زیادہ لائق توجہ اور قابل قدر ہے، پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان پھولوں میں صرف بنفشہ، یاسمن، اور نسترن ایران سے ہندوستان لائے گئے، ورنہ اور تمام پھول ان ہی کے وطن کی خاص پیداوار ہیں، پھر تو ان کے اشعار میں شعریت اور ادبیت کی مے دو آتشہ سا نشہ چھایا نظر آتا ہے، ان کی تعریف بہت ہی دلبرانہ اور دل ربایانہ انداز میں کرتے ہیں مثلاً گل کوزہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں پانی کی سی لطافت ہے لیکن خود پانی نے اپنی لطافت اس پھول سے دریوزہ گری کی ہے۔

گل کوزہ کہ دور چرخ گرداں
پدید از خاکِ پاک ہند کرد آں
تری آب را در کوزہ کردہ
لطافت آب از و دریوزہ کردہ[6]

بیلا کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے ایک پھول میں سات پھول ہوتے ہیں، اس کی خوشبو میں دل ربائی ہے، اس لئے عاشقوں کے دلوں میں جگہ پاتی ہے۔

ازیں سو بیل پیشانی کشادہ
بہ یک گل ہفت گل برہم نہادہ
وزاں سو دلربائے عاشقاں جائے
ہمہ تن بہر دلہا راشدہ جائے[7]

کیوڑہ کے بارہ میں رقم طراز ہیں کہ اس سے معشوقوں کی پوشاک باسی جاتی ہے دو برس کے بعد بھی اس کی خوشبو ایسی ہی باقی رہتی ہے، کپڑا اپھٹ بھی جاتے تو اس کی

---

[1] دول رانی خضر خاں، علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۴۱ [2] ایضاً ص ۴۲ [3] ایضاً ص ۴۲ [4] ایضاً ص ۴۳ [5] ایضاً ص ۴۳ [6] ایضاً ص ۴۳ [7] ایضاً ص ۴۳۔ [8] دول رانی خضر خاں علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۲۸ [9] ایضاً ص ۱۲۹ [10] ایضاً ص ۱۳۰۔

بو نہیں جاتی ۔

زبویش حانہ خوبان معطر
دوساد خشک وبویش زرفتہ[۱]

رائے چمپا کو پھولوں کا بادشاہ قرار دیا ہے، کہتے ہیں کہ اس کی خوشبو ایسی ہے جیسے شراب میں کسی نے مشک ملا دیا ہے چنبیلی جیسے بدن والے معشوق کی طرح ناک تا ہے، اس میں زردی عاشقوں کے چہرے کی طرح ہوتی ہے ۔

دگر آں رائے چنپہ شاہ گلہا
کہ بویش مشک بار آمد چو لہا[۲]
چو معشوق سمن بر تا رپرورد
ولے رنگش چو روئے عاشقان زرد

مولسری کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی طرف تمام لوگوں کا دل مائل ہے اس کے پھول معشوقوں کی گردن کے حمائل ہیں ۔

بہ بویش بسکہ دلہا گشتہ مائل
شدہ درگردن خوبان حمائل[۳]

سیوتی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بھونرا اس کے لئے جان دیتی ہے، مرنے کے بعد بھی اس سے لپٹی رہتی ہے، معشوق عاشق کی طرح اس کے لئے سرگرداں رہتی ہے، یہ پھولوں کے معشوقوں کا معشوق ہے ۔

زعشق بوئے او جاں دادہ زنبور
نگشتہ بعد مردن نیز ازو دور
ہمہ خوبانش عاشق دار جویاں
کہ معشوقیست نزد خوبرویاں[۴]

اسی طرح اور دوسرے پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ب یہ پھول کھلتے ہیں اور کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں یا ان گھٹاؤں میں سے جب ترشح تا ہے تو ان پھولوں کا باغ فردوس کا باغ معلوم ہوتا ہے، بلکہ فردوس میں بھی ایسا خوشگوار نہ ہوتا ہوگا، آخر میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے ایسے پھول اگر روم و شام میں ہوتے تو ہاں کے لوگ ان کی تعریف دنیا میں کرتے پھرتے[۵] ۔

ہندوستان کے حسن کی تعریف

امیر خسرو کو جس طرح ہندوستان کے پھول دوسرے ملکوں کے پھولوں سے بہتر نظر ئے اسی طرح ان کی نظر میں ہندوستان کے مقابلہ میں کسی اور جگہ کا حسن بالکل نہیں جچا وں نے تمام بین الاقوامی حسن کر ان میں کچھ نہ کچھ نقص نکال کر رد کر دیا تھا، اس زمانہ ں ان کی نظر میں مصر، روس، تاتار، قندھار، سمرقند، ختن، خلخ اور یغما کے حسن پر پڑی ہیں، ان میں روایتی طور پر خلخ اور یغما کا حسن زیادہ مشہور تھا، مگر خسرو کو ان جگہوں کا ی حسن پسند نہ آیا کیوں کہ ان کے قول کے مطابق ان کے حسین تیز چشم اور ترش رخ ہوتے، خراسان کا حسن بھی مشہور تھا کیوں کہ ان کے چہرے پر سرخی اور سپیدی ہوتی ہوتی، مگر خسرو کو ہندوستان کے مقابلہ میں خراسان کی ہر چیز ناپسند تھی، اس لئے ان کے سرخ اور سپید رنگ کے حسینوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ ان کے جیسے پھول ہوتے ہیں ویسے حسین بھی ہوا کرتے ہیں، یعنی رنگ ہے لیکن خوشبو یعنی دل آویزی نہیں، ان کو روم و روس کا حسن بھی پسند نہیں تھا کیوں کہ ان کے معیار کے مطابق ان میں عجز و انکسار نہیں ہوتا، پھر ان کے خیال کے مطابق یہاں کے حسین برف کی طرح سرد ہوتے، ان کی آنکھیں چھوٹی اور ناکیں پست ہوتیں وہ تاتاری حسینوں کو ناپسند کرتے کیوں کہ ان کے لبوں پر ہنسی نہیں دکھائی دیتی، وہ ختن کے حسینوں کو بھی لائق توجہ اس لئے نہیں قرار دیتے کہ ان کے چہرے پر نمک نہیں ہوتا، سمرقند اور بخارا کے حسن میں ان کو شیرینی محسوس نہیں ہوتی، اس طرح مصر اور روم کے سیمیں بدن حسینوں میں چستی و چالاکی نہیں پاتے جو چیزیں ان بیرونی ممالک کے حسینوں میں نہیں پائی جاتیں، وہ خسرو کو ہندوستان کے حسن میں دکھائی دیتیں، یعنی عجز و انکسار بھی، لبوں پر تبسم بھی، چہرے پر نمک بھی، شیرینی بھی، اداؤں میں چستی اور چالاکی بھی، اس لئے بے اختیار ہو کر لکھ گئے ہیں ۔

بتان ہند را نسبت ہمیں ست
بہر یک موئے شان صد ملک چین ست[۶]

یہ سب کچھ لکھنے کو تو خسرو لکھ گئے لیکن ہندوستان کے حسینوں میں ہر قسم کا رنگ پایا جاتا ہے، اس کی شاعرانہ تاویل بھی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے، لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے حسینوں کے تین رنگ ہوتے ہیں، سیاہ، گندمی اور سنہرہ، سیاہ رنگ کی خوبی بیان کرنا ذرا مشکل ہے، مگر اس میں یہ کرشمہ پیدا کر دی ہے کہ آنکھوں کی پتلی تو سیاہ ہی ہوتی ہے، اور اس میں آدمی تو سیاہ ہی نظر آتا ہے، اور ہر پتلی کے لئے سرمہ چاہئے، سرمہ کا رنگ تو سیاہ ہی ہوتا ہے، سپید رنگ تو عارضی ہوتا ہے، اس لئے بے سود ہے ۔

سیہ را خود بدیدہ جائے گاہ است
کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است[۷]
ز بہر دیدہ باید سرمہ را سود
سپیدہ عارضی رنگی است بے سود

گندمی رنگ کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت آدم نے گندم ہی کو پسند کیا اور پھر اسی گندم سے سارا فتنہ اٹھا، اگر گندم کے آٹے کے ساتھ نمک ملا دیا جاتا ہے تو سینکڑوں بے نمک سپید ٹکیوں سے یہ بہتر ہو جاتا ہے، خسرو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گندمی رنگ کے ساتھ چہرے پر نمک بھی ہو تو چہرے کی سفیدی سے کہیں بہتر یہ رنگ ہوتا ہے ۔

بگندم گو نست میل آدمی زاد
کہ ایں فتنہ ز آدم یافت بنیاد
یکے گندم بکام اندر نمک دہ
ز صد قرص سپید بے نمک بہ[۸]

---

[۱] ایضاً ص ۱۳۰ [۲] ایضاً ص ۱۳۱ [۳] ایضاً ۱۳۱ [۴] ایضاً ص ۱۳۱ [۵] ایضاً ص ۱۳۲ [۶] دول رانی خضر خاں علی گڑھ اڈیشن ص ۱۳۲ [۷] ایضاً ص ۱۳۴ [۸] ایضاً ص ۱۳۴ ۔

خسرو کو ہندوستان کے حسینوں کا سبزہ رنگ بہت پسند تھا اسی لئے اس رنگ کی تعریف میں ان کا قلم خوب چلا ہے، کہتے ہیں کہ یہ سبزہ رنگ لالہ و نسرین کے رنگ سے بہتر ہوتا ہے بہشت کے طاؤس کا رنگ بھی یہی ہے، ستاروں کی زینت بھی اسی رنگ سے ہے، بہشتیوں کی پوشاک کا بھی یہی رنگ ہے، بہار کا رونق بھی اسی رنگ سے ہے، وغیرہ وغیرہ یہ تو ہندوستان کے حسینوں کے رنگ کی مدح سرائی ہوئی، خسرو کے عہد میں جو تہذیب تھی اس لحاظ سے وہ کسی شریف یا پردہ نشین عورت کی قلمی تصویر کھینچنا معیوب تھا، لیکن حسن کی پسندیدگی میں ہندوستانی ذوق کی نمائندگی ان ہندوستانی رقاصاؤں کی وقع آرائی کر کے کی ہے جو شہزادہ خضر خاں کی شادی کے موقع پر بلائی گئی تھیں یہ طبقہ اچھی نظر سے تو نہیں دیکھا جاتا ہے، مگر ان ہی کے ذریعہ شعرا نے ہندوستانی حسن و عشق کی ساری داستان مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، خسرو نے ان حسینوں کو اپنے ناظرین کی خیالی آنکھوں کے سامنے لاکر جو کھڑا کر دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ہندوستان کے حسن کا کیا معیار تھا، ذرا سنئے ان کے مژگان سے سینے چھلنی ہو جائیں، ان کی دزدیدہ نگاہوں سے غم جاتا رہے، ان کے کرشمے سے روح نکل پڑے، وہ پلکیں ماریں تو جوان ہلاک ہو جائیں، ان کی ہنسی سے جانیں تلف ہو کر رہ جائیں ان کے تل موتی کی ڈبیا کی طرح ہوں، ان کے ابرو کی کمان پر جانیں قربان ہوں، ان کے گیسوؤں میں ایسے پیچ و خم ہوں کہ معلوم ہو کہ سانپ صندل میں لپٹا ہوا ہے، ان کی زلفوں کے خیال میں وہی کیفیت پیدا ہو جو روزہ داروں کی شام میں ہوا کرتی ہے، ان کی نیم خواب اور نیم بیدار آنکھوں کو دیکھ کر نیند حرام ہو جاتے، ان کے دہن غنچہ کی طرح کبھی شگفتہ ہوں، ان کے زنخدان سیب کی طرح ہوں، اگر ان سے پسینہ ٹپکے تو پسینے میں ان کے ناز و ادا گرتے ہوئے دیکھے جائیں، یہ تو راقم کے الفاظ ہوئے، اب ذرا خسرو کے اشعار سے بھی محظوظ ہوں۔

بہ مژگانے یکے صد سینہ سفتہ
چہ غم دارد مرا دزدیدہ گفتہ
بہر چشمک زدن کشتہ جوانے
بہر خندہ زدن بر بودہ جانے
ز خال چوں شبہ بر درج مرجان
بیک گنجد نہادہ نرخ صد جان
ز ابرو با کہ قربان گشتہ جانہا
دو گان فگندہ در قربان کمانہا
دو گیسو گرد بر یک پیچ کردہ
چو مارے گرد صندل پیچ خوردہ
خیال زلف شان در جان یاران
چو شام اندر خیال روزہ داران
ربودہ خواب بیداران بیک بار
ز چشم نیم خواب و نیم بیدار
دہن ہائے چو غنچہ گاہ گفتن
گہے در بستن و گہ در شگفتن
زنخ ہائے چو سیب لعل گونہ
نہ چوں سیب دو رنگ ابرص نمونہ
عرق کز روئے ہر طناز می ریخت
کرشمہ می چکید و ناز می ریخت[1]

ہندوستان کے مراسم پر اظہار مسرت

شہزادہ خضر خان کی شادی کے موقع پر شہر کی پوری آرائش کی گئی در و دیوار پر تصویریں بنائی گئیں۔ راستوں پر دیبا کے فرش بچھائے گئے نوبت اور شادیانے دمامے اور دہل بجائے گئے، نٹوں نے رسیوں پر تماشے دکھائے، شعبدہ بازوں نے طرح طرح کی شعبدہ بازیاں کیں، بہروپیوں نے سوانگ بھرے، رقاصاؤں نے رقص و سرود سے تماشائیوں کو محظوظ کیا، نجومیوں نے ساعت سعید مقرر کی، تو بارات ہاتھی گھوڑے اور لشکریوں کے جلو میں روانہ ہوئی، راستے میں یاقوت اور موتی لٹائے گئے، نکاح نیک ساعت میں پڑھایا گیا تو دولہا پر موتی نچھاور کئے گئے، دولہا دولہن کے گھر پر گیا تو دولہن کو اس کے سامنے لاکر جلوہ دکھلانے کی رسم ادا کی گئی وغیرہ وغیرہ[2] ان سب مراسم میں ہندوستانی اثرات زیادہ نمایاں تھے، جن کو خسرو نے مزے لے لے کر یہ ظاہر کرنے کے لئے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں جو ہندوستانی تہذیب سرایت کر رہی تھی اس سے وہ خود خوش تھے۔

مذہبی عقائد کا احترام

وطنی محبت کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ وطن کی سرزمین میں جتنے لوگ رہتے ہوں ان سے بھی مذہب، عقیدہ، ذات پات کی تفریق کے بغیر محبت کی جائے، اور ان کے مذہبی عقائد کا احترام بھی برقرار رکھا جائے، خسرو کے یہاں اس کا بھی پیام ملتا ہے، مثلاً اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں ایک آتش پرست ہندو کا ذکر لے آتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے اور اس کے لئے جان کیوں دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں ہوتی رہتی ہے اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے،[3]

محبت میں ایمانی جذبہ وطنی

امیر خسرو نے قطب الدین مبارک خلجی کی فرمائش پر اپنی مثنوی نہ سپہر ۱۳۱۸ء میں لکھنی شروع کی، اس میں وہ اپنے شاہی آقا کی تخت نشینی اور اس کی لشکر کشی وغیرہ کا حال لکھنا چاہتے تھے مگر ان کے جو وطنی جذبات دبے ہوئے تھے، وہ اس مثنوی میں بہت زیادہ ابھر کر سامنے آگئے ہیں، اگر قران السعدین کو مثنوی وصف دہلی کہا جا سکتا

---

[1] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۵۹ - ۱۵۸ [2] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۱۰۰ - ۱۰۳ [3] ایضاً ص ۹۶ - ۱۹۵۔

ہے تو نہ سپہر کو مثنوی در صفت ہندوستان کہا جا سکتا ہے، اس[۱] میں تو وہ اپنی وطنیت کے اظہار میں بالکل مخمور اور سرشار ہو گئے ہیں اسی سرمستی میں کہہ اٹھے ہیں ۔

حکمت و دانائی و علم و ہنر
وانچہ کہ در ہند معانیست دگر[۱]

پھر اپنی وطنیت کو مذہبی رنگ یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس سے ضرور محبت کرتے ہیں، اور بہت محبت کرتے ہیں اس لئے کہ یہ ان کا مولد، ماویٰ اور وطن ہے اور ان کے رسول کی تعلیم ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جز ہے ۔

آنست یکے کیں زمین از دو زمن
ہست مرا مولد و ماوی و وطن
واین ز رسول آمدہ کا ی زمرۂ دین
حب وطن ہست ز ایمان بیقین[۲]

ہندوستان جنت ارضی ہے

اسی کے بعد یہ لکھتے ہیں ۔

کشور ہند است بہشتی بزمین[۳]

اس کے ثبوت میں سات اسباب فراہم کئے ہیں[۴] ممکن ہے کہ ان اسباب میں ازمنہ وسطیٰ کا طرز استدلال دکھائی دے، جو موجودہ دور کے ذہن کے لئے زیادہ قابل قبول نہ سمجھا جائے، مگر خسرو نے جس جذبہ اور جس جوش و خروش کے ساتھ ان اسباب کو منظوم کیا ہے وہ قابل قدر ہے، پہلے چار اسباب تو یہ بتاتے ہیں کہ حضرت آدم جنت سے ہندوستان میں آئے یہاں طاؤس جیسا فردوس کا پرندہ ہوتا ہے، یہاں سانپ بھی باغ فلک سے آیا، حضرت آدم ہند سے باہر نکلے تو فردوس کی نعمتوں سے محروم ہو گئے، اس کے بعد خسرو نے اور جو دو اسباب بتاتے ہیں، ان میں بڑا جذباتی رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس سے آج کل کے جذبات کو بھی تسکین ہو سکتی ہے، لکھتے ہیں کہ یہاں خوشی اور عیش کے ساتھ اس کے پھول اور مٹی میں طرب ناکی ہے جس سے نشاط و آسائش کا سامان پیدا ہوتا رہتا ہے، یہاں کے پھولوں اور خوشبوؤں کی وجہ سے سال کے ہر حصہ میں اس کی سرزمین گلزار بنی رہتی ہے، رے اور روم میں تو پھول دو تین مہینے سے زیادہ نہیں دکھائی دیتے اور وہاں جو پھول ہوتے بھی ہیں تو تیغ اور ژالہ کی وجہ سے ان میں خوشبو نہیں ہوتی، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان اپنی نعمتوں اور خوبیوں کی وجہ سے بہشت ہے ۔

خوشدلی و عیش فزاییست چنان
کان ز می از روح شدہ دار جنان[۵]
بس ہمہ حال ز خوبی و بہی
ہند بہشت است باثبات رہی[۶]

آخر میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا تخیل ہے کہ موت کے بعد ان کو جنت ملے گی، اس لئے وہ اس دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہیں لیکن ہندوستان میں جو نسیم بہتی ہے اس سے ہندوستان خود بخود جنت بن گیا ہے اور ہندوستان کے مسلمان اس سرزمین کو قید خانہ کے بجائے خلد بریں سمجھنے لگے ہیں ۔

گرچہ کہ بر نسبت فردوس نہان
با ہمہ لطفیش چو زندان است جہان
لیک بہنداست نسیمش دگر
کاتش در دوں می دہد از جنت اثر
زاں سبب خاص بر اصحاب یقین
ہند تو ان گفت کہ خلد ست برین[۷]

ہندوستان کی آب وہوا کی خوبیاں

قران السعدین میں خسرو نے مختصر طور پر ہندوستان اور دہلی کی آب وہوا کی تعریف کی تھی ان کو شاید اس اختصار سے تسکین نہیں ہوئی، اس لئے نہ سپہر میں ہندوستان کی آب وہوا کی پھر مدح شروع کر دی ہے، وہ کوئی ماہر موسمیات تو نہیں تھے، محض شاعر تھے، اسی لئے شاعرانہ انداز میں اس کی دس خوبیاں بتا کر اس کو دوسرے ممالک کی آب وہوا سے بہتر قرار دیا ہے[۸] پہلی خوبی تو یہ بتائی ہے کہ یہاں کی سردی سے کسی آدمی کو نقصان نہیں پہونچتا، ہندوستان کی فضیلت بیان کرنے میں خراسان کو ہمیشہ نیچا دکھاتے ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں دوسری خوبی یہ بتاتے ہیں کہ خراسان میں لوگ ٹھنڈک سے مر جاتے ہیں مگر ہندوستان میں سردی سے لوگ ہلاک نہیں ہوتے، تیسری خوبی یہ لکھی ہے کہ یہاں کی سرد ہوا کے خوف سے غریبوں کو زیادہ سرمائی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی، ایک کمبل کافی ہوتا ہے، کسان تو ایک پرانی چادر میں رات گذار لیتا ہے، برہمن تو رات کے آخری حصہ میں جمنا کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگاتے ہیں، خسرو کے نزدیک چوتھی خوبی یہ ہے کہ خراسان میں دو تین ہفتے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہندوستان میں پورے سارے گل ول کی بہار رہتی ہے، یہاں کی آب وہوا کی وجہ سے یہاں کے پھول گل بابونہ کی طرح خوش رنگ رہتے ہیں، اور یہاں کے پھولوں میں خشک ہونے کے بعد بھی خوشبو رہتی ہے، یہ خسرو کے نزدیک پانچویں اور چھٹی خوبیاں ہیں، پھر یہاں کی آب وہوا ہی کی وجہ سے امرود، آم، کیلا، الائچی، کافور، لونگ جیسی چیزیں ہوتی ہیں، اس کو وہ ساتویں خوبی قرار دیتے ہیں، ایک بار پھر وہ خراسان اور ہندوستان کا موازنہ کرنے لگتے ہیں، کہتے ہیں کہ خراسان کے بہت سے میوے تو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں لیکن ہندوستان کے میوے وہاں نہیں ہوتے اس کو وہ آٹھویں خوبی بتاتے ہیں، بقیہ دو خوبیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہاں کی آب وہوا کی وجہ سے دو نادر چیزیں ہوتی ہیں، ایک کیلا اور دوسرا پان، کیلا تو اب ہندوستان سے باہر بھی ہونے

---

۱ مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۴۹ ۔ ۲ مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۵۰ ۳ ایضاً ص ۱۵۱ ۔ ۴ ایضاً ص ۱۵۰-۱۵۱ ۵ ایضاً ص ۱۵۵ ۶ ایضاً ص ۱۵۰
۷ ایضاً ص ۱۵۰ ۸ ایضاً ص ۱۶۱ ۔

لگا ہے، لیکن پان کہیں اور جگہ نہیں ہوتا ہے اس کو وہ میوہ ہی قرار دیتے ہیں۔

ہست نہ ہم آنکہ چو تنبول گزیں
میوہ نہ باشد ہمہ روئے زمیں

ہندوؤں کے علوم وفنون کی تعریف

یہاں تو خسرو نے اپنے وطن کی آب وہوا کی خوبیاں بتائیں، وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے وطنی بھائیوں کے علوم وفنون کی قدر کرنے کی تلقین بھی دیتے ہیں۔ اسی لئے بڑی فراخ دلی سے لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں کے دانش ومعانی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، روم سے فلسفہ ضرور پھیلا لیکن ہندوؤں کے یہاں بھی یہ علم کم نہیں یہاں منطق بھی ہے، نجوم بھی، علم کلام بھی البتہ ان کے یہاں فقہ نہیں، برہمنوں کے علم کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے۔

برہمنے ہست کہ در علم وخرد
دفتر قانون ارسطو بدرد

خسرو کے بیان کے مطابق ہندوستان میں طبیعیات، ریاضیات اور ہیئت وغیرہ سب کچھ ہیں، البتہ یہاں کے لوگ مابعد الطبیعیاتی علوم نہیں جانتے، خسرو کے اس بیان کے آخری ٹکڑے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، گو خسرو نے یہ لکھ کر اس کو یہ کہہ کر سنبھالا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ اور بھی قومیں مابعد الطبیعیاتی علوم سے واقف نہیں۔

ہندوؤں کی وحدانیت کا اعتراف

اس کے بعد خسرو نے ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی اہم ہے، مسلمانوں کے یہاں توحید ایمان کا سب سے بڑا جز ہے، جو لوگ اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کے قائل نہیں ان کو وہ مذہبی حیثیت سے ادنیٰ درجہ دینے کے لئے تیار نہیں، وہ ہندوؤں کو محض بت پرست سمجھتے رہے ہیں، خسرو ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو یہ کہہ کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندو ہمارے مذہب کے تو معتقد نہیں لیکن ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں، لکھتے ہیں کہ وہ خداوند تعالےٰ کی ہستی، وحدت اور قدم کے معترف ہیں۔ وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ وہی عدم سے اس دنیا کو وجود میں لایا، وہی روزی عطا کرتا ہے، وہی نیکی اور بدی کا خالق ہے، اس کی حکمت ازلی وابدی ہے، وہی ازل سے ہر کل وجز کا مختار اور فاعل ہے، یہ ساری باتیں تحقیق کرکے لکھی جارہی ہیں، ان میں جھوٹ نہیں۔

معترف وحدت وہستی وقدم
قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم
رازق ہر بہر ہنر بے ہنرے
عزّ بہ دہاں دہ ہر جانورے
خالق افعال بہ نیکی وبدی
حکمت وحکمش ازلی وابدی
فاعل مختار ومجازی بہ عمل
عالم ہر کل وجزوی ز ازل
ایں ہمہ راگشت بہ تحقیق مقر
نے چو بسے طائفہ بر کذب مصر

ہندو مذہب کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے

اسی پر وہ اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ ہندوؤں کے مذہب کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے بھی کرتے ہیں، انھوں نے اس مذہب کو اسلام کے علاوہ اور تمام مذاہب سے بہتر قرار دیا ہے لکھتے ہیں کہ ثنوی فرقہ خدا کو ایک بجائے دو مانتے ہیں، لیکن ہندو خدا کو ایک ہی مانتے ہیں، عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں ہندوؤں کا یہ عقیدہ نہیں، فرقہ مجسمہ خدا کو صاحب جسم مانتا ہے، ہندو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے، ستارہ پرست کی طرح ہندو سات خدا نہیں مانتے، فرقہ مشبہ خدا کو ممکنات سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن ہندو اس کے خلاف ہیں، پارسی نور وظلمت دو خدا مانتے ہیں، لیکن ہندوؤں کا ایسا خیال نہیں، وہ پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں، لیکن ان کی پرستش میں جو اخلاص ہے وہ قابل قدر ہے، ان کو پوجنے کے باوجود وہ اس کے قائل ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوقات ہیں، وہ اس کی اطاعت کے منکر نہیں۔ ہندوؤں کی بت پرستی کے متعلق خسرو کا یہ شعر تو بہت مشہور رہا۔

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری
ہم زوے آموز پرستش گری

ہندوستان کی فضیلت

ہندوستان کی فضیلت بیان کرنے میں خسرو کا قلم چلا تو رکا نہیں، اسی لئے ایک دوسرے انداز میں اس کی برتری بتانا شروع کردیا ہے، اس کی فضیلت کے دس اسباب بتائے ہیں۔ مثلاً یہاں علم اور جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ رہا، یہاں کے لوگ دوسری جگہوں کی زبان سیکھ کر بول سکتے ہیں، مگر دوسری جگہ کے لوگوں کی زبان یہاں کی زبان بولنے میں سل جاتی ہے، دوسرے ممالک کے لوگ یہاں کے علوم سیکھنے کے لئے آئے، مگر ہندوستان کے لوگ علوم سیکھنے کے لئے کہیں اور نہیں گئے، ہندسہ ریاضی اور ایجاد صفر یہاں کی خاص چیزیں ہیں، کلیلہ ودمنہ جیسی کتاب کہیں اور نہیں لکھی گئی، شطرنج یہیں کی ایجاد ہے، کلیلہ ودمنہ اور شطرنج

ا؎ مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۶۱ ۲؎ ایضاً ص ۱۷۲-۱۶۱ ۳؎ ایضاً ص ۱۶۲ ۴؎ ایضاً ص ۱۶۴۔ ۵؎ مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۶۵ ۶؎ ایضاً ص ۱۶۹-۱۷۲۔

کی مقبولیت دنیا میں ہوئی یہاں کی برتری کو برقرار رکھنے میں یہاں کی موسیقی کو بھی بڑا دخل ہے یہاں کی موسیقی کو جو ترقی ہوئی وہ کہیں اور نہیں ہوئی، یہاں کی موسیقی سے جنگل کے ہرن بھی بے جان ہو جاتے ہیں، آخر میں خسرو ہندوستان کی فضیلت میں بھی اپنے کو شمار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کا جیسا ساحر شاعر چرخ کہن نے کہیں اور نہیں پیدا کیا۔

حجت دہ آنکہ چو خسرو بہ سخن
سحر گری نیست نہ چرخ کہن

زبانوں میں سنسکرت کی برتری کا اعتراف

اپنی وطن دوستی میں یہاں کی مختلف زبانوں میں عربی، فارسی اور ترکی کے علاوہ ہندوی، سندھی، لاہوری، کشمیری، کبری، دھور سمندری، تلنگی، گجری، معبری، گوری، بنگالی، اودھی اور سنسکرت کا بھی ذکر کرتے ہیں[۱] لیکن ان سب میں سنسکرت کو افضل تر بلکہ فارسی سے بھی برتر قرار دیا ہے، البتہ عربی سے اس کو بہتر نہیں سمجھتے ہیں، مگر اس کی شیرینی کو فارسی کے برابر ہی تسلیم کیا ہے۔

آنست زبانے بہ صفت در دری
از عربی کمتر و برتر زدری
گرچہ کہ شیرینست دریں دفتریں
ذوق عبارت کم ازاں نیست دریں[۲]

ہندوستانی جانوروں کی تعریف

امیر خسرو کو ہندوستان کی ہر چیز پیاری رہی، تو پھر یہاں کے جانوروں کی طرف ان کی پیاری نگاہیں کیوں نہ جائیں، ان کے اوصاف بیان کرنے میں بھی ان کے وطنی جذبات خوب ابھرے ہیں[۳]۔ لکھتے ہیں کہ یہاں کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں۔ مینا یہاں کا خاص پرندہ ہے جو کہیں اور نہیں پایا جاتا، یہ بھی آدمی کی طرح بول سکتا ہے، یہاں کے کوّے مستقبل کی خبریں دیتے ہیں، یہاں کی گوریائیں بھی پوشیدہ باتوں کی خبر دیتی ہیں، یہاں کے طاؤس میں دلہن کی ایسی رعنائی ہے، یہاں کے بگلے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں، یہاں کی بکری ایک پتلی لکڑی پر چاروں پاؤں رکھ کر کھڑی ہو جاتی اور ٹھہر سکتی ہے، یہاں کے بندر اپنی عقل میں ناقص بشر کی حد تک ہیں، یہاں کے ہاتھی بظاہر حیوان ہیں لیکن عمل میں انسان ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان کے جادوگروں کی تعریف

خسرو کی توجہ ہندوستان کے جادوگروں کی طرف بھی ہوئی، لکھتے ہیں کہ یہاں کے جادوگر مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں، سانپ کے کاٹے ہوئے مردوں کو چھ مہینے کے بعد بھی زندگی دے سکتے ہیں، یہاں عمر بھی بڑھائی جا سکتی ہے، یہاں کے جوگی حبس دم کی مشق کر کے دو سال تک زندہ رہ سکتے ہیں، یہاں کے ابر میں بارش بھی روکی جا سکتی ہے وغیرہ وغیرہ یہ باتیں عمل میں آتی یا نہ آتی ہوں، مگر خسرو ہندوستان کی بڑائی بیان کرنے میں یہ سب کچھ جوش و خروش میں لکھ سکتے ہیں۔

ہندو عورت و مرد کے جذبۂ وفاداری کا احترام

خسرو اپنے ہم وطن ہندو عورت اور مرد کی اس خوبی سے متاثر تھے کہ وہ اپنے شوہر کی خاطر اپنے کو جلا کر راکھ کر سکتی ہیں، اور مرد اپنے بت اور آقا کی خاطر جان دینے میں دریغ نہیں کرتے، ان کی اس وفاداری کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے خسرو لکھتے ہیں کہ اسلام میں ایسی چیزیں تو جائز نہیں، لیکن شریعت اجازت دیتی، تو وہ اس وفاداری کی سعادت کو حاصل کرنے کی تلقین کرتے۔[۴]

ہندوستانی حکمراں کے طبقہ کی ذمہ داریاں

ایک محب وطن کی حیثیت سے خسرو کی نظریں اس ملک کے حکمراں طبقہ کی طرف بھی اٹھی ہیں، ان کی دلی خواہش یہی رہی کہ اس ملک کے بادشاہ حکمراں، لشکری اور عام باشندے اپنے سیرت و کردار اخلاق و اطوار میں اچھے سے اچھے ہوں، اسی لئے وہ بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ وہ دیندار رہو، اس کی ہر رائے محکم ہو، جو کچھ کہے اس پر عزم و سکون کے ساتھ عمل کرے، کسی کام میں غفلت کو راہ نہ دے، انصاف پسند ہو، ظلم کی آواز اس کی کانوں میں نہ پڑے، خواص و عوام کی آسودگی کا خیال یکساں طور پر رکھے، تاکہ جنگل اور محل کے رہنے والے دونوں خوش رہیں[۵]۔ امراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اگر ان کو خدا کو خوش رکھنے کا خیال غالب رہے گا تو وہ اپنے ملک کے بادشاہ کو بھی خوش رکھ سکتے ہیں حقیقی مالک کی اطاعت گذاری ہی سے دنیاوی مالک کی فرمانبرداری آ سکتی ہے[۶]۔ وہ ہندوستانی لشکریوں میں بھی اچھے سے اچھے اوصاف دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے ان کو بھی یہ نصیحت کی کہ وہ مذہبی بن کر فوج کی خدمت انجام دیتے رہیں، غارت گری اور ناموری کے لئے نہ لڑیں، رعایا کی کھیتی کی حفاظت ہر حال میں کریں، خون جگر سے کاشتکار جو چیز تیار کرتے ہیں، ان کو اپنے گھوڑوں کے پیٹ میں جانے نہ دیں[۷]۔

اچھے ہندوستانی کے اوصاف

پھر ایک اچھے ہندوستانی کے یہ اوصاف بتاتے ہیں کہ وہ سچے، خوش خو، نیکو خواہ ہوں، نشے میں دیوانے نہ بن جائیں، دیانت اختیار کریں، خیانت سے ادبار آتا ہے حسد اور بخل سے بڑھ کر کوئی اور برائی نہیں[۸]۔

وطن کے علاقے کی تعریف

امیر خسرو ہندوستان کی محبت کا راگ اپنی زندگی کے آخر وقت تک الاپتے رہے

---

۱ ایضاً ص ۱۷۹، ۲ ایضاً ص ۱۹۱-۱۹۰، ۳ ایضاً ص ۱۹۱-۱۸۱، ۴ ایضاً ص ۱۹۴-۱۹۱، ۵ مثنوی دہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۹۵-۱۹۴، ۶ ایضاً ص ۲۹-۲۲۸، ۷ ایضاً ص ۲۲۹، ۸ ایضاً ص ۵۸-۲۵۶

ان کا آخری دیوان نہایۃ الکمال ہے[1]، اس میں حمد، نعت اور منقبت کے ساتھ حسب معمول سلاطین اور شہزادوں کی شان میں قصیدے ہیں، لیکن ان کو جہاں بھی موقع ملا ہے وہ اپنی وطنیت کے ساز پر اپنی محبت کے نغمے بلند کرتے رہے ہیں، دیوگیر کا ذکر آگیا ہے جو دہلی سے دور دراز حصہ میں واقع تھا، لیکن ان کے وطن کا علاقہ ہو گیا تھا، اس لئے اس کو مصر اور بغداد پر فضیلت دے دی ہے، اور پھر شاعرانہ انداز میں کہہ گئے ہیں کہ مصر نے اس کی شہرت سن کر گویا رشک و حسد میں اپنا جامہ اتار کر نیل میں پھینک دیا ہے، اس کی ہوا میں مسیحائی اور پانی میں آبِ خضر کی تاثیر بتائی[2]، یہاں کے پھولوں خوشبوؤں اور پرندوں سب کی ہی تعریف کی، یہاں کے پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے کیلے کے متعلق لکھا کہ ہلال کی طرح خم اور رطب کی طرح خوش گوار ہوتے ہیں، آموں کو شہد اور دودھ سے بھرے ہوئے سنہرے ڈبے سے تشبیہ دی، یہاں کے پان کی بھی تعریف کی[3]، دیوگیر کے کپڑے کی مدح میں اپنے شاعرانہ تخیل کو پورے طور پر بروئے کار لے آئے ہیں، کہتے ہیں اگر چاند کی جلد کو چھیلا جائے اور اس سے علیحدہ کر دے اور پھر اسی جلد سے دیوگیر کے کپڑے کا موازنہ کیا جائے تو کپڑا اپنی باریکی میں بڑھ جائے گا، اس کا ایک سو گز سوئی کے ناکے میں سما سکتا ہے، اس سے لباس بنا کر پہنا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر صاف شفاف پانی پڑ رہا ہے۔

چہ وصف جامہ کنم کانچناں نباشد اگر
زمہ بسلخ کشد پوست اختر جلاد
بچشم سوزن صد گز نہ گنجد از پس لطف
درو بچلہ خرد نوک سوزن پولاد
بسانِ قطرۂ آبے توانش گفتن اگر
چکد ز چشمۂ خور قطرہ ہا معتاد

دیوگیر کی موسیقی کے بھی وہ فریفتہ ہوئے، اس کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ یہاں کے چنگ کی آواز سے زہرہ بھی نالہ و فریاد کر سکتی ہے، اور یہاں کے نغمے سے مردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔

دگر سرود چناں کز خراشش ہر زخمہ
چو چنگ خویش کند زہرہ نالہ و فریاد
عجب نباشد اگر مردہ زندہ گردد ازاں
کہ لفظ در دل نغمہ جاں باز نہاد[4]

ہندوستانی موسیقی سے محبت

خسرو اپنی مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب اور روح دونوں کو جلاتی ہے، اور دوسرے تمام ممالک سے بہتر ہے[5]، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی صرف آدمیوں کو نہیں بلکہ جانوروں کو بھی مسحور کر دیتی ہے، شہ ہرن کو اس کے ذریعہ مسحور کر کے شکار کر لیا جاتا ہے، وہ ایرانی طرز موسیقی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے، اور جب ان کے اور دوسرے ہم مذہب ایرانی طرز کے گانے سننے میں مشغول تھے، تو انھوں نے ہندی راگ اور ایرانی راگ راگنیوں کو ملا کر نئے راگ پیدا کر کے اس میں ایک خاص کیفیت پیدا کی، ان ہی کی طرف مجیر، منم، زیلف، سازگری، ایمن، عشاق، موافق، غنم، فرغنہ، سرا پردہ، باخرز، فردوست، اور محرم منسوب ہیں، راگ درپن کے مصنف کا خیال ہے کہ مجیر غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے، منم میں کلیان کے ساتھ ایک ایرانی راگ شامل ہے، سازگری میں پوربی، گوری، کنگلی اور ایک فارسی راگ کا امتزاج ہے، زیلف میں کھٹ راگ کو شہناز سے ملایا ہے، ایمن میں ہنڈول اور نیریز ملے ہوتے ہیں، سارنگ، بسنت اور نوا کے راگ ہیں، موافق میں ٹوڑی، مالوی، درگا اور حسینی لئے ہوتے ہیں، غنم میں پوربی کو ذرا تغیر کر دیا گیا ہے، فرغنہ میں کنگلی اور گوری کو ملایا ہے، باخرز میں دیسکار کے ساتھ ایک ایرانی راگ ہے، سرا پردہ میں سارنگ بلاول اور راست کو مرکب کیا ہے، فردوست میں کانہڑا، پوربی اور ایک ایرانی راگ کا امتزاج ہے، اور ٹوڑی اور عراق کو ملا کر محرم بنایا گیا ہے۔

(راگ درپن قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ)

بادشاہ نامہ کا مصنف عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ ہندوستان میں خسرو سے پہلے گیت، چند، دھروپد اور راستہ گائے جاتے تھے، لیکن خسرو نے خاص خاص چیزیں ایجاد کیں، ان میں چار کے نام اس نے خاص طور پر لئے ہیں۔ (۱) قول جس میں فارسی اور عربی کے اشعار ہوتے ہیں، جو ایک سے چار تال پر گایا جاتا (۲) دوسری چیز کا نام لئے بغیر وہ لکھتا ہے کہ اس میں فارسی اشعار ترانہ کے ساتھ ایک تال پر گائے جاتے، شاید یہ قلبانہ ہو (۳) ترانہ، اشعار نہیں ہوتے تھے، لیکن ایک تال پر گایا جاتا (۴) خیال[6]

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خیال حسین شاہ شرقی کی ایجاد ہے، لیکن کچھ ارباب فن ایسے بھی ہیں جو خسرو کو خیالیوں کا نائک کہتے ہیں، اور خیال کی ایجاد ان ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، امیر خسرو کے زمانے میں سنسکرت میں دھرپد زیادہ گایا جاتا جو زیادہ تر ہندوؤں کی مذہبی روایتوں پر مبنی ہوتا، مسلمان دھرپد کے تقدس اور اس کی کلاسیکی اہمیت سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ امیر خسرو کے اختراع پسند ذہن نے دھرپد کی جگہ خیال ایجاد کیا، آل انڈیا ریڈیو کے سابق ڈائرکٹر آف میوزک ڈاکٹر سنتی شا ٹھکر کا بیان ہے کہ قوالی کے چلنت بولوں اور جزئیات سے خیال وجود میں آیا، اس لحاظ سے بھی خیال امیر خسرو ہی کی ایجاد سمجھی جاتی ہے کیوں کہ قوالی بھی امیر خسرو ہی کی اختراع ہے، قوال تو امیر خسرو ہی کو اپنا ابو الآبا سمجھتے ہیں، قوالی میں غزل کا حسن، موسیقی کا روپ اور ارباب دل کا کیف شامل ہوتا ہے، امیر خسرو غزل گو تھے، موسیقی کے ماہر بھی تھے، اور صاحب دل بھی تھے، اس لئے قوالی کی ایجاد کے لئے وہی موزوں ہو سکتے تھے، عام روایت یہ بھی ہے کہ خسرو نے ہندوؤں کے وینا اور ایرانی طنبورہ کو ملا کر ستار کی ایجاد کی، دسویں صدی سے پہلے کسی کسی شکل میں ایشیائے کوچک، ایران، آرمینیا اور ترکستان میں ستار ضرور موجود تھا

---

[1] نہایۃ الکمال ص ۱۵۰۔ [2] ایضاً ص ۱۵۰۔ [3] ایضاً ص ۱۵۲۔ [4] ایضاً ص ۱۵۲۔ [5] نہ سپہر ص ۱۰۱۔۱۰۲ [6] بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری جلد دوم ص ۵۰۶۔

اور یہ بیرونی ملکوں ہی سے ہندوستان پہنچا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مشہور ہے کہ پہلے ستار میں چار تار ہوا کرتے تھے، مگر خسرو نے اس میں تین تار اور بڑھا دیئے اور اس کا نام ستار رکھ کر خسرو کی طرف منسوب ہو گیا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طبلہ بھی امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے۔ ڈھولک کی ایجاد بھی عام طور سے ان ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

وطنی محبت کے جذبے میں امیر خسرو ہندوستانی عورتوں کے گیت سے بھی متاثر ہوئے اور خود ان کے جذبات کا اظہار اپنے ہندی گیتوں میں کرنے لگے، شادی بیاہ کے موقع پر جو گیت اور بابل گاتے جاتے ہیں، ان میں سے بہت کچھ امیر خسرو کی طرف منسوب ہیں، محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ دلی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں گھر گھر ڈلواتی ہیں، درخت ہو تو اس میں جھولا ڈلواتی ہیں، مل مل کر جھولتی ہیں، اور گیت گا گا کر جی خوش کرتی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو۔

آجہوں نہ آوے سوامی ہو
اے ہو جو پیا آون کہہ گئے
آون آون کہہ گئے
آئے نہ بارہ ماس
اے ہو جو پیا آون کہہ گئے

یہ گیت امیر خسرو کا ہے اور بروا راگ میں ہے بھی ان ہی کی رکھی ہوئی ہے، محمد حسین آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ موسیقی میں امیر خسرو کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے ہی بجتی تھی، اس لئے دھرپد کی جگہ قول قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان کے اکثر گیت آج تک ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کی زبان پر ہیں، بہار راگ پر بسنت کے میلے ہی نے ان کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے، بین کو مختصر کر کے ستار بھی انھوں نے نکالا ہے [1]

خسرو کے بسنت کے گیت کی روایت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک بھانجے مولانا تقی الدین تھے، جن کو حضرت خواجہ بہت محبوب رکھتے تھے، ان کا انتقال عین شباب میں ہو گیا، حضرت خواجہ کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا، چھ مہینے تک ان پر پر سکوت طاری رہی، اس سے امیر خسرو مغموم رہتے تھے، وہ برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو، اس زمانہ میں ہندوؤں کا بسنت کا میلہ لگا، وہ دلی میں کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے، اور مست ہو کر گیت گا رہے تھے، امیر خسرو بھی اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت موزوں کئے، سرسوں کے پھول توڑے اور پگڑی پر رکھ کر مستانہ شان پیدا کی، جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر مسکرانے لگے، پھر تو امیر خسرو کا کام بن گیا اس روز سے دہلی میں جب ہندو کالکاجی کے مندر پر جاتے تو دلی اور قرب وجوار کے صوفیہ قوالوں کو لے کر کنول کے پھول ہاتھوں میں لئے اشعار پڑھواتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر جاتے تھے، وہاں سے حضرت خواجہ کے مزار پر آتے ہیں ان اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

اشک ریز آمدست ابر بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

قوال ہندی کی ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر اسی شعر کو بار بار دہراتے، ہندی کا ایک مصرع یہ ہے۔

عرب یار توری بسنت منائی

یہ چلتا رہا تو بڑا اثر پیدا ہوتا، رفتہ رفتہ دلی کی درگاہوں میں پندرہ دن تک بسنت میلہ رہنے لگا، دوسری جگہوں میں بھی مسلمان بسنت منانے لگے بسنت کے موقع پر امیر خسرو کا ایک گیت ان کی طرف اس طرح بھی منسوب ہے۔

حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال
باقیس کھاجہ مل بن بن آیو تا ہیں　　حضرت رسول صاحب جمال
حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال
عرب یار تیرو بسنت منائیو　　سدا رکھیتے رکھیتے لال گلال
حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال [2]

ہندی زبان سے محبت

امیر خسرو نے اپنی وطنی محبت کی بنا پر یہاں کی زبان ہندی نہ صرف سیکھی بلکہ اس میں مہارت پیدا کی اور فخر کے ساتھ کہا کہ وہ ہندوستانی ترک ہیں، ہندی بول سکتے ہیں، وہ مصری نہیں کہ عربی میں گفتگو کریں۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

اور یہ بھی کہ وہ طوطی ہند ہیں، ان سے کوئی ہندی میں سوال کرے تو وہ میٹھی ہندی میں بول سکتے ہیں۔

چو من طوطی ہندم راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

وہ اپنی عبارتوں میں جہاں کہیں بھی ہندی الفاظ خوبصورتی سے استعمال کر سکتے تھے، کرتے رہے، وہ خود کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں اشعار کہہ کر اپنے دوستوں میں تقسیم کرتے رہے، مگر انھوں نے ان کا کوئی مجموعہ تیار نہیں کیا، یہ زیادہ تر تفریحی اشعار تھے جن کو انھوں نے محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا، اب بہت سے ہندی اشعار ان کے نام سے منسوب ہیں، جن کے متعلق یہ شبہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے واقعی ہیں بھی کہ نہیں، وہ بلند پایہ اشعار بھی نہیں، البتہ ان کی تصنیف خالق باری کے متعلق یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ یہ ان ہی کی تصنیف ہے، گو یہ بھی شک وشبہ سے خالی نہیں، اس کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ فارسی جاننے والے بڑے اور بچے ہندی

---

[1] اسلامک کلچر حیدرآباد، جنوری ۱۹۵۵ء [2] آب حیات ص ۶۹ [3] پورا متن امیر خسرو کی ہندی شاعری مرتبہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میں درج ہے ص ۱۴۹-۱۵۰ [4] دیباچہ غرۃ الکمال، نیز دیکھو دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۲-۲۲۷۔

سے بھی واقف ہوں ۔ یہ کتاب خسرو جیسے عبقری شاعر کے لئے باعثِ ناز نہیں ہو سکتی، مگر یہ کوشش اس لحاظ سے اہم ہے کہ رفتہ رفتہ ہندی اور فارسی کی آمیزش سے ایک ایسی زبان تیار ہوئی جس کو اردو کہا جانے لگا۔ خسرو کی کچھ ایسی بھی غزلیں مشہور ہیں جن کا ایک فقرہ ہندی اور دوسرا فارسی میں ہے، اسی لئے بعض اربابِ نظر ان کو اردو شاعری کا موجد اور اس کے صنم خانہ کا پیرِ مغاں قرار دیتے ہیں ۔

خسرو نے اپنی وطنی محبت میں یہاں کے بچوں کی تفریحِ طبع کے لئے بہت سی پہیلیاں اور مکرنیاں بھی لکھیں جو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں، یہاں کی لڑکیوں کی دلچسپی کے لئے بھی کچھ گیت لکھے، ان سب کو ڈاکٹر شجاعت علی سنڈیلوی نے اپنی کتاب امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری میں ان کی خالق باری کے ساتھ بوجھ پہیلیاں، بن بوجھ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دو سخنے، نسبتیں، غزل، دوہے، آنکھ کا نسخہ، بسنت، ساون کا گیت، ڈھکوسلا وغیرہ کے عنوانات سے ایک جگہ جمع کر کے ایک مفید کام انجام دیا ہے، معلوم نہیں اس میں وہ بابل کیوں نہیں شامل کئے گئے ہیں جو خسرو سے منسوب ہیں، یہ ساری چیزیں سامنے آگئی ہیں تو فیصلہ ہو سکتا کہ کیا چیزیں ان کی ہو سکتی ہیں اور کیا محض ان کے نام سے منسوب ہو گئی ہیں ۔

تمت

خسرو نے اپنی فارسی شاعری میں اپنی وطنیت کا جو راگ الاپا ہے، وہ ایک مستقل پیام ہے کہ ہم جس ملک میں پیدا ہوتے ہیں اور جہاں نشو و نما پاتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اس کی ہر چیز کو محبوب رکھیں، اس کا ہر شہر، اس کے باشندے، اس کی آب و ہوا، اس کی زبانیں، اس کے علوم و فنون، اس کی عورتوں کا حسن اس کے پھول، پھل، جانور اور حتیٰ کہ اس کے جادوگر اور رنڈی بھی محض اس لئے عزیز ہوں کہ یہ وطن کے ہیں، وہ اپنی مذہبیت میں اپنی مثال آپ رہے، ان کے سینے کے سوزِ عشقِ الٰہی پر خود ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الاولیاء کو فخر رہا، اسی کے ساتھ اپنی وطنی محبت کو اپنے ایمان کا جزو بنائے رکھا، انھوں نے مذہبیت کے جامِ شریعت اور وطنیت کے سندانِ عشق کو جس حسین آمیزش سے باہمی محبت، یگانگت، مفاہمت اور اتحادِ ذہنی کی جو جوت جگمگائی اس سے ان کی ذات اس روشنی کا ایک بلند مینارہ ہے کہ مذہب کی راسخ العقیدگی دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی، مذہب کی پابندی اور عمل میں سچا اخلاص ہو تو یہی سچائی دلوں میں فراخ دلی پیدا کر سکتی ہے جس سے دلوں کی تسخیر آسانی سے ہو سکتی ہے ۔

بقیہ ۔ امیر خسرو بحیثیت ایک عوامی شاعر

خسرو کے عہد میں دیسی اور فارسی لفظوں کے میل سے ایک نئی زبان بن رہی تھی ۔ ایسے وقت پر خسرو کی دور رس نظروں نے ترتیبِ فرہنگ کی ضرورت کو سختی سے محسوس کیا ۔ انھوں نے اپنی ہندوی اور فارسی پہیلیوں، دو سخنوں اور فرہنگ نامے خالق باری میں تدبر سے دیسی الفاظ کے مقابل فارسی کے علمی الفاظ رکھ کر دیسی الفاظ کے صحیح معنی متعین کرنے کی کوشش پہلی بار کی ہے ۔

خالق باری خسرو کی مقبول ترین تصنیف ہے جو سارے ہندوستان میں مختلف بولیوں کے حلقوں میں سات سو سال تک مکتبوں پر چھائی رہی ۔ اس کتاب نے سارے ملک کو ایک ہندوستان گیر زبان تو سکھائی لیکن مکتبوں کے ماحول میں خود بھی تحریف اور تخریب کی زد میں آ گئی ۔ اس میں بعض جگہ خسرو کی زبان سے مطابقت، ناموزوں اشعار اور غلط الفاظ آ گئے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس تصنیف کا رشتہ ہی خسرو سے توڑ دیا جائے ۔ خسرو کے جشنِ ہفت صد سالہ کے موقع پر خالق باری کے یہ سارے نقائص دور کرنے کی ایک اجتماعی اور متفقہ کوشش ہونا چاہئے ۔ خالق باری ایک مختصر کتاب ہی لیکن تاریخِ زبان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے ۔

بقیہ ۔ حیاتِ خسرو

یہ صنعت بھی خاص ان کی ایجاد ہے ۔ اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے ۔ اس کے بعد کا لفظ دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہوتا ہے ۔ مثلاً

سودای رخ تو کشت مارا

یہ فارسی مصرع ہے ۔ لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو "مارا" ہوگا ۔ اس لئے مصرع کا آخری لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے ۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے ۔

محتمل المعانی

ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے سات معنی ہیں اور ہر معنی وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں ۔

موقوف الآخر

ایک رباعی لکھی ہے ۔ جس کا ہر قافیہ دوسرے مصرعہ کا آغاز کا محتاج ہے مثلاً

درحسن ترا کسے نماند الّا　　خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند و پائے تو بوسد امّا　　بینی تو بسے او چو پا بوسد تا

انھی صنعتوں اور ایجادوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں ۔ اگر کسی صاحب کو اس سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجازِ خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں ۔

دُنیا کے بڑے آدمیوں کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ
ں وہ اپنے حالات و ماحول کا ما حصل تھے اور کس حد تک انھوں نے بناتِ خود
ِ دیش کے حالات پر اثر انداز ہونے اور ان کو تبدیل کرنے کے کام میں حصہ لیا
ں تاریخ ایک طرف بڑے آدمی بناتی ہے وہاں دوسری طرف بڑے آدمی تاریخ
تے ہیں۔ دونوں لحاظ سے حضرت امیر خسرو ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی یک جہتی
تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف اس دور کی وہ صحیح نمایندگی کرتے
ں اور دوسری طرف ہندوستان کی تاریخ پر اُن کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

حضرت امیر خسرو غالباً وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے خلوصِ نیت
ے وطن کی محبت، رواداری، وسیع المشربی، فراخدلی، کشادہ ذہنی اور ان کے
ریعہ تہذیبی یک جہتی کی تبلیغ اپنی منظوم اور منثور تصانیف میں کی اور اپنے طرزِ
ل میں اُن صفات کو عملی جامہ پہنایا۔ ان کی نظر میں ہندوستان زمین پر خلدِ
یں تھا۔ اس ملک کے لوگ، اُن کے علوم، فنونِ لطیفہ، یہاں کی آب و ہوا،
ہم، پھل پھول، چرند و پرند، عمارتیں، قلعہ ندی اور دریا، سماجی اور مذہبی رسوم
ں کہ ہر چیز دوسرے ملکوں پر فوقیت اور برتری کی حامل تھی۔ ہندوستان کی سرزمین
ے امیر خسرو کو اس لیے جذباتی لگاؤ تھا کیوں کہ اُن کا جنم اسی سرزمین پر ہوا تھا۔
ن کی والدہ ہندی نژاد تھیں۔ وہ بھی اسی ملک میں پیدا ہوئیں۔ اور اسی آب
ہوا، تہذیب و تمدن میں پل کر وہ بڑی ہوئیں۔ اس وجہ سے ان کے رگ و
ے میں ہندوستانیت معنوی اور ظاہری دونوں لحاظ سے سرایت کر چکی تھی۔ امیر
رو پر ان کا بہت گہرا اثر تھا۔ امیر خسرو نے بیرونی ممالک سے اپنے آبائی تعلقات

کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ ہندوستانی تہذیب کی معنوی روح کو صحیح اور
گہرے انداز میں جذب کیے بنا اور اُن اقدار کو اچھی طرح سمجھے بغیر جن کی وہ حمایت
کر رہے تھے، یہ رجحان ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

"خزائن الفتوح" کی بعض عبارتوں کے مطالعہ سے بادی النظر میں ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ امیر خسرو متعصب اور راسخ مذہبی آدمی تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس
ہے۔ اس سلسلے میں سومنات کے بارے میں اُن کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔[1]

امیر خسرو کے آبا و اجداد کا اصلی وطن کش شہر تھا جو بعد میں قبۃ الخضر (شہر سبز) کے
نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان کا تعلق ہزارہ قبیلہ سے تھا۔ اور یہ قبیلہ ہزارہ لاچین
کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ یہ قبیلہ نسلاً ترک تھا۔ چوں کہ خسرو کے والد امیر
سیف الدین محمود بھی اس قبیلہ کے ایک فرد تھے۔ اس لیے خسرو نسلاً ترک ہوئے۔

ہندوستان آنے کے بعد امیر سیف الدین محمود کی شادی عماد الملک[2] کی بیٹی
سے ہوئی اور ۱۲۵۲ء یا ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ہی میں خسرو تولد ہوئے۔

خسرو نے اپنے ہندی نژاد ہونے کا خود ذکر کیا ہے اور حب الوطنی کی دلیل
اس طرح پیش کی ہے۔

ہست مرا مولد و ماوی و وطن

دوسری ایک جگہ خسرو نے جہاں اپنی عربی دانی کا ذکر کیا ہے وہاں اس بات
کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ ان کے عربی کلام میں وہ شیرینی اور حلاوت نہیں ہے
جو ایک عرب یا عربی داں کے ہاں پائی جاتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ
وہ ہندی نژاد ترک تھے۔

"خزائن الفتوح" روضۂ ہندوستان کہ فردوس‌ترین ولایت او بہار است"۔ ۴۴ [2] "خزائن الفتوح" (فارسی)۔ ۵۲

سلطان التمش کے ممتاز امیروں میں عماد الملک کا شمار ہوتا تھا۔ وہ رشتی اور بلبنی میں تیس سال تک وہ "عارض ممالک" کے عہدے پر رہے اور دور شمسی میں حکومت کو استحکام
پانے میں انھوں نے بڑا اہم حصہ لیا۔ بقولِ خسرو، ان کے نانا کا شمار تخت کے چار ارکان میں ہوتا تھا اگرچہ وہ کوئی شان یا دشاہت نہ رکھتے تھے لیکن بادشاہوں کو تخت پر بٹھایا
تے تھے اور اپنی جود اور سخا سے تمام ہندوستان کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ پان کھانے کے بڑے شائق تھے اور ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری نہ دارم کز عرب گویم سخن

رفتہ رفتہ خسرو نے تمام مروّجہ علوم و فنون پر قابلِ قدر قدرت حاصل کر لی تھی جیسا کہ ان کی منظوم اور منثور تصانیف سے عیاں ہے وہ مذہب، تصوف، فقہ، نجوم، ہیئت اور صرف و نحو میں غیر معمولی درک رکھتے تھے۔[1] انھیں عربی زبان و علم و ادب سے اچھی خاصی واقفیت حاصل تھی سنسکرت زبان بھی جانتے تھے[2] مزید برآں ہندوستان کی علاقائی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ کیوں کہ انھیں سلاطین کی معیت میں مختلف صوبوں اور علاقوں میں جانے، وہاں قیام کرنے، وہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے اور وہاں کے رسوم سے واقفیت حاصل کرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ علم موسیقی میں ان کی مہارت مسلمہ تھی جس کا بعد میں مجملاً ذکر کیا جائے گا۔ تاریخ دانی میں انھیں ملکہ حاصل تھا، تاریخی واقعات کو بڑی صحت، خوبی، جامعیت سے بیان کیا ہے۔ شاعر ہوتے ہوئے بھی تاریخی واقعات کے بیان میں انھوں نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ مختصراً وقت کے ساتھ ساتھ ان کا افقِ علم و معرفت وسیع ہوتا گیا اور جذبۂ حب الوطنی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

شیخ نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو

انسانی زندگی کو دو اہم شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دنیاوی اور روحانی دنیاوی زندگی گھر کے ماحول اور زمانے کے حالات سے متاثر ہوتی ہے اور روحانی زندگی پر روحانی پیشوا اثر انداز ہوتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں ایک ایسا بھی وقت آتا ہے جب انسان مادی زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور اس بیزاری کے عالم میں روحانی زندگی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ یہی حال امیر خسرو کی زندگی کا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ امیر خسرو ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ درباروں سے وابستہ رہے اور بڑی دولت اور ثروت کے مالک رہے۔ عزت او رتوقیر میں محسودِ زمانہ تھے لیکن بقولِ دولت شاہ سمرقندی باوجود اس دولت و حشمت کے وہ اس زندگی سے بیزار تھے اور آخری زمانہ میں بار بار ملازمتِ درباری سے سبکدوشی چاہتے تھے لیکن سلاطین نے ہمیشہ انھیں اس بات سے باز رکھا آخر میں انھوں نے ملازمت ترک کر دی اور فقراء کی خدمت میں لگ گئے اور شیخ نظام الدین اولیا کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے سالہا سلوک کی جادہ پیمائی میں لگے رہے۔[4]

شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے اور شیخ سے قریبی تعلق نے امیر خسرو کے دل میں رواداری اور بے تعصبی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ امیر خسرو نے اپنے روحانی پیشوا کی تقلید میں ہندو مسلم تہذیبی ہم آہنگی اور حب الوطنی کا ایک اہم کام شروع کیا۔ انھوں نے اپنے اس مشن کی اشاعت کے لئے اپنی تصانیف کا استعمال کیا۔ ان کا منظوم کلام اور منثور تصانیف میں یہ جذبہ روشن و عیاں ہے۔

امیر خسرو کی وطن پرستی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی تصانیف میں بالعموم اور مثنوی "نہ سپہر" میں بالخصوص ایک مستقل باب ہندوستان کے فضائل کے بیان کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اور اس فضیلت کے ثبوت میں دس مختلف وجوہ اور دلائل پیش کئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ براہین اور دلائل سے امیر خسرو نے ہندوستان کی علمی فضیلت کو ثابت بھی کیا ہے۔ اور ہندو مذہب کا، اسلام کے علاوہ دوسرے تمام عالمی مذاہب سے مقابلہ کیا ہے اور ہندو مذہب کو ترجیح دی ہے۔ کہتے ہیں۔

برہمن از ہستی او ماندہ نفس — از ثنوی کش بہ دوی رفتہ دلبس[3]
عیسویان زوج و ولد بستہ بر د — ہندو ازیں جنس نہ پیوستہ برد
قوم مجسّم رقم جسم زدہ — برہمنان نے دم ازیں قسم زدہ
اختریان ہفت خدا بردہ گمان — گفتہ یکے ہندو ثابت ہمان
قوم مشبہ سوئے تشبیہ شدہ — ہندو ازیں پاش بہ تنزیہ شدہ
خلق دگر نور و ظلم خواندہ بدل — ہندو ایں باہمہ پیوند گسل

یعنی ثنوی فرقہ خدا کو دو مانتا ہے، اس کے برخلاف ہندو خدا کو ایک مانتے ہیں عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس طرح کے عقیدوں کے قائل نہیں ہیں۔ فرقہ مجسّم، خدا کو صاحب جسم مانتا ہے، لیکن ہندو ایسے اعتقاد سے مبرا ہیں۔ ستارہ پرست، سات خدا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس عقیدہ کے پیرو نہیں ہیں۔ فرقہ مشبّہ خدا کو ممکنات سے تشبیہ دیتا ہے۔ ہندو اس کے منکر ہیں۔ پارسی، نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں لیکن ہندو اس خیال سے پاک ہیں۔ اس کے بعد بت پرستی پر طعنہ زنی کرنے والوں سے امیر خسرو کہتے ہیں کہ دوسروں کو اس طرز عبادت سے سبق لینا چاہئے کیوں کہ اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندو بڑے راسخ العقیدہ لوگ ہیں۔[5]

ہندوستانی علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو لکھتے ہیں کہ فقہ کے علاوہ اس ملک کی مختلف شاخوں کی کتابیں اس مرتبہ کی ہیں جیسی کہ یونان میں ارسطو کی، منطق، علم نجوم، ریاضیات اور ہیئت کے علوم میں ہندوستان کے ماہرین زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ بڑے تعلیم یافتہ برہمن اس ملک میں موجود ہیں لیکن کسی بھی شخص نے ان کے اس گہرے مطالعہ سے فیض حاصل نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ملکوں میں انھیں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔[6] میں نے ان لوگوں سے کچھ تحصیل علم کیا ہے اور اسی بنا پر میں ان کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔ مابعد الطبیعاتی علم میں

---

[1] مقدمہ دیوان "غرۃ الکمال"۔
[2] امیر خسرو نے منظوم اور منثور تصانیف میں اپنی ہیئت دانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور علم ہیئت کی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "خزائن الفتوح" (فارسی) ۴۸ - ۴۹
[3] "نہ سپہر" آنست زبانے بہ صفت دروری از عربی بکر و برتر ز دری ر ۱۸۱
[4] "تذکرۃ الشعراء" ۱۰۹ [5] "نہ سپہر" (کلکتہ ۱۹۱۸) ۱۶۳ - ۱۶۵۔
[6] اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری — از وے بیاموز پرستش گری

ہندوؤں نے یہ طریقہ ترک کر دیا ہے لیکن مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی اس علم سے نابلد ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے مذہب کی پیروی نہیں کرتے ہیں تاہم ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں۔ وہ اللہ تعالےٰ کی وحدت کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ میں صفر سے چیز کے پیدا کرنے کی قدرت ہے وہ تمام چیزوں اور ساری مخلوق، آدمی، جانور، اور سارے لوگوں کا قادرِ مطلق ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ لہٰذا متکلمین، عیسائیوں، زرتشتیوں اور منکروں سے برہمن کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ حالاں کہ وہ پتھروں، سورج، جانوروں درختوں کی پرستش کرتے ہیں لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ ان سب چیزوں کا خالق خدا ہے وہ ان اشیاء کو خدا کی تمثیل سمجھتے ہیں۔ ان فیرمانداروں کا وہ خود کو مطیع نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ پرستش کا یہ طریقہ قدیم الایام سے ان کے ہاں مروّج ہے۔ وہ اس کو ترک کرنے سے مجبور ہیں۔[1]

ہندوستان سے محبّت کی وجہ

مثنوی "نہ سپہر" میں وہ ہندوستان کا راگ الاپنے میں وارفتہ اور بے خود ہو جاتے ہیں اور اسی عالم میں کہتے ہیں۔

حکمت و دانائی و علم و ہنر　　وانچہ کہ در ہند معانیست دگر

اس کے بعد کہتے ہیں کہ مجھے ہندوستان سے اس لئے والہانہ محبت ہے کہ یہ میرا مولد اور وطن ہے اور اپنے اس جذبہ کی تائید میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ حبُّ الوطن من الایمانُ

حبِ وطن ہست ز ایمان بیقینؔ[2]

پھر وہ ہندوستان کو ایک جنتِ ارضی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے سات وجوہ بیان کرتے ہیں۔

کشورِ ہند است بہشتے بزمیں　　حجتش اینک برِ صفحہ ببیں[3]

حجتِ ثابت چو دراں نیست شکے　　ہفت بگویم بہ درستی نہ یکے[4]

ہندوستان کی آب وہوا

محمد سلیمان اشرف لکھتے ہیں۔

"وہ شاعری پر ملک کی آب وہوا کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو چیزیں کہ نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں اور خصوصیاتِ ملکی جس طرح کے جذبات وکیفیات قلوب میں پیدا کرتی ہیں، اسی کو شاعری کا مایۂ خمیر سمجھنا چاہئے اسی لئے ہر ملک کا باشندہ اپنے پسند کا معیار جداگانہ رکھتا ہے۔ ایک ہندی عاشق زلفِ معشوق کی تشبیہ وتوصیف میں بجوز سے اڑاتا ہے۔ برسات کی رات اور کالی گھٹا کو اس کا عکس بتاتا ہے"[5]

ہندوستان کی آب وہوا کا گہرا اثر خسرو کے کلام میں پایا جاتا ہے اور یہاں کی آب وہوا کو خسرو خراسان اور دوسرے ملکوں کی آب وہوا سے بہتر بتاتے ہیں اور اس بات کے لئے دس دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) یہاں کی سردی نقصان دہ نہیں (۲) ہندوستان کی گرمی خراسان کی سردی سے بہتر ہے (۳) سرد ہوا کے خوف سے یہاں کے غربا کو سردی کے زیادہ سامان کی ضرورت نہیں ہوتی (۴) سال بھر تک یہاں گل وگل کی بہار رہتی ہے (۵) یہاں کے پھول گل بابونہ کی طرح خوش رنگ ہوتے ہیں (۶) ہندوستان کے پھول سوکھ جانے پر بھی خوشبو دیتے ہیں (۷) یہاں آم، کیلا، الائچی، کافور اور لونگ جیسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں (۸) خراسان کے بہت سے میوے اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہاں کے میوے خراسان میں نہیں ہوتے (۹) یہاں کے نادر تحفے پان اور کیلا ہیں (۱۰) پان جیسا دنیا میں دوسرا کوئی میوہ نہیں[6]۔

ہندوستانی موسم

امیر خسرو نے اپنی مثنویوں اور قصائد میں ہندوستان کے موسموں، مثلاً موسم بہار فصلِ خزاں، برسات کی رات اور صبح وشام کی کیفیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ فصلوں اور موسموں کا تغیر، صبح وشام اور رات اور دن کا ہونا ہر جگہ ایک نئے پیرائے میں بیان کیا ہے مثلاً خزاں کے موسم کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جب فصلِ خزاں نے چمن میں گھر بنا لیا تو بادِ رواں گلزار میں اپنا گھوڑا گدانے لگی۔ گلِ ریحان جو پھولوں کا بادشاہ کہلاتا ہے اس کو نکال دیا۔ اب چمن کے اندر اس کی حکومت نہ رہی۔

فصلِ خزاں چوں بہ چمن خانہ ساخت　　بادِ وزاں کرہ بہ گلزار تاخت

شاہِ سپر غم ز ولایت براند　　کش بہ چمن ہیچ ولایت نماند

ہندوستانی جانور اور پرند

امیر خسرو نے چرند اور پرند کو اپنی محبت سے محروم نہ کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس ملک کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں، مینا عرب وعجم میں نہیں پائے جاتے اور یہ پرند بھی آدمی کی طرح بول سکتا ہے۔ کوا مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ گوریّا، اپنی آواز، پرواز وغیرہ میں عجیب وغریب ہے۔ دوسرے بہت سے عجیب وغریب پرند اس ملک میں بھرے پڑے ہیں طاؤس اپنی خوبصورتی میں دلہن کی دلربائی رکھتا ہے۔ یہاں بگلے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب وغریب کرتب دکھانے لگتے ہیں۔ یہاں پانی بھرنے والے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ پرندوں کے بعد پانچ جانوروں کے اوصاف بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایک ایسا جانور ہوتا ہے جو ہرن کے مانند اور گیدڑ کی

---

[1] مثنوی نہ سپہر، ۱۶۱ - ۱۶۵ [2] ایضاً، ۱۴۹ - ۱۵۰ [3] مثنوی دول رانی خضر خاں میں کہتے ہیں۔

بہشتے فرض کن ہندوستاں را　　کز انجانسبت است ایں بوستاں را　　وگر نہ آدم وطاؤس زانجاتے　　کجا اینجا شدندی منزل آراتے۔

[4] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثنوی "نہ سپہر" ۱۴۹ - ۱۵۰ [5] مقدمہ "ہشت بہشت" ۲۳ - ۲۴ [6] مثنوی نہ سپہر، ۱۵۰ - ۱۶۱ [7] قرآن السعدین ۱۵۸ برائے فصلِ بہار ملاحظہ ہو۔ ایضاً ۲۱۰، دول رانی وخضر خاں۔ خسرو کہتے ہیں کہ بعض لوگ آم کو انجیر پر ترجیح دیتے ہیں۔ دگر کس سوئے نو دگر دو جہت گیر　　نہد کم نغز کی ماوا از انجیر، ۴۳

طرح ہوتا ہے گھوڑا، بجری، بندر اور ہاتھی۔[1]

ہندوستانی معمار

امیر خسرو نے جب ہندوستان کی قدیم عمارتوں کو دیکھا تو وہ اس ملک کے معماروں اور سنگ تراشوں کی فنکاریوں سے بہت متاثر ہوئے اور بڑی فراخدلی سے اُن کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

یہاں کے سنگ تراش جو اپنے فن میں فرہاد کو مات کرتے تھے۔ پتھروں کو ایسا صاف اور چکنا بنا دیتے تھے کہ ان کی سطح پر سے خیال کا پاؤں بھی پھسل جائے۔ دلی کے معمار جو فنِ عمارت میں لقمان منذر کو بھی جاہل محض سمجھتے تھے ایک پتھر کو دوسرے سے ایسی صفائی سے جوڑ دیتے تھے کہ اندیشہ رازی بھی ان کی درازوں میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔[2]

ہندوستان کی زبانیں

اس زمانے میں اس ملک میں بولی جانے والی اور مقامی زبانوں میں امیر خسرو دہلی ترکی اور فارسی کے ساتھ سندھی، ہندوی، لاہوری، گجراتی، کشمیری، کبرتی، دھور سمندری، تلنگی، گجری، معبری، گوری، بنگالی، اودھی اور سنسکرت کا ذکر کرتے ہیں سنسکرت کو عربی سے کمتر اور فارسی سے برتر بتایا ہے سنسکرت زبان میں فارسی سے کسی طرح حلاوت اور شیرینی کم نہیں۔[3]

ہندوستان کے بعض شہروں کا بیان

جن شہروں میں امیر خسرو کو قیام کرنے یا دیکھنے کا موقع ملا اُن کی توصیف بیان کرنے میں انھوں نے خوب زورِ قلم دکھایا ہے اور ان شہروں کے ذرّہ ذرّہ میں انھیں ایسی خوبی اور دلکشی نظر آتی ہے کہ جیسی دنیا کے کسی دوسرے شہر میں نہیں پائی جاتی۔

دلّی

دلّی اور دلّی کی عمارتوں، باغوں، پھول پھلوں اور وہاں کے باشندوں وغیرہ کا ہمیشہ کے لئے دل آویز موضوع ہے۔ اس کارنامے میں خسرو کا فخر بجا ہے۔ دلّی کی محبت خسرو کے رگ و پے میں اس لئے سرایت کر گئی تھی کہ اس شہر میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ دلی اسلامی اور ہندو تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی اور اس شہر میں علمی، ادبی، تہذیبی اور دیگر فنون کی سرگرمیاں پائی جاتی تھیں۔ مزید برآں دلّی میں اس لئے بھی جاذبیت اور کشش پائی جاتی تھی اور وہاں شیخ نظام الدین اولیاء سکونت پذیر تھے اور ان کے فیضان اور رحمت کے چشمے ملک کے دور دراز واقع علاقوں کو سیراب کر رہے تھے تشنۂ معرفت دور دور سے کشاں کشاں، پروانہ وار دہلی کی طرف چلے آ رہے تھے۔ دلّی سلاطین دہلی کا دار الخلافہ تھا، اس لئے پُر شکوہ، پُر عظمت اور خوبصورت عمارتوں سے آراستہ و پیراستہ؛ شعر و شاعری کا چرچا اس قدر تھا کہ بقول امیر خسرو جس پتھر کو بھی اٹھاؤ اس کے نیچے سے ایک شاعر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ یہی وہ دلّی جو خسرو کی نظر میں بغداد، مصر، خراسان، خطا، تبریز، ترمذ، بخارا اور خوارزم وغیرہ پر سبقت رکھتی تھی۔

دہلی سے دور ملتان میں قیام کے دوران انھوں نے ملتان کے مقابلے میں اس شہر کو بہشت زار بتایا ہے۔ دہلی کو یاد کر کے بیکل ہو جاتے ہیں، اور کہتے ہیں۔

"ایک وہ زمانہ تھا کہ میرا مسکن قبۃ الاسلام تھا جو ہفت اقلیم کے بادشاہوں کا قبلہ ہے یعنی وہ دہلی جو ہمشیرۂ آسمان ہے اور روئے زمین پر بہشت بریں کا ایک ٹکڑا ہے۔ نو آسمان اس پر اپنا مبارک سایہ ڈالے ہوئے ہیں اور ہفت اقلیم اس کے دروازے کا حلقہ ہیں۔ اس کے بلند قصر آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور سورج پر بھی سایہ ڈالتے ہیں اور اس کے بازار میں آدمیوں کا اتنا اژدہام رہتا ہے کہ مردمِ چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی۔ اس کے سرسبز میدانوں میں پھول کھل رہے ہیں اور اس کے چشمے چمکدار آنکھوں سے بھی زیادہ صاف اور روشن ہیں جن کا بہتا ہوا پانی آبِ حیات کی طرح خوش گوار اور نباتات میں سے بہتے ہوئے دودھ کی طرح شیریں ہے۔ حوضِ سلطانی ایسا روشن کہ معلوم ہوتا ہے کہ چاندنی کو پگھلا کر پتھر میں ڈال دیا ہے۔ اس کے باغات میں تماشائیوں کا ہجوم، جن میں سے ہر ایک لالہ رخسار رہتا۔

گوش کی وہ چمک دمک کہ کان کے موتیوں کی آب کو بھی ماند کرے۔ عود و رباب کے نغمے اس کے باغوں میں بلند ہوتے ہیں ایسے شیریں کہ درخت مخمور ہو جائیں۔ اور چشمے اونگھنے لگیں۔ وہاں میرے دن سیر اور تماشے میں اور راتیں ایک محبوب کی صحبت میں بسر ہوتی تھیں۔"[4]

ایک دوسرے موقع پر دہلی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ عدن کی جنت ہے، اپنی خصوصیات اور صفات میں باغِ ارم کے مانند ہے۔ اس بوستان کے قصے کو سن کر مکہ بھی ہندوستان کا طواف کرنے لگے اور اس شہر کی شہرت سن کر مکہ بہرہ ہو جاتے۔ یہ پہاڑی پر آباد ہے۔ اس کے اردگرد دو میل تک باغات لگے ہوئے ہیں۔ جمنا سے ان کی آبیاری ہوتی ہے۔[5] شہر کے پرانے قلعوں اور قلعوں کے ساتھ ساتھ حوالی شہر میں واقع تلپت، اندرپت، بہارپور اور افغان پور کا بھی ذکر ملتا ہے۔ دہلی کے باشندے فرشتہ سیرت اور جنت میں

---

[1] مثنوی "نہ سپہر" ۱۸۱۔۱۹۱؛ "خزائن الفتوح" ۸، ۹، ۱۱۷، ۱۱۲، ۱۱۹۔ [2] "خزائن الفتوح" ۲۳

[3] مثنوی "نہ سپہر" ۱۷۸۔۱۸۱ نیز مثنوی "دولرانی خضر خاں" ۳۱۔۳۲ [4] "خزائن الفتوح" میں مدینۃ الاسلام لکھا ہے۔

[5] حوضِ شمسی یا قطب صاحب کا تالاب۔ سلطان التتمش نے ۱۲۲۹ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ملاحظہ ہو آثار الصنادید (دہلی ۱۹۶۵ء) ۲۰، ۱۲ "قران السعدین" ۲۲۔۲۳

[6] دیوان "تحفۃ الصغر" [7] "قران السعدین" ۲۸۔۲۹

رہنے والوں کی طرح خوش دل اور خوش خو ہیں۔ صنعت علم و ادب آہنگ۔
نیزہ و پیکان اور تیر اندازی کے فن میں بے بدل ہیں۔[1]

پھر دہلی کے سادہ لوح محبوبوں اور ہنچوں کے ناز و غمزہ کا ذکر کرتے ہیں۔
"شوخ اور حسین ہندزاد محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کے پرستار ہو گئے ہیں۔

خورشید پرست شد مسلماں — زین ہندوکان شوخ و ساده[2]

دہلی کی آب و ہوا خسرو کو بہت پسند خاطر تھی۔ دہلی کا پانی خراسان کے پانی سے بہتر تھا۔ دہلی کی ہوا گرم ضرور تھی لیکن اس کی وجہ جذبۂ محبت تھا۔ آفتاب کو یہاں سے عشق ہو گیا تھا اور اس عشق کی گرمی نے یہاں کی آب و ہوا کو گرم کر دیا تھا[3] دہلی کا خربزہ بہشت کے تمام پھلوں سے بازی لے گیا تھا۔ اس میں قند جیسی مٹھاس پائی جاتی تھی۔

خربزہ گوئی کہ بہ صحرا کشت — گوئے ربود از ثمرات بہشت[4]

اجودھیا

امیر خسرو، خان جہاں امیر علی، حاکم اودھ کے ساتھ اجودھیا میں دو سال تک رہے تھے اور اس شہر کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔
"بلاشبہ اودھ کا ملک بہت خوش گوار ہے۔ درحقیقت یہ شہر باغ کے مانند ہے جہاں لوگ امن و امان اور خوش حالی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی زمین خیا کے لئے زینت ہے اور اس کے قرب و جوار میں اسباب طرب جمع ہیں۔ اس کے قریب سے دریائے سرجو گزرتا ہے جس کی روانی دیکھنے والوں کی پیاس بجھا دیتی ہے۔ خوشی کے تمام ضروری لوازمات یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کثرت سے پھول اور شراب مہیا ہے۔ باغوں میں درختوں کی شاخیں پھلوں سے بوجھل ہیں انگور، کھٹے سیب، نارنگی اور متنوع درختوں کے پھل جن کے ہندوستانی ہیں، میٹھے اور ذائقہ دار۔ مثلاً کیلے اور آم انسانی دماغ کو تراوٹ بخشتے ہیں۔ پرندوں کے ریلے اور آواز ان نغموں سے فضا گونج رہی ہے۔ کپڑے ایسے کہ عمر گزشتہ کو واپس لے آئیں۔ تن کی زینت اور بدن کا زیب مثلاً جھنر تلی اور بہاری کہ موسم بہار کا ایک جش نما تحفہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور بدن پر ایسے ہلکے معلوم ہوتے ہیں جیسے لالے پر مدنی یا صبح کے وقت گلاب پر قطرۂ شبنم۔ یہاں کے لوگ خوش اطوار، نیک نفطرت والے اور وسیع النظر ہیں"[5] یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس زمانے میں اجودھیا کی آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔

دیوگیر

جس زمانے میں ملک کافور نے تسخیر دکن کے لئے کوچ کیا تو خسرو اس کی معیت میں دکن گئے اور دیوگیر شہر کو بچشم خود دیکھا بقول ان کے وہ شہر اپنی تازگی اور لطافت میں قصر شداد سے بھی بازی لے گیا تھا۔ یہاں تک کہ مصر نے اس کی شہرت سن کر اپنا جامہ اتار کر دریائے نیل میں ڈال دیا تھا۔ اور بغداد دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اس کی ہوا جنت کی تھی۔ جس کی خوشبو سے تمام پھول معطر ہوتے تھے۔ ہر بازار ایک باغ معلوم ہوتا تھا جہاں جوہری اور صراف سونے چاندی کے سکوں کے ڈھیر سامنے لئے بیٹھے تھے۔ ہر قسم کے کپڑوں کے تھان کے تھان، جو ہندوستان میں بہار سے لے کر خراسان تک کہیں بھی نہیں مل سکتے تھے، ان دکانوں میں موجود تھے۔[6]

اس کے بعد امیر خسرو نے اس دیار کے پھولوں اور پھلوں کی تعریف بیان کی ہے اور موسیقی کی تعریف میں تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "یہاں کے نغمہ سے مردہ بھی زندہ ہو سکتے تھے"۔[7]

مجملاً امیر خسرو نے ان تمام شہروں کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے دیکھے تھے۔ مولا بالا شہروں کے علاوہ انھوں نے ملتان اور وارنگل کی تعریف بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

شہروں کے علاوہ خسرو نے بعض ہندوستانی قدیم قلعوں کا بھی ذکر کیا ہے اُنکی خوبصورتی، مضبوطی اور تعمیری محاسن کو بیان کیا ہے۔ قلعہ جہائین دریہ قلعہ رنتھمبور کے قریب واقع تھا اور سلطان جلال الدین نے تسخیر کیا تھا) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ قلعہ آسمان کی طرح بلند تھا، سنگ خارا سے منقش تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ہندوؤں کی بہشت ہو۔ در و دیوار کی تصاویر مانی کو شرمندہ کرتی تھیں۔ پتھر کی سینکڑوں ایسی مورتیاں دیکھنے میں آئیں جو موم سے بھی نہیں بنائی جا سکتی تھیں اس کے باغ میں بہت سے مندر تھے جن پر سونے چاندی کے کلس تھے۔[8]

ہندوستانی کپڑے

ہندوستان میں جو کپڑے بنتے تھے وہ قدیم الایام سے اپنی نزاکت، لطافت، خوبصورتی اور باریکی کے لئے مشہور تھے۔ امیر خسرو کہتے ہیں کہ وہ اتنے باریک ہوتے تھے کہ پہننے پر جسم نظر آتا تھا اور بعض کپڑے تو ایسے بھی تھے کہ لپیٹو تو انگلیوں کے ناخن میں آ جائیں اور اگر کھولو تو بہت بڑا امتحان ہو جائے۔[9] دیوگیر نامی کپڑے کی خوبی یہ تھی کہ یہ آفتاب ماہتاب یا سایہ معلوم ہوتا تھا۔[10]

ہندوستانی عورتیں

اب خسرو ہندوستانی عورتوں کے حسن کے بیان کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہاں کی عورتوں کا حسن مصر، روم، قندھار، سمرقند، خطا، ختن اور بلخ اور دنیا کے تمام حسینوں کے حسن پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہاں کے حسن میں گوناگوں صفات پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد امیر خسرو نے دنیا کے دوسرے ملکوں کے حسینوں کے حسن کی خامیوں کا ذکر کیا ہے اور تقابل کے بعد ہندوستانی حسن کی افضلیت کو ثابت کیا ہے۔[11]

بتانِ ہند را نسبت ہمیں است
ہر یک ہوئے شاں صد ملک چین است

---

[1] ایضاً۔ ۲۹۔ ۳۰، ۳۴۔ ۵۹۔۵۰ [2] ایضاً ۲۲۔ ۳۴ [3] ایضاً ۱۰۹۔ [4] اعجاز خسروی "نول کشور"، نیز غرۃ الکمال [5] برائے تفصیل ملاحظہ ہو خزائن الفتوح "۱۲۴۔ ۱۲۵، دیوان نہایۃ الکمال (۱۹۱۳) ۵۰۔۵۲ [6] مثنوی دولرانی و خضر خاں ۲۳۳ [7] مثنوی مفتاح الفتوح مرتبہ پروفیسر شیخ عبدالرشید علی گڑھ ۱۹۵۴) ۳۱۔۳۲ [8] قرآن السعدین ۶۰ [9] مثنوی دولرانی خضر خاں ۴۴ [10] مثنوی سپہر [illegible]

ہندوستانیوں کی وفاداری

ہندوستان کی دوسری خصوصیات کے علاوہ امیر خسرو نے اس ملک میں ایک ایسی خوبی پائی تھی کہ جو دنیا کے کسی ملک یا قوم میں آج بھی نہیں ملتی کجا کہ تیرہویں صدی عیسوی میں یہ تھی ہندو عورت اور مرد کی وفاداری۔ وہ کہتے ہیں۔

"ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے کھیل سکتا ہے اور ہندو عورت اپنے شوہر کی محبت اور وفاداری میں اس کی چتا میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ ایک ہندو مرد اپنے دیوتا اور آقا کے لئے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے" خسرو کہتے ہیں کہ "اسلام میں ان باتوں کی اجازت نہیں تاہم یہ باتیں قابل ستائش ہیں اگر اسلام اس کی اجازت ہوتی تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں دے دیتے۔"

"اگر بت پرستی سبق آموز ہے تو بقول خسرو آتش پرستی اس سے کسی لحاظ سے بھی کم اہمیت نہیں رکھتی ہے اور اس عمل سے ہمیں سبق ملتا ہے۔ ایک آتش پرست ہندو کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ہندو سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی کیوں پوجا کرتا ہے اس کے جان کیوں دیتا ہے، تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ آگ کو دیکھ کر وصل کی امید فروزاں رہتی ہے اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے"[۱] اس جذبے کی قدر کرنے کا خسرو نے اس لئے نمونہ دیا ہے کہ صوفیا نے صادق محبت الٰہی کی آگ میں جل کر واصل بالحق ہوتے ہیں۔

لڑکی کی ولادت

ہندوستان کے محاسن کی امیر خسرو نے ثنا خوانی کی ہے لیکن بعض باتوں کی مذمت بھی کی ہے جو کسی بھی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً قدیم الایام سے ہندوستان میں لڑکی کی ولادت کو ناگوار سمجھا جاتا رہا ہے اور ادنیٰ طبقوں میں آج بھی یہی صورت حال ہے۔ امیر خسرو نے ایسے باطل خیالات کی تردید کی ہے اور لکھتے ہیں کہ "عورت کا وجود بنی نوع آدم کی افزائش کے لئے مرد سے زیادہ اہم و نازک ہے جس سے تعریف کرنے والا انسان پیدا ہوتا ہے تو پھر انسان کو جس کی بدولت کرامت انسانی حاصل ہوتی ہے اس کے وجود کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا ہرگز روا نہیں"[۲]

شادی بیاہ کے رسوم

مہاجرین مسلمانوں نے جب اس ملک میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تو رفتہ رفتہ ہندوؤں سے ان کا میل جول بڑھنے لگا۔ ہندوستانی عورتوں سے شادی بیاہ ہونے لگے۔ نتیجتاً ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کے عمدہ عناصر اپنا لئے اور تہذیبی یکجہتی کا کام شروع ہو گیا جو دن بدن ترقی کرتا رہا۔ مسلمانوں نے شادی بیاہ کے رسوم بالخصوص اپنا لئے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کی شادی کے موقع پر جو رسوم ادا ہوتے تھے وہ نکاح کے سوا، سارے کے سارے خالصتاً ہندوستانی تھے[۳]

امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی

امیر خسرو ہندوستانی موسیقی میں دسترس رکھتے تھے اور بعض راگ راگنیوں کے موجد بھی تھے۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ امیر خسرو علم موسیقی سے واقف تھے۔[۴] خسرو نے خود بھی اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ان کا طریقہ یہ نہ تھا کہ وہ جھوٹے دعوے کریں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک قطعہ یہ ہے۔

> مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنج سخن
> علم موسیقی ز علم نظم نیکو تر بود[۵]

بلاشبہ خسرو کو ایرانی اور ہندوستانی فن موسیقی میں مہارت حاصل تھی۔ ان کی تصانیف میں فارسی اور ہندوستانی راگ اور راگنیوں کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے متعدد جگہ ہندوستانی راگ راگنیوں، الاپن، دھرپد وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ستار ایجاد کیا، مردنگ کو ڈھولک میں تبدیل کیا، ایرانی باجا طنبور کی بجائے بینا ایجاد کیا،[۶] ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں۔

"یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ انھوں نے ہندوستانی راگ میں بہت کچھ تصرفات کئے تھے، اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ وہ ایک نئے مسلک اور طریقے کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں ان کے اس طریقے کے پیرو نہ صرف ان کے اپنے زمانے میں تھے بلکہ اب تک بھی موجود ہیں"[۷]

خسرو کی ہندی شاعری

ان کے فارسی کلام میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ ملتے ہیں اور بالخصوص ہندی کلام تو خالصتاً ہندی زبان میں ہے۔ یہ مسئلہ ابھی تک معرض بحث میں ہے کہ آیا کہ جو ہندی کلام خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے وہ ان کا کلام ہے بھی یا نہیں؟ اس پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ خسرو نے ہندی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہوگی کیوں کہ امیر خسرو اس زمانے کے بہت سے عظیم الشان شاہی اشخاص کے درباری شاعر تھے لیکن انھوں نے عوام سے اپنا ناتا کبھی نہیں توڑا اور ان کو عوام کا شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک عوامی شاعر وہی شخص ہو سکتا ہے جو عوام کے جذبات اور افکار کی ترجمانی کرے۔ امیر خسرو شیخ نظام الدین اولیاء کی صلح کل کی تحریک میں شریک کار تھے۔ خسرو ہندوستان کی بیشتر اہم زبانوں سے واقف تھے اور ہندی ان کی مادری زبان تھی اس لئے عوام کے دلوں تک پہونچنے کے لئے امیر خسرو نے اپنی مادری زبان میں ضرور طبع آزمائی کی ہوگی اور صلح کل کا پیغام عوام کی زبان کے ذریعہ ہی ان تک پہونچایا ہوگا۔

امیر خسرو نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے ایک پیغام چھوڑا ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کی بقا کا انحصار وسیع المشربی، رواداری، وسیع النظری اور دوستی پر ہے۔ مذاہب دلوں میں دوری پیدا نہیں کرتے بلکہ دلوں کو جوڑتے ہیں۔ مذہب عشق اور اللہ کی تلاش سے زیادہ افضل کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے۔ باقی صفحہ

---

[۱] مثنوی نہ سپہر، ص ۱۹۴ - ۱۹۵ [۲] مثنوی دولرانی خضر خاں، ص ۱۹۵ - ۱۹۶ [۳] ہشت بہشت، عادات و رسوم ہند - ۲۶ - ۳۰ [۴] مزید تفصیل دیکھئے مثنوی دولرانی خضر خاں، ص ۱۸۰، ۲۴۰
[۵] تذکرۃ الشعراء ۱۰۷ [۶] البدیع مآثر، دیوان خسرو، غزل کشور، ۵۶۱ [۷] ہشت بہشت، مقدمہ ۲۲۰ [۸] امیر خسرو ۲۳۶ نیز دیکھئے شبلی نعمانی، شعر العجم [۹] حیات امیر خسرو ۲۹ - ۲۸ باقی صفحہ

حسن الدین احمد

امیر خسرو اور مسلک انسانیت پر چشتیہ سلسلہ کے اثرات

اس نظریہ سے خسرو کی شاعری کا خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا گیا کہ انھوں نے اپنے کلام میں انسان کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ اور انسان کا کیا مقام متعین کیا ہے۔ "خسرو شناسی" کا تقاضا ہے کہ ان کی انسان دوستی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے اور پھر ان کے خیالات کے سرچشمہ کو تلاش کیا جائے۔

اس موقع پر ہیومنزم یا مسلک انسانیت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ہیومنزم وہ فلسفیانہ تصور ہے جس کے بموجب انسان عالم فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس اور مجبور نہیں ہے بلکہ اپنا مستقل وجود عقل و ارادہ اور پیمانہ اقتدار رکھتا ہے اور کچھ حدود کے اندر اپنی زندگی اور اپنی سیرت جس طرح چاہے تعمیر کر سکتا ہے۔

خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے۔ وہ رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہیں جو "سوز و درد و داغ و جستجو و آرزو" سے عبارت ہے اس لئے ان کی شاعری میں انسانی جذبات کی ترجمانی بڑی شدت سے ملتی ہیں۔

من نمی دانم کہ چوں باشد پری
شکل تو باری مرا دیوانہ کرد

(میں نے پری تو نہیں دیکھی کہ کیسی ہوتی ہے لیکن تیری صورت نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔)

اس قسم کے ہزاروں اشعار ملتے ہیں جن میں احساسات زندگی کی بھرپور نمائندگی ہے۔

امیر خسرو نے ایسی طبیعت پائی ہے کہ ان کو اگر ایک طرف روحانی لگاؤ اور اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء سے کمال عقیدت ہے جیسا کہ حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

ہستی تو آن نظام کہ لوں خطاب تو
محراب راست کردہ برائے عبادت است
تو شمع صبح و شعلہ شوقی کہ از تو خواست
زان ہر یکے شرارہ چراغ ہدایت است

تو دوسری طرف وہ سماج سے بھی رشتہ جوڑے ہوتے ہیں۔ انسانوں کے باہمی تعلق اور رہن سہن سے متعلق وہ یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ۔

خسرو مگوی بد کہ دریں گنبد از صدا
خلق آنچہ گفتہ اند ہمانرا شنیدہ اند

(خسرو کسی کو بھی برا مت کہو کیوں کہ دنیا میں لوگ جو کہتے ہیں وہی انھیں خود بھی سننا پڑتا ہے)۔

طبیعت کی اس رنگا رنگی نے ان کی شخصیت کو انفرادیت عطا کی ہے۔

امیر خسرو کی اصل برتری یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی انسانی حقیقت کے معتبر ترجمان قرار پاتے۔ انسانی عظمت کا تصور امیر خسرو اور پھر بیدل کے ذریعہ اردو شاعری کو ملا۔ اردو کے اساتذہ میں میر۔ سودا۔ درد۔ نظیر۔ آتش۔ غالب۔ انیس سب انسانی عظمت کے علمبردار ہیں۔ اگر آج اردو شاعری عظمت انسانی کی علمبردار ہے تو یہ حضرت امیر خسرو کا طفیل ہے۔

سوائے شیخ سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گذرا جس نے خسرو کی طرح عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہو۔ اور جس کا نام زبان زد خاص و عام ہو۔ یہ صحیح ہے کہ سعدی فارسی غزل گوئی میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے تھے لیکن ان کی غزل میں وہ سوز و گداز اور جوش و خروش نہ تھا جو انسان کے جذبات کو ابھارے۔ خسرو کی طبیعت میں ایسی نیرنگی تھی جو انسان کو زندگی کے اسرار تک پہنچنے پر ابھارتی ہے۔ اور اس میں جامعیت کی خواہش پیدا کرتی ہے۔

امیر خسرو کا شمار اپنے زمانہ ہی کے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے ان کے جامع کمالات ہونے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے زندگی سے بھرپور دلچسپی لی۔ اور زندگی سے گوناگوں تجربے کئے۔ ان کو بنیادی طور پر حیات انسانی سے پیار اور لگاؤ تھا۔ اور یہی چیز ان کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

ہر دم کہ بخوشدلی برآید سرمایہ حاصل جوانی است

(جو وقت خوش دلی کے ساتھ گزر جائے۔ وہی جوانی کا حاصل اور سرمایہ ہے)

وقت نے حضرت امیر خسرو کے مقابلہ میں اپنی ہار مان لی ہے۔ وقت بڑا ظالم ہوتا ہے

وقت کی چکی بڑے بڑوں کی شہرت اور بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ انسان کے اعمال باقی رہ جاتے ہیں اور وقتی شان و شوکت اور بڑائی ختم ہوجاتی ہے۔ حضرت امیر خسرو کا شمار بلاشبہ ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق کہا گیا ہے۔

رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

امتداد زمانہ سے ان کے پیام کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے انسان بیدار ہوگا ان کے پیام کی اہمیت بڑھے گی۔ امیر خسرو کا پیام صلح و آشتی۔ محبت و اخوت کا پیام ہے آج انسانیت کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ شاید آج سے قبل اس پیام کی اتنی ضرورت کبھی نہ تھی۔ آج دنیا کو ان کے محبت بھرے اور دلوں کو جوڑنے والے نغموں کی ضرورت ہے۔

حضرت امیر خسرو حکومتی حلقوں میں رہتے ہوئے بھی عوام کے آدمی تھے۔ انھوں نے بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ رہتے ہوئے زندگی ایسے گزاری کہ۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ایسا انداز صرف وہی آدمی رکھ سکتا ہے جس کا ظرف بڑا ہو۔

حضرت امیر خسرو نے مسلک انسانیت پر زور دیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلک انسانیت کا تصور جدید مغربی فلسفہ کی دین ہے۔ لیکن یہ بات شائد کلیتہً درست نہیں ہے لیکن جس ابتدائی تخیل کے ارتقاء سے مسلک انسانیت کا موجودہ مفہوم وجود میں آیا وہ یقیناً بہت قدیم ہے۔ بالعبد تاریخ دور میں اسلام نے اس تخیل کو کافی بڑھاوا دیا قرآن شریف کو بجا طور پر عظمت انسانی کو تسلیم کرنے والی پہلی دستاویز اور منشور انسانیت قرار دیا جا سکتا ہے۔

قرآن شریف میں انسانوں کو خدا کا بندہ کہہ کر اس کی حیثیت کا نہ صرف تعین کر دیا گیا بلکہ اس کو تسلیم بھی کیا گیا۔ جب یہ کہا گیا کہ سب انسان خدا سے برابر فاصلہ پر ہیں اور سب انسانوں سے خدا کا رشتہ یکساں نوعیت کا ہے تو اس سے نہ صرف انسانی مساوات پیدا ہوئی بلکہ انسان کی بڑائی کا پہلو نہایت واضح انداز میں سامنے آیا۔

قرآن شریف میں بار بار بنی نوع انسان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ "ہم نے بنی نوع انسان کو عزت بخشی اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر فضیلت دی۔" زمین اور آسمان اور سب چیزیں جو زمین میں ہیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ ۲:۲۹ ۲۲:۱۱ اور ۲۹:۲۲ خدا نے رات اور دن سورج اور چاند کو انسان کے لئے مسخر کیا۔ ۱۲:۱۹ دریا کو اختیار میں دیا ۱۴:۳۲ چوپایوں کو انسان کے لئے بنایا وغیرہ۔ خدا نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں ۲:۳۴ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ۹۵:۴ کہہ کر انسان کی برتری اور بڑائی کا اعلان کر دیا۔ اور بھلائی اور برائی کے لئے انسان کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔ ۹۰:۱۰ ۹۱:۷ ۷۶:۲ ۲۹:۱۱۸

مندرجہ بالا باتوں سے کائنات میں انسان کی حیثیت ظاہر ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ہم ان کو کی پیش رو اور بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ امیر خسرو نے اپنے عہد میں قرآنی تخیل سے بھرپور استفادہ کیا اور اس کو اپنی شاعری کی زینت بنایا۔

یہاں اس علمی اور تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ آج ہم جس کو جدید یا مغربی تہذیب کہتے ہیں اس کی بنیاد دراصل اسلامی تہذیب ہی پر ہے۔

اسلامی تہذیب نے اپنی ترقی کے زمانہ میں مسلک انسانیت کے تصور کو بڑی حد تک ابھارا۔ اسلامی تصوف کا بھی اس تصور کو نمایاں کرنے اور ترقی دینے میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک روحانی مرتبہ کمال ہی انسانی زندگی کا منتہا ہے۔ تصوف انسان دوستی کی وہ تحریک ہے جس نے انسانوں کے درمیان تمام امتیازات کو فروعی مان کر انسان کو بحیثیت انسان اہمیت دی۔

خسرو نے اپنی شاعری میں انسان کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی بنیاد اسلامی تصوف کی ایک شاخ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پر رکھی۔

امیر خسرو کے نظریات کو سمجھنے اور ان کے مسلک انسانیت کی بنیادوں کی تلاش کرنے کے لئے ہمیں چشتیہ سلسلہ کے مسلک کو سمجھنا ہوگا۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ملفوظات سے اس سلسلہ کی جو نمایاں خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں ان میں انسان دوستی۔ خدمت خلق۔ مذہبی رواداری۔ غیر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ برابری کا سلوک۔ حکومت اور حکمراں طبقہ سے بے تعلقی اور دوری شامل ہیں۔

چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں معاشرتی لحاظ سے پسماندہ طبقات کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز تھیں۔ ان بزرگوں کا مقصد ہی خلق اللہ کی خدمت اور مصیبت زدوں کی اعانت تھا۔ مذہب۔ رنگ۔ نسل یا عقیدے کی کوئی قید نہ تھی۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے .... سب سے بڑی تبلیغی ضرورت یہ خیال فرما تھی کہ عوام سے ربط ضبط بڑھایا جاوے اور حکمراں طبقے نے جو فاصلے قائم کر رکھے ہیں ان کو حتی الامکان کم کیا جائے۔ ضرورت وقت نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کو ذریعہ عوامی بولی کے ذریعہ کی حیثیت سے ترویج دلائی۔ اسی طرح انھوں نے یہ محسوس فرمایا کہ قوالی کے ذریعہ بھی تصوف کے پیام کو عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

چشتیہ سلسلہ کے ایک عالی مرتبت نمائندہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا۔ "وہ شخص اللہ کو دوست رکھتا ہے جن کی سخاوت دریا کی سی سخاوت ہو جن کی شفقت آفتاب کی سی شفقت ہو اور جن کی تواضع زمین کی سی تواضع ہو یعنی بلا لحاظ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہو۔"

جب آپ نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنا جانشین مقرر کر کے دلی بھیجا تو یہ نصیحت فرمائی۔

"جو تمہارے ساتھ دشمنی کرے اس سے دوستی کا برتاؤ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا"

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا قیام دہلی کے باہر ایک گاؤں میں تھا۔ جو بعد کو کیلوکھری کہلایا۔ آپ نے عوام میں حد سے زیادہ مقبولیت حاصل کرلی۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو یہ بات ناگوار گزری۔ انھوں نے اپنے قدیم دوست خواجہ معین الدین چشتی سے جب کہ وہ دلی تشریف لائے تھے اس بات کا خاص انداز سے ذکر کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی نے یہ طے کیا کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنے ساتھ اجمیر لے جائیں گے۔ لیکن اہل دہلی نے وہ آہ و بکا کی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید اور خلیفہ حضرت بابا شیخ فریدالدین گنج شکر

تھے۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی اپنے مرید اور خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء کو یہ نصیحت تھی کہ دشمنوں کو رام کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور حقوق کی ادائیگی میں ہرگز کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے۔ یعنی حق داروں کو ان کا پورا حق دیا جاتے۔

حضرت بابا فرید نے فرمایا "نظام الدین تم ایک ایسا درخت ہوگے جس کے سکون بخش سایہ میں لوگ آرام کریں گے"

اسی طرح حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا۔

"عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس کا فائدہ صرف عبادت کرنے والے کو ہوتا ہے جیسے نماز۔ روزہ۔ ذکر و شغل وغیرہ۔ اور دوسری وہ عبادت جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے جیسے دوسروں کے ساتھ شفقت و مہربانی۔ آپس میں اتفاق کروا دینا وغیرہ اس کا ثواب بے اندازہ ہے"[1]

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے مجردانہ زندگی اختیار کی۔ اور فتوح پر گزارا کرنا شروع کیا۔ آپ نے امیر خسرو کے ذریعہ شیخ نظام الدین اولیاء سے اجازت مانگی کہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگیں لیکن شیخ کا حکم صاف تھا "امیر خسرو! نصیر الدین سے کہہ دو کہ تمہیں خلق میں رہنا اور لوگوں کے ظلم و ستم سہنا چاہیئے۔ اور ان کے عوض میں بذل اور ایثار و سخاوت و بخشش کرنا چاہیئے"!

حضرت نظام الدین اولیاء کا یہ طریقہ کار تھا کہ وہ خود اپنی حد تک اصولوں پر سختی سے پابند رہتے تھے اور جن کو اپنا خلیفہ بناتے ان کے لئے بھی سخت اور اعلیٰ معیار مقرر تھا لیکن عام معتقدین کی حد تک وہ سہولتیں دینے اور رعایتیں کرنے کے قائل تھے۔ وہ وسیع المشرب تھے ان کے معتقدین میں ہر مذہب ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ وہ اپنے ہر معتقد کو خود اس کی اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع دیتے۔ ذاتی صلاحیتوں کی نشو و نما پر کسی قسم کا بیرونی اثر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے پیروؤں کو نہ تو ترک دنیا کی تعلیم دیتے نہ ہی اپنے مشوروں کو ان پر لادتے۔ امیر خسرو کو انسانوں اور انسانیت سے محبت تھی ان کا مزاج عوامی انداز کا تھا۔ وہ فن کار تھے۔ تو ان کو ان ہی خطوط پر اپنی شخصیت کی نشو و نما کا موقع دیا۔ اور چشتیہ سلسلہ کی عام تعلیمات نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

حضرت امیر خسرو کا نقطہ نظر تھا کہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

پیر کی دولت بھی وہ درد دل یا سوز سینہ تھا۔ اگر پیر محض قیص کو دل کے مقام پر جلانے ہوتا جیسا کہ بعض عقیدت مند تصور کرتے ہیں تو اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ جس پر کہ پیر طریقت کو ناز ہوتا یا جس کو وہ اپنا زاد آخرت تصور کرتے۔ اور "الہٰی بسوز سینہ ہائے... بخش" کی دعا فرماتے۔ دراصل یہ سوز خیالات کی دنیا میں آگ لگانے والا تھا۔ سات سو سال بعد آج بھی اس سوز کی چنگاریاں ملتی ہیں جن سے دلوں کو گرمایا جا سکتا ہے انسانیت کے فائدہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

امیر خسرو نے چشتیہ سلسلہ کے اثر کے تحت رواداری۔ روشن خیالی اور انسان دوستی کا علم بلند کیا۔ اور رنگ نسل اور مذہب کے امتیازات کو فروعی مان کر انسان کو بحیثیت انسان .... قابل احترام مانا۔ انھوں نے بادشاہوں کے دربار میں رہ کر بھی عام انسان کو اہمیت دی۔ ایسے دور میں جب کہ عوام اور خواص کی تفریق بڑی سخت تھی اور حکمران طبقہ میں شدید احساس برتری پایا جاتا تھا امیر خسرو عوام میں بھی خوبیوں اور صلاحیتوں کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں۔

اگر تو آدمی در کسان بطنز مبین
کہ بہتر از من و تو بندۂ خداوند اند

(اگر تم انسان ہو تو کسی پر طعن و طنز مت کرو کیوں کہ ہزاروں خدا کے بندے ہم تم سے بہتر ہیں)

حکمراں طبقہ میں غرور و نخوت اور مذہبی علماء میں ریاکاری اور خود غرضی کو وہ بری طرح محسوس کرتے ہیں اور جب سادہ لوح عوام سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو عوام ہی ان کو بہتر نظر آتے ہیں۔

بادہ کش دوزخیان بہتر از ین متقیان (زاہدان)
کز پئ خلد برین طاعت معبود کنند

(جنت کے لالچ میں عبادت کرنے والے زاہدوں سے دوزخ کا ایندھن بننے والے شرابی بہتر ہیں۔)

حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتے ہوتے بھی انھوں نے طبقاتی اختلافات کو نظر انداز کیا۔ اپنے ذہن کو احساس برتری سے پاک رکھا۔ محکوم طبقہ کی سنگیت زبان اس کے علوم و فنون کو نہ صرف قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا بلکہ ان میں خود بھی دستگاہ حاصل کی۔ اس تمام تجربہ میں جس کو تاریخ عالم کا نہایت دلچسپ اور انوکھا تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے انسان کی عظمت کو بنیادی اور مرکزی اہمیت دی گئی۔

ہندوؤں کی قدیم ستی کی رسم پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اس میں وفاشعاری کا جو جذبہ انسانیت ہے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو مسلک انسانیت کے اس اونچے مقام پر ہیں کہ اس رسم کے کمزور پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں پڑتی۔ وہ محض انسانی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کو اس رسم میں بھی خوبی ہی خوبی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک سے زیادہ جگہ اس رسم کا ذکر ملتا ہے۔

خسرو در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

مردن از دوستی اے دوست ز ہندو آموز
زندہ در آتش سوزاں شدن آسان نبود

اندر آن مجلس کہ خود را زندہ سوزند اہل عشق
اے بسا مرد خدا کمتر از ہندو زنی ست

گرچہ اسلام روا نیست چنیں
لیک چوں بنگری کار بزرگ ست بہ بیں

---

1 حضرت نظام الدین اولیاء ـ حیات اور تعلیمات از پروفیسر محمد حبیب مرحوم صفحہ ۹

گر بہ شریعت بود ایں لرج روا
جان بدہند اہل سعادت سوا

امیر خسرو کا تصور انسانیت بہت بلند ہے۔ وہ مثالی انسان کو بلند کردار دیکھنا چاہتے ہیں۔

مردکہ از علم توانگر بود
کے نظرش بر گہر و زر بود

(جو علم سے بہرہ ور ہو وہ سونے موتی کی طرف کیوں نظر ڈالے)

امیر خسرو کے نزدیک زندگی کا مقصد کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے بلند و برتر ہے

عزض گر شہوتست و خورد و آشام
خران راہم توان کرد آدمی نام

امیر خسرو عام آدمیوں کی خوبیوں کو اور سوسائٹی میں جو لوگ بڑے گنے جاتے ہیں ان کی کمزوریوں کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔

آشکارا عشق بازی با بتاں
از بس زہد ریائی خوشتر است

دکھاوے کی عبادت سے وہ عشق بازی بہتر ہے جس میں خلوص ہو)۔

انسان کے اطمینان قلب کے لئے قناعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اگر خواہی نہ بینی رنج بسیار
بہ اندک مایہ راحت باش خرسند

حضرت امیر خسرو عقل و خرد انسانیت کے لئے ضروری تصور کرتے ہیں۔

چو ایں سرمایہ نبود با خرد جفت
نہ شاید بے خرد را آدمی گفت

اگر دولت کو عقل سے متحد نہ کیا جائے تو بے وقوف شخص کو انسان کہنا موزوں نہیں۔

پس آنکس مردم آمد از آفرینش
کہ ہنتش بر خرد و قانون بینش

یعنی روز ازل سے صحیح معنوں میں مرد وہی ہے جس کی نگاہ عقل سے منسلک ہو۔

انسانی زندگی مختصر ہے اس لئے اس کو کار آمد بنانا چاہئے اور ضائع نہیں کرنا چاہئے

ضائع مکن بہ خندہ و بازی بسان گل
ایں پنج روزہ عمر کہ برباد می رود

مصروف زندگی کو وہ مبارک تصور کرتے ہیں۔

مرد ہمہ جا بہ سر کار بہ
مشخص معطل خجل و خوار بہ

آدمی کو چاہئے کہ وہ کاہل بے کار نہ بنے۔

بہرۂ مقصود چو بے رنج نیست
کاہل بے کار بہ پیکار بہ

انسان کے لئے خود شناسی ضروری ہے جو خود شناس نہ ہو وہ خدا کو کیسے پہچانے گا۔

آنکہ خود را شناخت نہ تواند
آفرینندہ را کجا داند ؟؟

جب معزالدین کیقباد نے ایک نیا شہر آباد کیا تو امیر خسرو نے اس کا نام "کیلوکہری" تجویز کیا۔ اس میں کیقباد کے نام سے عوام کے لئے لوک اور خدا کا نام ہری شریک کئے گئے یہ نام بعد کو کیلوکھری ہو گیا۔ اس سے امیر خسرو کے سوچنے کے انداز پر روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے خدائے حقیقی اور مجازی کے درمیان عوام کو شریک رکھا۔ اور نام عوامی زبان میں تجویز کیا۔

اعجاز خسروی کے دیباچہ میں حمد۔ نعت۔ منقبت حضرت نظام الدین اولیاء اور مدح سلطان علاء الدین خلجی کے بعد فارسی کے نو اسلوبوں کا ذکر کیا۔ جس میں عام آدمی کے اسلوب کو سادہ سلیس اور مفید مطلب بیان کیا ہے۔

علاء الدین خلجی دیندار آدمی نہ تھا۔ لیکن جب اس نے رعیت کی خوش حالی کے لئے تاجروں کے استحصال سے غریب رعایا کا بچاؤ کیا اور قیمتوں پر نگرانی کی تو خسرو اس کی تدابیر کو خوش آئند تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "عدل فاروقی کو سات سو سال انتظار کرنا پڑا تب جا کر اسے ایک نیا مربی ملا"۔

امیر خسرو نے درباراداری کی اور بادشاہوں کے سامنے مودب کھڑے رہتے گزری لیکن ان کا مشرب تھا۔

جو کہو حق کہو جو لکھو حق لکھو مشعل آدمیت کو بجھنے نہ دو۔
اپنے جس ہاتھ میں تھامتے ہو قلم تم کو اس ہاتھ کے آبرو کی قسم۔

ان کے اس موقف میں لغزش نہ آئی۔ انھوں نے مشعل آدمیت کو بجھنے نہ دیا۔ جبھی تو کہتے ہیں۔

باشم زا برائے نفس خود رائے
پیش چو خودے ستادہ برپائے

(نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں)۔

صفدر آہ

امیر خسرو
بحیثیت ایک عوامی شاعر

ہندوستان میں باضابطہ عوامی ادب کی ابتدا خسرو ہی سے ہوتی ہے۔ خسرو سے پہلے عوامی زبانوں میں کچھ لوک گیت تھے جن کے بعض اجزا مختلف لسانی حلقوں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن ان گیتوں کے بنانے والے شاعر نامعلوم ہیں۔ جو عوامی ادب باضابطہ فراہم کیا گیا اس میں سب سے قدیم جین بھکشوؤں کے وہ دوہے ہیں جو جین مندروں کے پرانے ذخیروں سے برآمد ہوتے ہیں۔ ان دوہوں کی زبان آپ بھرنش ہے اور ان کی عمر ہزار سال سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہ دوہے کسی خاص شاعر کی شخصیت نمایاں نہیں کرتے بلکہ اس کلام پاشاں سے آپ بھرنش عہد کا ایک مبہم لسانی خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

خسرو سے تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے ایک باضابطہ شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری (۱۰۴۸ء سے ۱۱۲۱ء تک) ہوتے ہیں۔ خسرو غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں کہ ان کے تین دیوان تھے۔ ایک فارسی میں، ایک عربی میں اور ایک ہندوی میں۔ مسعود سعد سلمان کا فارسی دیوان تو تہران سے شائع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کے عربی اور ہندوی دیوان کا کوئی پتہ نہیں۔ یہ ہندوی دیوان لاہوری یعنی پنجابی میں ہوگا۔ مسعود سعد سلمان بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن وہ کسی سیاسی جرم میں طویل مدت تک قید خانے میں رہے اور شہرت نہ حاصل کر سکے۔

خسرو سے قبل ایک اور شاعر چند بردائی کا نام لیا جاتا ہے جس نے پرتھی راج راسا (یعنی رزمنامہ پرتھوی راج) لکھا ہے۔ اسے پرتھوی راج کے دربار کا شاعر بتایا جاتا ہے۔ اب یہ مسلمہ طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ چند بردائی مغلوں کے عہد کے کسی زوال پذیر راجہ کے دربار کا بھاٹ تھا۔ اس کا زمانہ خسرو سے کئی سو سال بعد آتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ خسرو ہر عشق چشتیہ خانوادے کے آفتاب نیم روز ہیں۔ ہندوستان کے بہترین فارسی شاعر ہیں۔ وہ ہندوستانی سنگیت کے مجدد اعظم ہیں۔ لیکن ان کی عوامی شاعر کی حیثیت ان تمام حیثیتوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان کے سیدھے سادے گیت ان کی پہیلیاں، ان کی مکرنیاں، ان کے ڈھکوسلے ہندوستان کے گھر گھر میں سب کی زبان پر ہیں۔ ان کی مکتبی کتاب خالق باری سے فرہنگ آموزی کی مقبول ترین تصنیف ہے۔

بدقسمتی سے اس صدی کی ابتدا اتنی شدید فرقہ واریت سے ہوئی جس کا نتیجہ آج ہندوستان اور پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ایک طرف اگر ہندی، ہندو اور ہندوستان کا نعرہ لگ رہا تھا تو دوسری طرف ہندی کے لفظ سے نفرت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اردو کے بیشتر محقق صرف ہندی کھڑی بولی ہی کو نہیں تمام دوسری کالعل ہندی بولیوں کو بھی ناہذب اور گنواروں کی زبان سمجھتے تھے۔ نفرت کا یہ جنون یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ خود خسرو کی ہندوی کو ان کی ذات کے لئے دون مرتبت سمجھا جاتا تھا اور ہر جائز اور ناجائز طریقے پر خسرو کا تعلق ہندوی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ان محققوں کے سرخیل پروفیسر محمود شیرانی تھے۔ علاوہ مضامین کے انھوں نے مولوی عبدالحق کی استعانت سے ایک کتاب حفظ اللسان لکھی ہے جس میں خسرو کی ہندوی اور ان کی مقبول ترین کتاب خالق باری کو غیر مستند ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں شیرانی صاحب کی اس کتاب کے لئے ایک ایک نکتے کا جواب اپنی کتاب امیر خسرو بہ حیثیت ہندی شاعر میں دے چکا ہوں اور ہند و پاکستان دونوں جگہ اہل علم تبصرہ نگاروں نے بلا استثنا میری تائید کی ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ خسرو خود اپنی نثر و نظم میں ہندوی شاعر ہونے کے یہ فخر مقر ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے ان کی ہندوی اشعار کی تعداد تین لاکھ ابیات سے زیادہ متعین کی ہے لیکن افسوس ہے کہ اب یہ تعداد تین سو مستند ابیات تک بمشکل پہنچ سکے گی۔

خسرو کا عوامی کلام ضائع ہونے کا سبب یہ ہے کہ عوام اپنے ادب سے لطف تو لیتے ہیں، لیکن اس کی تدوین نہیں کر سکتے۔ عوامی ادب کی تدوین کا کام خسرو کے بہت بعد ادیبوں نے شروع کیا۔ مذہبی عوامی ادب کو بھی محفوظ کرنے والے عوام نہیں۔ اسے منظم مذاہب اور مندروں کے مرکزوں نے محفوظ کیا ہے۔

خسرو کے عہد میں زبان کے تین انداز تھے۔

۱۔ وہ شائستہ زبان جو خسرو اور دوسرے مقربین دربار ہندوستانیوں کے گھروں

میں بولی جاتی تھی ۔

۲۔ اُن نیم شائستہ ہندوستانی خاندانوں کی زبان جو دربار سے متعلق نہ تھے ۔ ایسے گھروں کی عورتیں ایک ایسی زبان بولتی تھیں جس میں کم شائستہ ہندوی لفظ اور گیتوں کے لفظ مخلوط ہوتے تھے ۔

۳۔ عامیانہ زبان جس میں گیتوں کی روایت سے آتے ہوئے الفاظ کافی مقدار میں ہوتے تھے بلکہ بعض اوقات دوسری پڑوسی بولیاں بھی اس میں شامل ہو جاتی تھیں۔

خسرو کا عوامی کلام ان تینوں اقسام میں موجود ہے ۔ پہلے ان کے کلام میں شائستہ زبان دیکھئے ۔

ریختہ کے انداز کا ایک قطعہ ؎

زرگر پسرے چو ماہ پارہ
کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دلِ من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑھا نہ کچھ سنوارا

اس قطعے کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ خسرو کے عہد کی شائستہ ترین زبان کا نمونہ ہے ۔ ان مصرعوں میں فارسی یا عربی کا کوئی لفظ شامل نہیں ہے لیکن ان کی شائستگی کسی طرح فارسی مصرعوں سے کم نہیں ہے ۔ تت سم سنسکرت لفظ بھی اس بولی میں نہیں آتے ۔ یہی وہ زبان ہے جو اس برصغیر کی پہلی ملک گیر زبان بنی اور جو آج اردو کہلاتی ہے ۔

اسی شائستہ زبان میں لڑکیوں کا ایک گیت دیکھئے ۔

امّاں مرے بابا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی ترا بابا تو بڈھا ری — کہ ساون آیا
امّاں مرے بھیا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیّا تو بالا ری — کہ ساون آیا
امّاں مرے ماموں کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی ترا ماموں تو بانکا ری — کہ ساون آیا

آئینے کی ایک پہیلی میں خسرو نے فارسی، ترکی اور ہندوی میں تین بار آئینے کا نام فارسی یا ترکی لفظ لائے بغیر بتا دیا ہے لیکن سلیقۂ بیان سے پہیلی کا اصل پھر بھی مخفی ہے۔

فارسی بولی آئی نا
ترکی بولی پائی نا
ہندی بولی آرسی آوے
کہے خسرو کوئی بتلاوے

بھُٹّے کی پہیلی بچّوں کے لئے ۔

آگے آگے بہنا آئی پیچھے پیچھے بھیّا
دانت نکالے بابا آئے برقع اوڑھے میّا

پتنگ کی پہیلی بچّوں کے لئے ۔

ایک کہانی میں کہوں تو سن لے میرے پوت
بنا پروں وہ اڑ گیا باندھ گلے میں سوت

آگ کی پہیلی بچّوں کے لئے ۔

جا گھر لال بلیا جاتے
تاکے گھر میں ڈُند مچاتے
لاکھوں من پانی پی جاتے
دھرا ڈھکا سب گھر کا کھاتے

"جا گھر" اور "تاکے" غالباً شائستہ خاندانوں میں بولے نہیں جاتے تھے یہ "جس گھر" اور "تس کے" کی تحریفی شکل بھی ہو سکتی ہے ۔

آسمان کی پہیلی ۔

ایک تھال موتی سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے
ایک نہ موتی اس کے گرے

آری کی پہیلی اسی شائستہ بولی میں دوسرے مصرعہ میں "ہر ہر" کا استعمال آری کی آواز کے لئے کتنا خوب صورت ہے ۔

ادھر کو آوے ادھر کو جاوے
ہر ہر پھیرے کاٹ وہ کھاوے
ٹھہرے جس دم وہ ناری
خسرو کہے اسی کو آری

بڑی کی پہیلی ۔

ٹوٹی، ٹوٹ کے دھوپ پڑی
جوں جوں سوکھی ہوئی بڑی

دیا (چراغ) کی پہیلی ۔

بارا تھا تب سب کو بھایا
بڑھا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں
بوجھو نہیں تو چھوڑو گاؤں

لوٹے کی پہیلی ۔

کھڑا بھی لوٹا پڑا بھی لوٹا
بیٹھا ہے اور کہیں کہ لوٹا
خسرو کہے سمجھ کا ٹوٹا

قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ان مثالوں میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں ہے لیکن زبان کتنی شائستہ اور رواں ہے ۔ چوں کہ اس عہد کی علمی زبان فارسی تھی لہذا آگے بڑھ کر علمی ضرورتوں کے لئے اسی زبان میں فارسی اور فارسی کے ساتھ عربی الفاظ داخل ہوتے ۔ لیکن یہ زبان عہدِ خسرو سے دکن تک اور دکن سے آج تک فارسی رسم الخط ہی میں لکھی گئی ۔ اس ہندوی کے علاوہ سندھی، پنجابی، کشمیری بلکہ تمام

قبل ۱۱۹۱ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے فتح کیا تھا۔ کیلوکھڑی۔ کیقباد نے جمنا کے کنارے موجودہ ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ کے جانب جنوب ایک میل کے فاصلہ پر ۱۲۸۶ء میں ایک قلعہ بنوایا اور ایک عالی شان قصر تیار کیا۔ جس کے گرد ایک نیا شہر بسانا چاہتا تھا کیقباد نے اس محل کا نام کیلوک ہری رکھا۔ یہ نام امیر خسرو نے تجویز کیا۔ بادشاہ نے امیر خسرو سے فرمائش کی کہ محل کا نام ایسا تجویز کیا جائے جس میں اس کی بادشاہی کا اور اس کا ذکر بھی ہو اور خدا کا نام بھی آجائے اور ہندو رعایا بھی سمجھ سکے۔ امیر خسرو نے کیقباد کے مخفف کے لوک یعنی عوام۔ ہری یعنی خدا۔ اس طرح کیلوک ہری نام رکھا گیا جو بعد میں چل کر کیلوکھڑی مشہور رہا۔ ۱۲۸۹ء میں کیقباد کو ترک امراء نے معزول کر کے کیلوکھڑی کے محل میں نظر بند کر دیا۔ جلال الدین فیروز خلجی نے کیلوکھڑی کے پاس نیا شہر آباد کیا تھا۔ کیونکہ وہ شہر کے رئیسوں سے مطمئن نہ تھے۔ اس لئے کیلوکھڑی میں رہائش اختیار کی اور اس کی ناتمام عمارتوں کو پورا کیا۔ دریا کے کنارے باغ۔ حصار۔ محل اور پتھر سے مسجد اور بازار بنا کر شہر آباد کیا۔ اس کا نام نیا شہر رکھا۔ امیر خسرو نے اس قلعہ کی تعریف میں قران السعدین میں لکھا ہے۔

قصر معظم کہ بہشتی فراخ   روضۂ طوبیٰ درا اوراب شاخ

ایک شہر سیری تھا۔ اس کو دارالخلافہ کہتے تھے سلطان علاء الدین اور قطب الدین مبارک شاہ اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک شہر تغلق آباد تھا۔ اس قلعہ اور شہر کو غیاث الدین تغلق نے ۱۳۲۱ء میں امیر خسرو کے آخری دور میں بنانا شروع کیا تھا۔ امیر خسرو کی زندگی ہی میں یعنی ان کی وفات سے دو سال قبل قلعہ اور شہر بالکل تیار ہو گیا تھا۔

عمارتیں

امیر خسرو کے عہد میں دہلی میں جو عمارتیں تھیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

جامع مسجد

اس مسجد کا نام مسجد قوت الاسلام تھا جس کو سلطان قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۱ء اور ۱۱۹۶ء کے درمیان بنایا تھا۔ ابتداً یہ چھوٹی سی تھی۔ ۱۲۳۰ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ۲۲ سال قبل سلطان شمس الدین التمش نے شمال اور جنوب دونوں جانب اس کی توسیع کی سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۰ء میں مشرقی جانب توسیع کی اور دروازہ تعمیر کروایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں اس کے متعلق سے لکھا ہے۔

مسجد او جامع فیض الہ
زمزمہ خطبہ او تا بماہ

قطب صاحب کی لاٹھ

یہ مینار مسجد قوت الاسلام کے جنوب مشرقی گوشہ میں جمعہ کی اذان کے لئے گیا تھا۔ اس کو قطب الدین ایبک نے بنانا شروع کیا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش نے ۶۲۶ ہجری میں اس کی تکمیل کی۔

مقبرہ شمس الدین التمش

قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس یہ مقبرہ ہے یہ مقبرہ غالباً سلطانہ رضیہ نے بنوایا تھا۔ اس مقبرہ کی عمارت باہر سے سنگ خارا کی ہے اور اندر سے سنگ سرخ کی۔ کہیں کہیں سنگ مرمر بھی لگا تھا۔ تمام دیواروں پر آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اور رنگین ... منبت کاری کی ہوئی ہے۔

حوض شمسی

قطب صاحب کے نواح میں سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۲۹ء میں یہ حوض بنایا۔ یہ حوض سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کا طول دو میل اور عرض ایک میل تھا۔ امیر خسرو نے اس کی تعریف قران السعدین میں یوں کی ہے۔

در کمر سنگ میاں دو کوہ   آب گہر صفوہ دو دریا شکوہ

اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا اور اہل شہر اس کا پانی پیتے تھے۔ شہر کی عیدگاہ بھی اس کے قریب تھی۔ جب حوض کے کنارے سوکھ جاتے تو ان میں ککڑی تربوز اور خربوزے بو دیتے۔

حوض خاص

یہ حوض سلطان علاء الدین خلجی نے بنوایا تھا۔ یہ حوض حوض شمسی سے بھی بڑا تھا اس کے گرد اہل طرب رہتے تھے۔

پرانا قلعہ

راجہ انگپال نے جو ۷۶۶ء میں گدی نشین ہوا اس قلعہ کی تعمیر کی۔ اس کے دروازہ پر پتھر کے دو شیر بنے ہوتے تھے۔ جن کے پہلوؤں میں کانسہ کے گھنٹے لٹکائے گئے تھے۔ جو بھی رات راجہ تک اپنی فریاد لے جانا چاہتا ان گھنٹوں کو بجاتا۔ یہ شیر امیر خسرو کے عہد میں موجود تھے۔

قلعہ رائے پتھورا

رائے پتھورا نے ۱۱۴۳ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ۱۱۰ سال قبل یہ قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ ایک عرصہ تک بادشاہوں کا دارالخلافہ رہا۔ سلطان شمس الدین التمش اس قلعہ میں رہتے تھے۔ کیلوکھڑی کے پاس نیا شہر آباد ہوا تو یہ قلعہ پرانی دہلی کے نام سے مشہور ہوا۔

قصر سفید

قلعہ رائے پتھورا میں سلطان قطب الدین ایبک نے ایک محل بنایا اور اس کا نام قصر سفید رکھا۔ اس قصر میں سلطان ناصر الدین محمود تخت نشین ہوئے۔ ۱۲۶۰ء میں جب کہ خسرو کی عمر ۷ سال کی تھی ہلاکو خاں کے سفیر نے بھی اس قصر میں منعقدہ ایک دربار میں شرکت کی۔

دربار سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا دربار چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی اس قصر میں تخت نشین ہوئے۔

مسجد میری

سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے جامع مسجد جس کو مسجد میری کہتے تھے تعمیر کی علماء اور مشائخ کو انھوں نے دعوت دی کہ جمعہ کی نماز اس میں پڑھیں شیخ نظام الدین اولیاء نے جو کیلوکھڑی کی مسجد میں نماز جمعہ کے لئے جایا کرتے تھے یہ کہلا بھیجا کہ جو مسجد میرے مکان سے قریب ہے اس کا حق ارجح ہے۔

کوشک لال

سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے بنایا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اسی کوشک کے پاس قلعہ غیاث پور بنایا جو قلعہ مرزغن سے مشہور ہوا۔ یہ اسی نواح میں تھا۔ جہاں حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار ہے۔ جلال فیروز خلجی کو کیلوکھڑی سے لاکر پرانی دہلی کے تخت پر بٹھایا گیا تو وہ وہاں سے کوشک لال آئے اور سلطان غیاث الدین بلبن کو یاد کرکے اس کے دروازہ پر سے پیادہ پا ہوئے۔ جلال الدین فیروز خلجی اکثر اس کوشک میں رہتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کوشک سیری بنانے سے قبل اسی کوشک میں رہتے تھے۔

کوشک لال (دنیا شہر)

دوسرا کوشک لال سلطان فیروز خلجی کا بنایا ہوا ہے۔ جو کیلوکھڑی میں تھا امیر خسرو نے اس کوشک کی تعریف میں لکھا۔

شہا در شہر تو کردے حصارے
کہ رفت از کنگرہ ہا تا قمر سنگ

کوشک سبز

جلال الدین فیروز خلجی نے کوشک لال سے قریب ایک اور محل کوشک سبز بنایا تھا۔ جب ان کو قتل کیا گیا تو ان کے فرزند رکن الدین ابراہیم شاہ کو اسی کوشک میں تخت پر بٹھایا گیا۔

قلعہ علائی (کوشک سیری)

یہ قلعہ سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۲ء میں بنوایا۔

قصر ہزار ستون

علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۲ء میں بنوایا۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق نے خسرو خان پر فتح پائی تو اس قصر میں آکر سلطان قطب الدین اور اس کے بھائیوں کی تعزیت ادا کی۔

بازار

دہلی کے بازار بڑے بارونق تھے۔ امیر خسرو تحفۃ الصغر میں کہتے ہیں۔
"اس کے بازار میں آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی" دلی میں زر و سیم کی کثرت تھی۔ امیر خسرو اعجاز خسروی میں کہتے ہیں۔
دریں شہر ہر سیہ جری زری امت کہ می رود

بازاروں میں بیرونی ممالک کا سامان بھی ملتا تھا۔ اور دور دراز سے تاجر سامان تجارت لے کر یہاں آتے تھے۔ غیر ملکی تاجروں کے خلاف امیر خسرو نے ایک یادداشت لکھی کہ یہ تاجر دوسرے ممالک سے سرمایہ حاصل کرکے یعنی استحصال کرکے دلی آئے ہیں سلطان علاء الدین خلجی نے ملتانی سوداگروں کی ایک کمپنی یا کارپوریشن بنائی تھی اور قیمتی کپڑے لانے کا کام ملتانی سوداگروں کے سپرد کیا تھا۔ ان کو سلطنت سے تجارت

کے لئے ایک معقول رقم بھی ملتی تھی۔ ان کو سونے کے تنکے دیئے جاتے تھے۔ کیوں کہ ان تاجروں کو سلطنت دہلی کے باہر سے سامان لانا پڑتا تھا۔ خراسان سے کشمش اور بادام بھی اس زمانہ میں درآمد ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں ساہوکاروں کا غلبہ تھا جو بیشتر ہندو تھے۔ دلی کے امراء اکثر ان کے مقروض رہتے تھے ان کے سود کی شرح دس فی صدی سالانہ تھی۔

سکے

ہندوستان میں روپیہ کا استعمال شیر شاہ کے وقت سے ہوا۔ ہندوستان کا قدیم سکہ تنکہ تھا۔ امیر خسرو کے عہد میں تنکہ سرخ۔ تنکہ سفید اور جیتل رائج تھے۔ تنکہ سرخ خالص سونے کا سکہ تھا جو ۱۰۰ رتی اور بعض اوقات ۱۱۲ رتی کا ہوتا۔ تنکہ سرخ کا استعمال زیادہ تر بیرونی تاجر کرتے تنکہ سفید خالص چاندی کا سکہ تھا جو ۸۰ رتی اور ۱۰۰ رتی کا ہوتا۔ بازار میں خرید و فروخت میں جیتل استعمال ہوتا۔ ایک تنکہ سفید کے ۴۴ جیتل ہوتے۔ ششگانی اور ہشتگانی سکے رائج تھے جو علی الترتیب چھ جیتل اور ۸ جیتل کے ہوتے۔

سلطان غیاث الدین بلبن اور جلال الدین فیروز شاہ کے زمانہ میں طلائی اور نقرئی سکوں پر ایک جانب خلیفہ عباسی مستعصم کا نام "الامام مستعصم امیر المومنین" اور دوسری طرف علی الترتیب "السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین ابو المظفر بلبن السلطان" اور "السلطان الاعظم جلال الدنیا والدین ابو المظفر فیروز شاہ السلطان" منقوش ہوتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے سکوں پر خلیفہ عباسی کا نام نہ ہوتا تھا ایک طرف "یمین الخلافت ناصر امیر المومنین" اور دوسری طرف "علاء الدین خلجی" منقوش تھا۔

اوزان اور پیمانے

اس زمانے کا من ۴۰ سیر کا ہوتا تھا لیکن فرشتہ کے مطابق علاء الدین خلجی کے عہد میں "من آں وقت چہل سیر بود و ہر سیر بیست و چہار تولہ" اگر ۸۰ تولہ کا سیر قرار دیا جائے تو ۱۲ سیر کا من ہوا۔

نرخ

ہرخورد کے مطابق غیاث الدین بلبن کے عہد میں دو جیتل کا ایک من خربوزہ اور ایک جیتل کی دو سیر میدے کی روٹی بکتی تھی ۔

علاء الدین خلجی نے اجناس کی حسب ذیل قیمتیں مقرر کی تھیں ۔

گیہوں	٧ ½	جیتل		فی من
جو	٤	〃		فی من
ماش	٥	〃	〃	〃
نخود	٥	〃	〃	〃
موٹھ	٣	〃	〃	〃
شکرتری	١ ½	〃		فی سیر
گڑ	⅓	〃	〃	〃
گھی	¼	〃	〃	〃
روغن کنجد	⅓	〃	〃	〃
نمک	⅕	〃	〃	〃

بول چال

اہل دہلی کی زبان کھڑی بولی تھی جو صرف بول چال کی زبان تھی ۔ اور لکھی نہیں جاتی تھی ۔ نووارد مسلمانوں نے اس کو اپنی زبان بنا لیا تھا ۔ اس کو اور دوسری علاقہ داری زبانوں کو امیر خسرو کے عہد میں ہندوی کہتے تھے ۔ امیر خسرو لکھتے ہیں ۔

سندی و لاہوری و کشمیر کبر   دھور سمندری تلنگی و گجر
معبر و گوری و بنگالی واودھ   دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
این ہمہ ہندوست از ایام کہن   عامہ بہ کار رست بہ ہر گونہ سخن

امیر خسرو کے نانا ۔ ان کی والدہ اور سارا ننھیال دہلی کی شائستہ ہندوی بولتا تھا ۔ امیر خسرو کے عہد میں اس بولی پر فارسی کا اثر پڑ چکا تھا ۔

پالکی

امیر خسرو کے عہد میں شریف عورتیں ڈولیوں و پالکیوں میں آتی جاتی تھیں ۔ اور مرد بھی بلحاظ ضرورت ۔ بسہولت و امراء پالکیوں کو استعمال کرتے تھے ۔ آٹھ آدمی باری باری اس کو اٹھانے تھے ۔ چار آدمی اٹھاتے اور چار ساتھ ساتھ چلتے ۔ جن کے پاس نوکر ہوتے وہ ڈولی کو اٹھاتے ورنہ ایسے آدمی جب کہ روزی کا انحصار اس پر تھا اجرت پر یہ کام کرتے ۔ بازاروں میں بادشاہ کے محل کے پاس یا امراء کے دروازوں پر یہ لوگ کھڑے رہتے ۔

میوے اور غلے

امیر خسرو نے ہندوستان کے جن میووں کا ذکر کیا ہے ان میں آم کو فوقیت حاصل ہے ۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ آج تخمی اور پیوندی دو قسم کے آم پائے جاتے ہیں ۔ پیوندی آم مغلوں کی دین ہیں ۔ اور بعد میں پرتگیزیوں نے اس فن کو مزید ترقی دی ۔ امیر خسرو کے عہد میں صرف تخمی آم ہوتے تھے ۔ انھوں نے آم کے بارے میں لکھا ہے ۔

نغزک مانغز کن بوستاں   نغز ترین میوہ ہندوستاں

اس زمانہ میں کچے آم کا اچار بنانے کا بھی رواج تھا ۔

دوسرے میووں میں کٹھل جامن ۔ رنگترہ ۔ انار ۔ انگور ۔ خربوزے اور تربوز دہلی میں ہوتے تھے ۔

خربوزہ کی تعریف امیر خسرو نے یوں کی ہے ۔

خربزہ گوئی کہ بصحرا اوکشت   گوئی ربود از ثمرات بہشت

امیر خسرو نے پان کو بھی ہندوستان کے میوہ میں شمار کیا ہے ۔ کہتے ہیں ۔

نادرہ برگے چو گل بوستاں   خوب ترین میوہ ہندوستاں
گرسنہ را گرسنگی کم شود   سیر خورد گرسنہ در دم شود

جہاں تک اناج کا تعلق ہے خریف کی فصل میں ماش ۔ لوبیا ۔ موٹھ اور ربیع کی فصل میں گیہوں ۔ چنا ۔ جو بوتے تھے ۔ چاول ۔ تل اور نیشکر کی کاشت بھی کی جاتی تھی

کھانے

سات سو سال کے طویل عرصے میں پکوان کے طریقے اور نام بدل گئے ہیں اور ان میں کافی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں لیکن چند پکوان اس وقت بھی پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً کھچڑی ۔ سموسہ کھیر اور اچار اس وقت بھی مروج تھے ۔ اچار کے متعلق امیر خسرو کا مصرع ہے ۔

نغنہ نرود زیر گر آچار نیابی

رسوم

چند مراسم کا ذکر جو اس دور میں رائج تھے خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔

سیم کی رسم

یہ دستور تھا کہ کسی کا انتقال ہو تو سب اعزہ اور احباب تیسرے دن صبح اس کی قبر پر جاتے اور قبر کے اردگرد ریشمی کپڑے اور گیلے بچھاتے اور قبر پر پھول رکھتے تارنج اور لیمو کی ٹہنیاں بھی قبر پر رکھتے ۔ سب لوگ اپنے اپنے کلام اللہ لاتے اور دعا پڑھتے جب ختم کر چکتے تو لوگوں کو گلاب پلایا جاتا اور گلاب ان پر چھڑکا جاتا ۔ اور پان بھی دیئے جاتے ۔ پھر سب لوگ واپس ہوتے ۔

عید

عید کے دن خطیب ہاتھی پر سوار ہوتا ۔ ہاتھی کی پشت پر ہودہ ہوتا ۔ خطیب کالے کپڑے پہنتا موذن ہاتھیوں پر سوار خطیب کے آگے آگے تکبیر پڑھتے جاتے ۔ شہر کے مولوی اور قاضی بھی سوار ہوتے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ صدقہ ہوتا جو عیدگاہ کے راستے میں تقسیم کرتے جاتے ۔ عیدگاہ میں سائبان لگایا جاتا ۔ اور فرش بچھایا جاتا ۔ جب سب نمازی

جمع ہوجاتے تو خطیب نماز پڑھاتا اور خطبہ پڑھتا۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے گھروں کو واپس جاتے۔

ستی

ستی ہونا واجب نہیں تھا۔ اگر کوئی بیوہ عورت ستی ہوتی تو وہ اہل وفا مانی جاتی اور اس کا خاندان معزز مانا جاتا۔ جو عورتیں ستی نہیں ہوتیں ان کو موٹے کپڑے پہننے پڑتے اور طرح طرح کی خواری میں زندگی بسر کرنی پڑتی۔ جب کوئی عورت اپنے شوہر کے مرنے پر ستی ہونے کا ارادہ کرتی تو وہ بناؤ سنگار کرتی اور اس کو گھوڑے پر سوار کیا جاتا۔ لوگ اس کے پیچھے چلتے آگے نوبت بجتی۔ برہمن بھی ساتھ ساتھ جاتے۔ بادشاہ کی اجازت بغیر جلایا نہ جا سکتا تھا۔ لیکن یہ اجازت دے دی جاتی امیر خسرو کو اس رسم میں ہندوستان کی عورت کی وفاشعاری نظر آتی جس کو انھوں نے یوں ظاہر کیا ہے۔

خسروا در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش
کو برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

شادی بیاہ کے رسوم

امیر خسرو کے عہد تک نو وارد مسلمانوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور مقامی آبادی سے ان کا میل جول بڑھ گیا تھا جس کے نتیجے کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کے عناصر کو اپنانا شروع کر دیا تھا مسلمانوں نے مذہبی رسوم اور تہواروں کو اپنانے میں دشواری محسوس کی لیکن شادی بیاہ کے رسوم کو آسانی سے اور ابتدائی دور ہی میں اپنا لیا تھا۔ مثنوی دولرانی خضر خاں میں امیر خسرو نے جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے علاوہ سارے رسوم ہندوستانی تھے۔

انتظام سلطنت

امیر خسرو کے عہد میں سلطان اقتدار اعلیٰ کا مالک تھا۔ وہی قانون کا منبع اور سرچشمہ تھا۔ مقدمات کے آخری مرافعے وہی سماعت کرتا۔ اور وہی فوج کا چیف کمانڈر ہوتا۔ البتہ سلطان مذہبی امور میں علماء سے مشورہ کرتا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں شریعت کے احکام کی پابندی ضروری تھی۔ اور سلطنت میں سلطان مجلس، وزرا (مجلس خلوت) سے مشورہ کرتا۔ ایسا مشورہ سلطان کے لیئے لازمی نہ تھا لیکن اکثر سلطان مشورہ ضرور کرتے سلطان عموماً تین چار امراء سے مشورہ کرتا۔ مجلس خلوت میں وہی شرکت کرتے جنھیں سلطان طلب کرتا۔ کوئی حق کی بنا پر شرکت کا ادعا نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانہ میں سلطنت کی تشکیل میں عرب وامیاں کے انداز کا امتزاج تھا۔ اور فوج کی ترتیب ترک ومنگول طرز پر تھی۔ طریقہ مالگزاری ہندوستانی تھا۔ اس زمانہ میں دربار دو قسم کے تھے۔ بار عام اور بار خاص۔ بار خاص میں خان۔ ملک اور امیر شریک ہوتے۔ بار عام میں ہر کوئی شریک ہو سکتا تھا۔ بار عام کا انتظام امیر حاجب کے ذمہ ہوتا۔ اور عوام کی درخواستیں سلطان کو پیش کرتا۔ نائب حاجب اور حاجب اس کو فرائض کی تکمیل میں مدد دیتے۔ جب کوئی شخص دربار میں جاتا تو حاجب اس کو آداب دربار سے واقف کرواتے۔ اور اس کو ہاتھ پکڑ کر ایک خاص مقام پر لے جاتے کہ وہاں سے تعظیم بجالائے۔

باربک Lord Chamberlain کے مماثل عہدہ تھا۔ دربار میں مختلف درجے کے لوگوں کے مقام کا تعین کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

وزیر سلطان کی عدم موجودگی میں کاروبار سلطنت انجام دیتا۔ اس زمانہ میں محکموں کو دیوان کہتے۔ مثلاً دیوان اشراف (محکمہ آڈٹ) دیوان کوہی (محکمہ زراعت) دیوان عرض (محکمہ فوج) دیوان انشاء۔ دیوان عمارت۔ دیوان وزارت (محکمہ مالگزاری) وغیرہ۔ اور محکمہ کے صدر کو مالک کہتے مثلاً مستوفی ممالک (آڈیٹر جنرل)۔ مشرف ممالک (وزیر خفیہ) عارض ممالک وزیر فوج یہ سپہ سالار نہ ہوتا بلکہ سپاہیوں کا تقرر اور ان کی تنخواہوں کی تقسیم اس سے متعلق تھی۔ قاضی ممالک (چیف جسٹس) وغیرہ محکموں کے علاوہ کارخانہ جات بھی ہوتے۔

چند عہدوں کے نام یہ تھے۔

صدر جہاں (قاضی القضات) ایک مرکزی افسر تھا جو اپنے نائبوں کے ذریعہ مذہبی معاملات (علماء کی مدد معاش مساجد کی تعمیر۔ اوقاف کے انتظام وغیرہ) کا ذمہ دار ہوتا۔

کوتوال۔ شہر میں پولیس کا اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔

خریطہ دار جس کے پاس بادشاہ کا قلمدان ہوتا۔

مہردار۔ بادشاہ کی مہر رکھتا تھا۔

شرابدار۔ بادشاہ کے استعمال کے پانی اور دیگر مشروبات کا منتظم ہوتا تھا۔ سلطان بلبن شراب نہیں پیتے تھے لیکن اس عہدہ کا نام نہیں بدلا۔

چاشنگیر۔ دسترخوان پر لانے سے پہلے ہر ایک کھانے کو چکھنے اور اپنی محافظت میں بادشاہ کے روبرو لانے کا کام اس سے متعلق ہوتا تھا۔

میر داد۔ یہ عہدہ دار قاضی کے ساتھ بیٹھتا۔ اگر کوئی شخص امیر یا بڑے آدمی پر نالش کرتا تو وہ اس کو قاضی کے روبرو حاضر کرتا۔ اس عہدہ کو وکیل سرکار کے مماثل قیاس کیا جا سکتا ہے۔

دوات دار۔ جس کے پاس بادشاہ کی دوات رہتی۔

شیخ الاسلام صرف ایک لقب تھا جو بادشاہ کی طرف سے ملک کے سب سے بزرگ شیخ کو دیا جاتا تھا۔ لیکن شیخ الاسلام کی بزرگی کا اعتراف کرنا یا اس کو رد کرنا مسلم ملت کے ہاتھ میں نہ تھا۔

امیر خسرو کے عہد میں سرکاری خزانہ سے رقومات کی ادائیگی خط خورد کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اس چٹھی میں یہ درج ہوتا تھا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ خزانہ سے فلاں شخص کو فلاں واجد کی شناخت پر اس قدر رقم ادا ہو۔ اس چٹھی پر چٹھی لانے والا اور جس کی شناخت پر رقم ادا کرنا لکھا ہو ہر دو دستخط کرتے۔ اس کے علاوہ تین امیروں کے دستخط ہوتے۔ پھر دیوان وزارت کے پاس لے جاتے۔ متصدی اس کی نقل لے لیتے پھر پروانہ لکھا جاتا جس پر وزیر خزانچی کو حکم دیتا۔ خزانچی اپنے حساب میں درج کرتا۔ ہر روز کے پروانوں کا چٹھہ بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔ جس کے لئے بادشاہ کا حکم ہوتا کہ فوراً دیدو اسی وقت دے دیا جاتا۔ بعض دفعہ دو دو تین تین مہینے بعد ملتا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ جس قدر انعام کا حکم دیا جاتے اس کا دسواں حصہ یعنی عشر وضع کرکے بقیہ رقم ادا ہوتی۔

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیے

برگوہ خسرو از بی تذکرہ شکر دادم
کہ کام طوطی ہندوستاں شود شیریں

ہندوستان، جنت نشان، ہمیشہ سے خدا رسیدہ بزرگوں اور ولیوں کا مسکن، رشیوں ورمنیوں کا استھان، دانشوروں اور مفکروں کا مرکز، معلموں اور فلسفیوں کا مخزن وراد یبوں اور شاعروں کا معدن رہا ہے۔ اس خاک پاک نے ایسے ایسے خلاق معانی پیدا کئے، جو نہ صرف اپنے زمانے میں منفرد و یکتا تھے، بلکہ آج تک دنیا ان کا ثانی نہیں پیدا کر سکی۔ اقبالؔ نے سچ کہا ہے ؎

چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

حضرت امیر خسروؔ خلاقِ معانی بھی تھے اور غواصِ معانی بھی۔ ان کا شمار ہندوستان کی باکمال ہستیوں کی صف اول میں کیا جاتا ہے۔ وہ علم و فن اور فضل و کمال کی مجسم تصویر تھے۔ ان کی ہمہ گیر اور دلکش شخصیت نے ایک عالم کو شیدائی بنا لیا تھا۔ امیر و غریب، شاہ و گدا، رند و پارسا، ہندو و مسلمان، سب ان کے فدائی، بڑے بڑے جلیل القدر اور عظیم المرتبت سلاطین، ان کی قدر و منزلت کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ ان کے سریلے نغمے اور میٹھے بول لوگوں کے دلوں میں کیف و سرور پیدا کرتے رہیں۔ ان کی شاعری معرفت و تصوف کا گنجینہ ہے۔ ان کے جذبات بول، پریم اور گیان کا آئینہ ہیں۔ صدیاں گزر گئیں، لیکن اس باکمال انسان اور صوفی شاعر کے کلام کی تازگی اور دلکشی کم نہیں ہوئی۔

مادرِ ہند کا یہ قابلِ فخر اور مایۂ ناز فرزند تیرہویں صدی عیسوی (۱۲۵۳ء) میں بمقام مومن پور پٹیالی ضلع ایٹہ، اترپردیش میں پیدا ہوا۔ یہ روایت مشہور ہے کہ پدر بزرگوار امیر سیف الدین محمود، نومولود کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہاں کے ایک صاحب حال بزرگ کی خدمت میں لے گئے۔ بچہ کو دیکھتے ہی ان بزرگ نے فرمایا:

"یہ لڑکا عارف باللہ اور یگانۂ روزگار ہوگا۔ قیامت تک اس کا نام باقی رہے گا، اور وہ قدم خاقانی سے آگے بڑھ جائے گا۔ اس کے بعد دعا دی کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہر دلعزیز کرے۔"

بزرگ محترم کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ نومولود نہ صرف عارف باللہ اور یگانۂ روزگار ہوا۔ بلکہ صاحب سیف و قلم بھی ہوا۔ اس نے علم و ادب کے دریا بہا دیئے۔ اس نے فن موسیقی میں اضافہ کرکے اس کو دلکشی اور رعنائی عطا کی۔ اس کی شیریں سخنی اور نوا سنجی نے اسے "طوطیِ ہند" بنا دیا۔

امیر سیف الدین محمود چار سال کے بعد خسرو کو پٹیالی سے دہلی لے آئے۔ یہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا۔ ابھی وہ نو برس ہی کے تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خسروؔ کے معصوم اور ننھے دل پر جو بیتی اس کا اظہار انھوں نے برجستہ اس غم انگیز شعر میں کیا:

سیف از سرم گزشت و دلِ من دو نیم ماند
دریائے من رواں شد و دُرِ یتیم ماند[1]

باپ کی وفات کے بعد خسروؔ کے نانا، نواب عماد الملک نے اپنے اس ہونہار نواسے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ نواب عماد الملک بڑے پایہ کے امیر تھے۔ ان کی امارت و سخاوت اور علمی سرپرستیوں کا شہرہ دور دور تک تھا۔ بڑے بڑے علما و فضلا ان سے وابستہ تھے۔ ان کی مجلس میں ہر علم و فن کے ارباب کمال شریک ہوتے، علم و فضل و کمال کا ایک چشمہ تھا جو ہر وقت جاری رہتا اور جس سے تشنگان علم و فن اپنے کام و دہن سیراب کرتے رہتے۔ شیخ المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا قیام بھی نواب صاحب کے یہاں اکثر و بیشتر رہتا۔ خسروؔ کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں علم و فضل، مذہب و تصوف کا ایسا صاف ستھرا اور پاکیزہ ماحول ملا۔ بزرگ نانا کی شفقت اور اس پاکیزہ ماحول کی برکت سے خسروؔ کی فطری ذہانت اور خداداد صلاحیت کی جلا ہوئی۔ انھوں نے کم سنی ہی میں تمام مروجہ علوم و فنون حاصل کئے

[1] دیباچہ غرۃ الکمال۔ بعض نسخوں میں "ماندہ" کی بجائے "ماند" ہے۔

صرف ونحو، فلسفہ، منطق، ادب، تاریخ وغیرہ میں کمال حاصل کرلیا۔ مذہب وتصوف، شریعت وطریقت کے وہ سالک ہوگئے۔ موسیقی میں اختراع وایجاد سے شہرۂ آفاق ہوئے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی ایسا علم وفن ہو، جس پر انھوں نے دسترس نہ حاصل کی ہو۔ وہ بہت سی زبانیں جانتے تھے۔ ترکی، فارسی تو خیر ان کی مادری زبانیں ہی تھیں۔ عربی پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں سے واقفیت تھی۔ سنسکرت میں بھی مہارت تھی۔ لیکن انھیں ہندوی (ہندی) سے بہت لگاؤ تھا۔ ہندوی زبان کے جاننے پر وہ فخر بھی کرتے تھے۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم، کز عرب گویم سخن

ہندوی میں، نغز گوئی طرۂ امتیاز سمجھتے ہے

"چو من طوطی ہندم راست۔ پرسی
زمن ہندوی پرس تا نغز گویم"

اس طوطی ہند کی روانی ہر وقت، ہر جگہ شعر کے سانچے میں ڈھلتی رہتی تھی۔ دس سال کی عمر سے ہی عروس سخن کے گیسو سنوارنے میں ایسا کمال حاصل کرلیا تھا، اور اتنی جلد بامعنی شعر موزوں کرلیتے تھے کہ لوگ حیرت زدہ ہوجاتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن ہی میں خواجہ اعزالدین نے امتحاناً چار غیر متناسب الفاظ، مو، بیضہ، تیر اور خربزہ، نظم میں موزوں کرنے کے لئے دیئے۔ خسروؔ نے برجستہ یہ رباعی کہی۔

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است
صد بیضۂ عنبریں براں موئے ضم است
چوں تیر بداں راست دلش زیرا
چوں خربزہ دندانش میان شکم است

رباعی سن کر خواجہ کو سخت تعجب ہوا۔ انھوں نے خسروؔ کی بے حد تعریف کی۔ اور ان کو دعائیں دیں۔

خسروؔ کی شاعرانہ فطرت میں علمی وادبی ماحول نے چار چاند لگا دیئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضری نے خلوص وصداقت، درد واثر اور سوز وگداز عطا کیا۔

امیر خسروؔ نے بڑی عمر پائی۔ انھوں نے غیاث الدین بلبن سے لے کر غیاث الدین تغلق کے زمانے تک گیارہ سلاطین کا زمانہ دیکھا۔ بادشاہوں کا عروج وزوال یکے بعد دیگرے کئی خاندانوں کی حکومت، سب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن ان کی علمیت وقابلیت، دانشمندی وذہانت اور ان سب سے بڑھ کر ان کی پارسائی [illegible] کی تھی کہ ہر سلطان نے انھیں عزت واحترام کے قابل سمجھا اور ان کو اپنے ساتھ رکھنے میں سعادت وشرف کا باعث سمجھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خسروؔ بے لوث انسان تھے۔ یکتائے روزگار تھے۔ روحانیت کے تاجدار تھے۔ سیاست سے واسطہ نہیں رکھتے تھے، امور سلطنت میں دخل دینے اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اپنے عادات وخصائل کے اعتبار سے وہ مجسمۂ شرافت وانسانیت تھے۔ ان کی شخصیت ہشت پہل نگینہ کی طرح ہے۔ ان جیسا صاحب کمال، ظاہری وباطنی علوم کا ماہر، مرنجاں مرنج، ہر دلعزیز، بے تعصب، بے ریا، نیک اور پارسا، غرض صفات حسنہ کا مجموعہ صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں امیر خسروؔ:۔

"امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار، شعر وادب کے دیوان اس کی ادبی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبہ روحانی سے آگاہ، مشاعرہ آجائے تو میر محفل اسے پائے، خاندان چشت اہل بہشت کے کوچے میں آنکلے تو حلقہ ذکر وفکر میں سرِ مسند جلوہ اس کا دیکھے۔ اچھے اچھے شیخ اس کا دم بھر رہے ہیں۔ معرفت وطریقت کے خرقہ پوش کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں[1]"

خسروؔ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی حب الوطنی ہے۔ اپنے وطن ہندوستان سے انھیں بے پناہ اور والہانہ محبت تھی۔ جس پاکیزہ ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے، جن بزرگوں کی صحبت سے وہ مستفیض ہوئے تھے ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ وطن کی محبت کو اپنا ایمان سمجھیں۔ اور ے

خاک وطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل وریحاں خوشتر

کو حرز جاں بنائیں۔ شاعری کی طرح وطن کی محبت بھی خسروؔ کی طبیعت میں طوفان اضطراب بپا کئے رہتی تھی۔ انھوں نے ہندوستان اور اس کی ایک ایک چیز کی جیسی اور جتنی تعریف اور بڑائی کی ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اس عقیدت کے ساتھ لکھی ہو۔ انھیں یہاں کے ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ سے عشق تھا۔ وہ ہندوستان کو تمام دنیا سے بہتر اور افضل سمجھتے تھے۔ یہاں کے انسان، مذہب، رسم ورواج، طور وطریق، زبان، لباس، عمارتیں، باغات، چمن، میوے، پھل، پھول، پرندے، جانور، دریا، پہاڑ، سبزہ زار، میدان، غرض ہر چیز ان کی نظر میں تمام دنیا سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔ اپنے وطن اور وطن کی ہر چیز سے یہ والہانہ محبت اسی کو ہوسکتی ہے جو سچا محب وطن ہو۔ جسے اپنے وطن کے بنانے اور سنوارنے کی دھن ہو۔ جو اس کی تعمیر وترقی، فلاح واصلاح کا دل سے خواہشمند ہو۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے خسروؔ کی حیات، ان کے خیالات اور کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کے وہی ایک ایسے اور پہلے سپوت نظر آتے ہیں جنہوں نے مادر وطن کی عظمت وفضیلت کو دلائل وبراہین سے ثابت کردیا کہ خطۂ ارض پر ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کی بارش کی ہے اور جس کو ہر قسم کی دولت اور خوبی سے مالا مال کیا ہے۔

یوں تو ارباب حکومت اور سلاطین سے وابستگی کی وجہ سے وہ ہندوستان

---

[1] نقوشِ ماجد (ص ۲۱۸-۲۱۹)

کے مختلف مقامات پر جاتے رہے اور وہاں کے حالات و کوائف سے واقفیت حاصل کرتے رہے۔ لیکن ان کا مستقر دہلی رہا۔ وہ خود دہلی میں پروان چڑھے تھے۔ اسی لئے قدرتاً انہیں دہلی اور دہلی والوں سے زیادہ محبت تھی۔ دہلی کی تعریف میں ان کا تمام بڑا پرجوش و نشاط انگیز ہو جاتا ہے۔ قران السعدین میں لکھتے ہیں کہ "دہلی اپنی صفات اور خصوصیات میں باغِ ارم کی طرح ہے۔ یہ عدن کی جنت ہے۔" انتہا یہ ہے کہ خسرو نے۔ دہلی کو مکہ معظمہ سے بھی زیادہ محترم بتایا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

"اس بوستان کا قصہ سن کر مکہ بھی اس کا طواف کرنے لگے۔"

یہاں کی آب و ہوا، پھول، میوے، باغات، عمارتوں اور باشندوں کی تعریف کی ہے۔

حضرت دہلی کنفِ دین و داد
جنت عدن ست کہ آباد باد
گر شنود قصہ ایں بوستاں
مکہ شود طائف ہندوستاں[1]

عمارتوں میں قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، حوض شمسی، قصر نو کی تعریف کی ہے۔ اسی طرح مردان و تبانِ سادہ دہلی کے لئے لکھتے ہیں:

مردم او جملہ فرشتہ سرشت
خوش دل و خوشخوے چو اہلِ بہشت
بیشتر از علم و ہنر بہرہ مند
و اہلِ سخن خود کہ شمارد کہ چند

چوں ز سخن بگذری آہنگ و ساز | نغمۂ مرغانِ بریشم نواز
و از ہنر نیزہ و پیکان و تیر | ہر کہ درآمد بہ نظر بے نظیر[2]

خسرو نے ہندوستان کی عظمت و فضیلت کے اسباب بھی بتائے ہیں کہ اسے دنیا کے تمام ملکوں پر کیوں برتری اور بڑائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ میں ہندوستان کو روم، خراسان، ختن، عراق و خطا سے کیوں بہتر سمجھتا ہوں۔ جو صاحب انصاف ہیں وہ میری تعریف کرتے ہیں۔ لیکن جو کینہ پرور اور حاسد ہیں وہی نفرین کرتے ہیں۔"

منصف داننده به تحسیں کشدش | حاسد پر کینہ بہ نفریں کشدش

خسرو کے نزدیک ہندوستان کی ترجیح کے دو نمایاں اسباب ہیں:

دو ہم باعث ایں کار شدہ | کاں دو سبب حجت گفتار شدہ
آں ست یکے کیں زمین از دہر زمن | ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن
دیں ز رسول آمدہ کای زمرۂ دیں | حب وطن ہست ز ایماں بہ یقیں
من حد خود کردم ازیں روی علم | گر وطنے ہست ترا گوئی تو ہم
دوم ایں کیں زمیاں قطب نماں | ہست چو راجح ز ہر ملک جہاں
گرچہ کہ ترجیح براجح نہ روا | از پے تاکید شد ایں بانگ و نوا

معذرت خود ہمہ دادم چو بروں | ہاں بگذا کنوں روش سحر و فسوں[3]

وہ اسی پر بس نہیں کرتے۔ وہ ہندوستان کی فضیلت علوم و فنون کی مرکزیت ایجادات، نغمہ و سرود اور دوسرے کمالات کی وجہ سے بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کم از کم دس خوبیاں ایسی ہیں جن میں ہندوستان یکتائے زمانہ ہے:

(۱) پہلا سبب یہ ہے کہ یہ ملک علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ہمیشہ علم کی اتنی فراوانی رہی ہے کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اولش آں شد کہ دریں ملک درون | علم ہمہ جاست ز اندازہ فزوں
لیک دگر جائے ندارند خبر | زانکہ کہ در ہند علوم است و ہنر

(۲) دنیا میں ہندوستانیوں ہی کی یہ صفت اور خصوصیت ہے کہ وہ ہر زبان کو آسانی کے ساتھ سیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ دوسرے ملکوں کے باشندے اس خوبی سے محروم ہیں وہ نہ تو یہاں (ہندوستان) کی زبان اتنی جلد سیکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔

ہست دوم آنکہ ز ہند آدمیاں | جملہ بگویند زباں ہا بہ بیاں
لیکن از اقصائے دگر ہیچ کسے | گفت نیارد ز سخن ہند بسے
زہرہ نہ باشد دگرے را کہ گہے | از سر قوت کند ایں سو نگہے

(۳) دنیا میں ہندوستان ہی صرف ایسا ملک ہے جو ہمیشہ سے علوم و فنون کا مرکز رہا۔ دنیا کے چپے چپے سے لوگ یہاں علم حاصل کرنے کے لئے آتے رہے ہیں۔ کسی ہندوستانی کو کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ تحصیل علم کے لئے باہر کسی دوسرے ملک میں جائے۔

حجت سوم شنو از من نخرد | کاں ز رہِ عقل قبول است نہ رد
کایں طرف از ہر طرفے اہلِ ہنر | در طلب علم و ہنر کردہ گزر
لیک بہ تحصیل حکم برہمن | ہیچ ز ہند نہ شد ایچ طرف

(۴) ہندوستان ہی کو یہ فخر و شرف حاصل ہے کہ وہ علم ہندسہ، ریاضی اور صفر کا موجد ہے:

حجت چارم رقم ہندسہ ہیں | کاہل جہاں وضع ندیدند چنیں
ہم بیکے صفر کہ نقشے ست تہی | بیں ہمہ رموز است خوش خطیش دہی
علم ریاضی کہ خرد شد خوش ازو | وضع مجملی شد و اقلیدس ازو
آں ہمہ علم و عددش زیر و زبر | نزیں رقم از نیست خلا صفر نظر
چوں حکما جملہ ازو جستہ مدد | پس ہمہ شاگرد برہمن بہ عدد

(۵) کلیلہ دمنہ جیسی مفید، دلچسپ اور بے مثل کتاب نہیں لکھی گئی جس سے تمام دنیا مستفید ہوئی ہے:

حجت پنجم بہ بیاں شرح کنم | معنیاں زانجہ دہ جسرح کنم
دمنہ کلیلہ ز ددد و دام سخن | دانکہ ہم از ہند شنا ہیست کہن
حکمت ازیں بہ چہ بود کز ہمہ سو | سوے نحے آرند حکیماں ہمہ رو

(۶) علم و فن ہی نہیں ہندوستان نے ایسے ایسے کھیل ایجاد کئے ہیں، جو انسان کے ذہن و دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ اور اس کا فہم غلط کرتے ہیں:

---

[1] قران السعدین ص ۲۸ تا ۲۲ [2] قران السعدین ص ۲۸ تا ۲۲ [3] حبا لھند مثنوی نہ سپہر ص ۱۴۹ تا ۱۵۰

حجت شش بازی شطرنج شنو — رنج که از سینه برد رنج شنو
گرچه به اندازه اقلیم دگر — وضع شدی جامۂ نرا باب ہنر
برتری از ہند بجستند ہمہ — معترف عجز نشستند ہمہ

(۷) چوتھی، پانچویں اور چھٹی حجت یعنی ہندسہ، کلیلہ و دمنہ اور شطرنج سے تمام دنیا کو فائدہ پہنچا۔ خسرو نے ان تینوں ایجادوں کے مجموعی فوائد کو ساتویں حجت بتائی ہے:

حجت ہفت آنست کہ کس ہرسہ ہنر — ہندسہ و دمنہ و شطرنج نگر
خلق جہاں راست چو دستور شدہ — رونق ہر خانہ معمور شدہ
جملہ جہاں زیں دو سہ ترتیب گزید — فائدہ گیری بود از ہند زمیں

(۸) ہندوستان کی فضیلت کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ:

حجت ہشت آنکہ سرود خوش ما — کوست بسوز دل و جان آتش ما
ہر ہمہ دانستہ کہ در جملہ جہاں — نیست بریں گونہ و ایں نیست نہاں

اس سرود کو غیر ملکی، برسوں سیکھتے رہیں تو بھی

زہرہ نہ بودش کہ کیے صوت سبک — گرم بگیرد زچہ از طبع خنک

(۹) ہندی نغمہ تو اپنی تاثیر میں تیر بہدف ہے۔ انسان، حیوان سب اسکے شکار ہیں۔

حجت نہ آنست کہ از نغمۂ تر — تیر خورد آہوئے صحرا بہ جگر
دوختۂ زمزمہ بے تیر و کماں — جان دہد از زخمہ آں ہم بزباں

خسرو نے سرود و نغمہ تر میں اپنی اختراع پسند طبعیت سے نئی نئی چیزیں ایجاد کیں۔ آج تک ان راگ راگنیوں میں ان کی ایجادات پر فخر کیا جاتا ہے۔

(۱۰) خسرو جیسا شہنشاہ اقلیم سخن و جادو نگار شاعر اسی سرزمین ہندوستان کی آغوش میں پروان چڑھا، جس کا ثانی دنیا کے پردے پر نہیں ہے۔

حجت دہ آنکہ چو خسرو بہ سخن — سحر گرے نیست نہ چرخ کہن
گرچہ عطارد بتہ آید زفلک — زیں دم صدقش نبود شبہ و شک

خسرو جیسے سحر طراز شاعر اور ہمہ صفت انسان نے ہندوستان کی فضیلت اور ترجیح کے انھیں دس اسباب بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، وطن کی تعریف کرنے میں ان کا جی نہیں بھرتا ان کا قلم اور وطن کی محبت میں اتنا سرشار ہے کہ وہ اسے جنت سے بھی بہتر ثابت کر دیتا ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ میرا ہندوستان سچ مچ دنیا میں جنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ قدرت نے اپنی فیاضیوں سے اس کو اتنا زیادہ نوازا ہے کہ جنت کو بھی اس پر رشک آتا ہے بلکہ ہندوستان میں سات ایسی خوبیاں ہیں جن سے وہ کرۂ ارض پر جنت کہے جانے کا مستحق ہے۔

کشور ہند است بہشتے بزمیں — حجتش اینک برخ صفحہ ببیں
حجت ثابت چو ازیں نیست شکے — ہفت بگویم بدرستی نہ یکے

حجت اول یہ ہے کہ جب حضرت آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تو اسی ملک کی آغوش میں انھیں بھیجا گیا۔ اور یہیں ان کو امن اور سکون نصیب ہوا۔

اوتش انیست کہ آدم بجناں — چوں ز عصی خستگی یافت چناں
آمدن اندر بہ بہشتش بُد از آں — کاں گل جنت کہ ز دش باد خزاں
گر بجز آساں و عرب یا کہ و چیں — یک نفسے بہرہ گرفتی بزمیں
گرمی و سردی خراساں و عرب — و اگر بسے و چیں عذابیست عجب
ہند چو از خلد نشاں بود درو — زمرا اندیشہ قدم آسود درو
ورنہ بداں تازگی ار جائے دگر — آمدی ار رنج فتادی بہ ضرر

دوسری اور تیسری دلیل یہ دی ہے کہ جنت الفردوس کے جانور، مور اور سانپ کا مسکن بھی ہندوستان ہے۔ اگر ہندوستان جنت کی طرح تمام خصوصیات نہ رکھتا ہوتا تو نہ تو مور یہاں رہ سکتا تھا اور نہ سانپ۔

حجت دیگر کہ ز طاؤس کشم — مرغ خرد را بہ زمیں بوس کشم
گر نہ بہشت است ہمیں ہند چرا — از پے طاؤس جناں گشت سرا
بود ہمیں جا چو نہ فردوس اثرے — جانب دیگر نہ فتادش گزرے
حجت انیست سیوم گر بہ شکیے — کامدن مار ز باغ فلکے
ہند کہ صد راحت جاں زاد درو — مار زیاں کار نیفتاد درو
ما بسے ہست گر ایں جا بزمیں — مار ہاں حی طلبد بندہ نہ ایں

چوتھی حجت یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان سے باہر نکلے تو وہ فردوس کی تمام نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ یعنی ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے مقام یا ملک کو یہ خصوصیت نہیں حاصل ہے کہ وہاں جنت کی کوئی خوبی پائی جائے۔ اسی لئے حضرت آدم کو محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔

حجت چارم مگر انیست کہ چوں — زد قدم آدم ز حد ہند بروں
بعد دو سہ روز دراں نو سفرش — چاشت نشد جز بجد شام درش
نعمت فردوس کہ بودش بہ شکم — از گشت کشت دراں ناحیہ کم
آنچہ فرو ریخت از انگشت تلی — راست چو بررفتہ بیالا جبلی
بر دگماں کانست مگر خلد دگر — بد نبود ایں جا زخیاں مایہ اثر
گر نہ بہشت است ہمہ ہند چرا — در صدش آں بازنیفتاد روا

پانچویں حجت یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین عیش و عشرت مسرت و انبساط کی سرزمین ہے۔ یہاں وہ تمام سامان نشاط و سکون موجود ہیں جن سے دل کو فرحت، دماغ کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے۔ عطریات اور خوشبویات کی یہاں ایسی اور اتنی فراوانی ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ مثلاً روم، دمشق اور دمشق وغیرہ بھی چمن اور باغات کے لئے مشہور ہیں، لیکن وہاں صرف دو تین مہینے ہی پھول رہتے ہیں۔ جبکہ ہندوستان کی سرزمین خوشبودار پھولوں سے ہمیشہ گل و گلزار رہتی ہے۔

حجت پنجم شنو کیں کہ ہمہ کس — نزد ہمہ خلق رسیدہ است نفس
ہند ہمہ سال کہ گل روئے بود — زیں بود و گل ہمہ خوشبوئے بود
نے چو سے در روم کہ گل نیست دراں — جز دو سہ ماہے کہ درآید گزراں
واں ہمہ زاں سال کہ گل لالہ شناں — بوئے ندارد زنیم وزالہ نشاں

چھٹی حجت یہ ہے کہ ہندوستان میں انواع و اقسام کی نعمتیں پائی جاتی ہیں۔ دنیا کا کوئی خطہ اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ ان نعمتوں نے اس کو رشکِ جناں بنا دیا ہے۔

ہشت ششم حجتم کایں ہست غبر   زاحد مرسل ؐ بہ تحقیق خبر
نعمت دنیا کہ بہ آمیت سزا   از پئے گیراں است ہشتی بجزا
بس بہمہ حال زخوبی و بہی   ہند بہشت است باثبات رہی

ساتویں حجت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک تمام دنیا ایک قید خانہ ہے لیکن ہندوستان کو وہ بھی خلد بریں سمجھتے ہیں۔

حجت ہفتم شنو ایں محکم و بہ   پیش تو آرا سنہ چوں رشتہ بہ
کانچہ در ہند مسلمانست بہ حق   تا بہ قیلش از ازہانست رمق
گرچہ کہ بر نسبت فردوس نہاں   باہمہ لطفیش چو زنداں است جہاں
لیک بہ ہند است نیمیش دگر   کانش دروں می دہد از جنت اثر
زاں سبب خاص بہ اصحاب یقیں   ہند تواں گفت کہ خلد است بریں[1]

خسرو نے دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان دنیا کی جنت ہے۔ پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور ساتویں حجت مذہبی حیثیت رکھتی ہیں اور پانچویں، چھٹی دنیوی جس میں ہندوستان کی پیداوار اور نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔

کسی ملک میں انواع و اقسام کی پیداوار نعمتیں، اس کی بہترین زمین، موسم، اور آب و ہوا پر منحصر ہے۔ خسرو نے اس اعتبار سے بھی ہندوستان کا جائزہ لیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے بدلائل ہندوستان کو جنت ثابت کیا ہے۔ اب میں اس کی آب و ہوا کی خصوصیات بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اس حیثیت سے بھی ہندوستان اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ خراسان اور دوسرے ممالک سے دس اسباب کی بدولت یہاں کی آب و ہوا بہتر اور مفید ہے۔

ہند چو فردوس شد از حجت من   بہر ہوائیش کنوں آیم بہ سخن
دہ شمرم حجت قاطع کہ درو   بہ ز خراسانست ہوا، در ہمہ سو

پہلی حجت یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کی سردی نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔

اولش آں شد کہ درو آدمیاں   از دمۂ سردِ نہ بینند زیاں

دوسری حجت ہے کہ ہندوستان کی گرمی، خراسان کی سردی سے بہتر ہے۔ خراسان کی سردی جان لیوا ہوتی ہے۔ سردی کی شدت سے لوگ اکڑ جاتے ہیں۔ اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

دویم ست آں کاہل خراساں اگر   ہر کہ بداں سوست ز سرما شدہ کر
خندہ دایں گفت و بیاں اجاں   طعنۂ گرماش زند شعلہ زباں
آنکہ بر گرماست ہمار بخش و بس   لیک سود کشتہ ز سرما ہمہ کس

تیسری حجت یہ ہے کہ ہندوستان کی سردی بے ضرر ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ یہاں کی سردی اور سرد ہوا فرحت بخش ہے۔

سیومش آں کیں طرف از بیمِ ہوا   کم طلبد مفلس کم مایہ نوا
بر لبِ جوز آب خنک برہنہاں   غسل کنند آخر شب غوطہ زناں
خود گر گرما نبود شاں غم خز   سایۂ شاخے بس و از کلبہ دوگز

چوتھی، پانچویں اور چھٹی حجت میں ہندوستان کے سدا بہار پھولوں کی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں سال بھر گل و مل کی بہار رہتی ہے۔ یہاں کے پھول، گل بابونہ کی طرح خوش رنگ و دلکش ہوتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خشک ہو جانے پر بھی، خوشبودار رہتے ہیں۔

چارم شاں کیں طرف از سبزہ گل   ہست ہمہ سال بہار گل و مل

پنجمش ایں کاں گل شاں رنگ بروی   رنگ خوش چوں گل بابونہ دروی

حجت ششم ایں کانکہ اگر ہست دراں   خشک شود، بو نزند بحراں
ایں گل با لعضے اگر خشک شود   طبلہ دروں تا فہ از مشک شود

ساتویں اور آٹھویں حجت میں ہندوستان کے تر و تازہ میوے اور پھل کا ذکر ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان میں خراسان کے سب میوے پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ خراسان میں ہندوستان کا ایک میوہ بھی نہیں ہوتا۔

ہفتمش آں کاں طرف از میوہ تر   نیست چو امرود چو انگور دگر
میوہ دگر کم نگری کہ مجلسش   لاچی و کافور و تر نفل بدلش

ہشتمش آں شد کہ لبے میوۂ شاں   ہست بہ ہند دسوی شاں زیں نشاں

ہندوستان میں دو نادر تحفے ہوتے ہیں۔ ایک کیلا دوسرا پان، نویں اور دسویں حجت میں خسرو نے کیلے اور پان کو ہندوستان کا بے مثل تحفہ بتایا ہے۔

ہست نہم آنکہ دریں کشور خوش   ہست دو تحفہ کہ بود نادرہ دش
میوہ بے خستہ کہ نہ بود در جہاں   برگ کہ چوں میوہ خورد میہماں
موز ہماں میوۂ بے خستہ نگر   برگ ز تنبول نگر نائب خود
ہست دہم آنکہ چوں تنبول گزیں   میوہ نہ باشد بہمہ روئے زمیں[2]

خسرو نے پان کی تعریف، اپنی ایک اور مثنوی قران السعدین میں بھی کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ ہندوستان کی بہترین نعمت ہے۔ کہنے کو تو گھاس ہے۔ لیکن انتہائی مفید، اس کے کھانے والا جذام اور برص سے محفوظ رہتا ہے۔ اس سے خون خوب پیدا ہوتا ہے۔ یہ منہ کی بدبو کو دور کرتا ہے اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے کھانے سے بھوک زیادہ ہو تو کم بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے کھانے سے بھوک بڑھتی بھی ہے۔ اس کو چھوٹے بڑے امیر غریب، شاہ و گدا سب پسند کرتے ہیں۔

نادرہ برگے چو گل بوستاں   خوب تریں نعمت ہندوستاں
تیز چو گوش فرس تیز خیز   صورت و معنی بصفت ہر دو تیز

---

[1] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۷، [2] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۵۸ تا ۱۶۱

تیزی او آلت قطع جذام — قول نبی رفت علیہ السلام[1]

طرفہ بناتے کہ شد در دہن — لونش چو حیوان بدر آید ز تن

خوردن آں بوسۂ دہن کم کند — ہستی دنداں ہمہ محکم کند

سیر شود گرسنہ در دم شود — گرسنہ را گرسنگی کم شود

حرمتش از پیشگہ پایہ گاہ — ہم بگدا محترم و ہم بہ شاہ[2]

دول رانی خضر خاں میں بھی تنبول کے متعلق لکھتے ہیں ۔

خراسانی کہ ہندی گیردش گول — نخسے باشد بہ نزدش برگ تنبول

شناسد آنکہ مرد زندگانی است — کہ ذوق برگ خاقی ذوق جانی است[3]

مختلف مقامات کے پھول، پھل اور میوہ جات کا ذکر خسرو نے قریب قریب تمام مثنویوں میں کیا ہے ۔ وہ اپنے وطن کی ایک ایک بات کو بڑے کیف و نشاط کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور وطن کی حکایت انھیں اتنی لذیذ ہے کہ بار بار بیان کرنے پر بھی ان کا جی نہیں بھرتا ۔

ہندوستان زبانوں کا جزیرہ رہا ہے، اس وسیع و عریض ملک کے ہر خطے کی زبان جدا جدا بولی الگ الگ ہے خسرو نے ہندوستان کی عظمت کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ اس ملک میں جس کثرت سے مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ دنیا کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتیں ۔ انھوں نے یہاں کی زبانوں کی کثرت اور خوبیاں بتاتی ہیں ۔ خاص طور پر ہندوی، پارسی، عربی، سندھی، لاہوری، کشمیری، کبر، دھور سمندری، تلنگی، گجر، معبری، گوری، بنگالی، اودھ اور سنسکرت کا تذکرہ کیا ہے ۔ سنسکرت کو وہ برہمنوں میں سے بھی صرف چند کی زبان بتاتے ہیں لیکن اس کی وسعت اور شیرینی کے قائل ہیں اس کو عربی سے تو نہیں فارسی سے بہتر سمجھتے ہیں ۔

آنست زبانے بہ صفت دردری

از عربی کمتر و برتر زدری

تمام زبانوں کا ذکر تاریخی اعتبار سے اس طرح کیا ہے ۔

ہند ہمیں قاعدہ دارد بہ سخن — ہندوی بود است در ایام کہن

غوری و ترک آمد و شاہان جہاں — پارسی بود بہ ہندار دہاں

الغرض از پارسی و ترک و عرب — بہرہ باشد کہ کنم دل بطرب

من چو ز ہندم بود آں بہ کہ کسے — از محل خویش برآرد نفسے

سندی و لاہوری و کشمیری و کبر — دھور سمندری تلنگی و گجر

معبری و گوری و بنگال و اودھ — دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد

ایں ہمہ ہندویست کہ ز ایام کہن — عامہ بکار است بہر گونہ سخن

نیک زبانیست دگر کز سخناں — آنست گزیں نزد ہمہ برہمناں

سنسکرت نام ز عہد کہنش — عامہ ندارد خبر از کن مکنش

ہر ہنش داند و ہر بر ہمنے — نیز نداند صد ز اناں سخنے[4]

مثنوی دول رانی خضر خاں میں، خوبی زبان ہند کو دالہانہ انداز میں بیان کیا ہے ۔

غلط کردم گر از دانش زنی دم — نہ لفظ ہندیست از پارسی کم

بجز تازی کہ میر ہر زبانست — کہ بر جملہ زبان ہا کامرانست

زبان ہند ہم تازی مثالی است — کہ آمیزش در آنجا کم مجالی است[5]

دگر پرسی بیانش از معانی — وراں نیز از دگر ہا کم ندانی

اگر از صدق و انصاف دہم شرح — حد ہندی کنی گفتار من جرح

کسے کز زنگ ہندوستان بود دور — ز نیل و دجلہ لاقد ہست معذور

چو در چین دید بلبل بوستاں را — چہ داند طوطی ہندوستان[6] را

جس ملک میں بکثرت زبانیں بولی جاتی ہوں، وہاں کے باشندوں کو یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف و متضاد زبانوں کو آسانی کے ساتھ بول سکیں، ہندوستانیوں میں بھی یہ خصوصیت اور صفت پائی جاتی ہے کہ وہ ہر زبان (ملکی یا غیر ملکی) آسانی سے سیکھ لیتے ہیں ۔ اس کو بے تکلف بول سکتے ہیں ۔ ان کا تلفظ اور لہجہ درست ہوتا ہے ۔ امیر خسرو نے اس صفت میں بھی ہندوستان اور ہندوستانیوں کو تمام دنیا سے بہتر اور افضل بتایا ہے ۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے ۔ بلکہ یہاں کے جانوروں کو بھی دوسرے ملکوں کے جانوروں سے چند خصوصیات کی بنا پر برتر بتاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انھوں نے طوطا، شارک، کوا، گوریا، مور، بگلا، مرغ، سقا (پانی بھرنے والا پرندہ)، گھوڑا، بکری، بندر اور ہاتھی، وغیرہ کی خوبیاں اور خصوصیات لکھی ہیں انھوں نے ایک ایسے جانور کا بھی ذکر کیا ہے جو ہرن کی شکل کا ہوتا ہے اور گینڈے کی طرح ہوتا ہے ۔

طوطے کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ہیں سخنش بر صفت آدمیاں — ہر چہ شنیدہ است بگوید بہ بیاں

فاتحہ و اخلاص و دعا در دہنش — با من و تو لیک چو من و تو سخنش

اسی طرح انھوں نے ہر جانور کی خصوصیت لکھی ہے ۔

خسرو کا مسلک صلح کل رہا ہے، وہ انسانیت اور انسانی عظمت کے قائل ہیں وہ خدا کے ہر بندہ سے محبت کرتے ہیں ۔ ان کا دل نفرت و تعصب سے پاک ہے محبت اور خلوص سے لبریز ہے ۔ ان کے یہاں من و تو کا جھگڑا نہیں ہے ۔ وہ اپنے وطن ہندوستان کو اس لحاظ سے بھی عظیم اور برتر بتاتے ہیں کہ یہاں کے مردوں، عورتوں اور جوانوں سب میں اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں ۔ وہ بڑے وفادار، خلیق، شجاع، خوبصورت اور مہمان نواز ہوتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل ہنود کا شنویہ، پارسی، عیسائی، مجسمہ پرست مشتبہ جیسے فرقوں سے موازنہ کیا ہے اور ان سب سے ان کو بہتر ثابت کیا ہے ۔

معترف وحدت و ہستی و قدم — قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم

---

[1] حدیث نبوی میں ہے کہ ہندوستان میں ایک درخت ہے جس کے پتے گھوڑے کے کان کی طرح ہوتے ہیں اور اس کے کھانے والے جذام و برص سے محفوظ رہتے ہیں ۔ [2] قران السعدین صفحہ ۱۸۵-۱۸۹ ۔ [3] دول رانی خضر خاں صفحہ ۲۴ [4] نہ سپہر صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۱) [5] دول رانی خضر خاں صفحہ ۴۱ ۔ ۴۳ ۔

رازی ہر چیز جز بہ ہنر سے ۔۔۔ غرہ بھوجان و ہر جا فور سے
خامل خیار ند مجازی بہ عمل ۔۔۔ عالم ہر کلی و جز وی زازل

وطن دوں قرآں پر ترجیح کے اسباب۔

از شنویہ بدوی رفتہ سخن ۔۔۔ گفتہ یکے ہندو دشکرہ بجن
عیسویاں روح ونذبیتہ برد ۔۔۔ ہندو ازیں جنس نہ پیوستہ بند
قوم مجسم زرفم جسم زدہ ۔۔۔ برجناں نے دم ازیں قسم زدہ
اختریاں صفت خدا کردہ یقین ۔۔۔ ہندو کی توحید سرا فکر ازیں
عنصریاں چار خدا بردہ گماں ۔۔۔ گفتہ یکے ہندو ثابت بہاں
قوم مشبہ سوئے تشبیہ شدہ ۔۔۔ ہندو ازیں ہاشش بمنزیہ شدہ
وانچہ کہ معبود برہمن بفرق ۔۔۔ معترف است او کہ ز شلست زرق

خسرو کی وسیع المشربی، انسان دوستی اور ہندستان سے بے پناہ محبت کا سرچشمہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا جذبہ حب وطن ہے۔ ان کے اس جذبہ کو تقویت اسلام نے عطا کی۔ بزرگوں کی صحبت اور حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیم و تربیت، نے خدا ترسی، تصوف اور روحانیت نے پختگی عطا کی۔ وہ اپنے وطن ہندوستان کے ایسے گرویدہ اور عاشق تھے کہ اس کی ایک ایک چیز میں انھیں محاسن ہی محاسن نظر آتے تھے وہ ہندوستانیوں کو علم و عمل کا پیکر، کردار و گفتار کا دھنی، شرافت و انسانیت کا مجسمہ بتلاتے ہیں، وہ ہندوستان کی ترقی و تعمیر کے دل سے خواہاں ہیں، وہ اس کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے، کوشاں ہیں۔

"دیلی را بچشم مجنوں باید دید"

جس طرح صحیح ہے، اسی طرح "ہندوستان را بچشم خسرو باید دید" بھی صحیح ہے ان کی ہر تصنیف میں کسی نہ کسی نہج سے ہندوستانی کی مدح و ستائش موجود ہے[1] میں نے خسرو کو عظیم اور سچا محب وطن اسی لئے کہا ہے کہ آج تک کسی ایک شخص بلکہ ایک جماعت نے ہندوستان کی اتنی زیادہ خصوصیات نہیں بیان کی ہیں اور اس کی ایک ایک چیز سے یہ نہیں ثابت کیا ہے کہ وہ تمام دنیا سے افضل و بہتر ہے۔ کہنے کو تو دنیا کی جنت بہتوں نے کہا لیکن سب سے پہلے ثابت صرف خسرو نے ہی کیا۔ اور یہ فرض وہی انجام دے سکتا ہے جس کا دل حب وطن سے سرشار ہو، جس کا مطالعہ و مشاہدہ گہرا ہو۔ جو روحانیت و انسانیت دونوں کا علمبردار ہو، اور جس کو خدا نے ہمہ صفت موصوف انسان بنایا ہو، ایسی جامع الصفات ہستی صدیوں بعد پیدا ہوتی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

چمن ہند کے اس دیدہ ور کے نغمات اور اس کی تعلیمات آج بھی دلوں میں "حب وطن" کے جذبات بیدار کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ۔۔۔ ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

---

[1] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۹۴ - ۱۹۶ [2] خسرو کی ان تصانیف میں ہندوستان اور اس کے متعلق باتوں کا ذکر ہے۔ مثنوی قران السعدین، مفتاح الفتوح، شیریں خسرو، ہشت بہشت، نہ سپہر، دول رانی خضر خاں، نہایت الکمال اور غرۃ الکمال۔

امیر خسرو دہلوی کی ساتے سو سالہ تقاریب کی قومی کمیٹی

سرپرست اعلیٰ
شری فخر الدین علی احمد

سرپرست	شری بی۔ ڈی جتی ۔ شیخ محمد عبد اللہ
صدر	شری علی یاور جنگ
نائب صدر	ڈاکٹر کرن سنگھ ۔ شری اندر کمار گجرال ۔ شری دیو کانت بروا ۔ پروفیسر نور الحسن ۔ شری محمد یونس سلیم
جنرل سکریٹری	ڈاکٹر ظ۔ انصاری ۔ شری حسن الدین احمد
خزانچی	ڈاکٹر یوسف نجم الدین

ارکان

پروفیسر خلیق احمد	ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی	ڈاکٹر مسعود حسین	پیرضامن نظامی
شہریار جعفری	شری ٹی۔ اے۔ واحد	شری کے بی۔ برہسپتی	شری عبد الحلیم جعفر خاں
شری پربھاکر ماچوے	شری غلام رسول نازکی	قاضی عبد الودود	شری یشپال

ڈاکٹر نذیر احمد

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

تالیفات خسرو کا ایک جائزہ

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ فارسی شاعری کا انداز چودھویں صدی عیسوی میں ہندستان کی سرزمین میں وہی رہا جو اس وقت ایران میں تھا۔ شیخ سعدی شیرازی کی ادبی شخصیت ایران پر جس طرح حاوی رہی اسی طرح امیر خسرو دہلوی کا سکہ ہندوستان میں جاری رہا۔ خسرو کا زمانۂ شباب سعدی کے عالم شیب سے ملا ہوا تھا۔ دونوں شخصیتیں فطرت کے شعر پرور رجحانات کا شاہکار تھیں۔ جو ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں۔ بلکہ مدتوں کے بعد ایک تہذیب ایک تمدن اور ایک ثقافت کی یادگار بن کر سامنے آتی ہیں۔ دونوں کی شاعری میں آشوب وقت کا ردعمل تھا دونوں کے کلام میں تصوف کی چاشنی تھی۔ اور دونوں کے شعر جذبات کی تصویر کشی کا مرقع تھے اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا نے خسرو کے کلام کو بے ساختگی اور بانکپن بخشا اور واقعیت اور مترنم انداز کا مجموعہ بنا دیا۔

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعدی کو شہزادہ محمد بلبن نے دو مرتبہ دعوت دی۔ لیکن سعدی نے بڑھاپے کا عذر پیش کیا۔ اور ہندوستان تشریف نہیں لائے۔ تاہم انھوں نے اس خط میں اپنا خراج عقیدت اس طرح پیش کیا: "در ہند خسرو بس است" اسی طرح حافظ شیرازی خسرو کی شیریں کلامی کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اور مولانا جامی اپنی تصنیف بہارستان میں خسرو کی مثنویوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں،

"خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے بھی نہیں لکھا"

تین سو سال کے بعد بھی عرفی شیرازی جیسے اکبری دربار کے قادر الکلام شاعر بھی خسرو کی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ؎

بہ روح خسرو ازیں پارسی شکر دارم
کہ کام طوطیٔ ہندوستاں شود شیریں

امیر الشعراء ابوالحسن یمین الدین خسرو معروف بہ امیر خسرو ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جب خسرو پیدا ہوئے تو ان کے والد ماجد امیر سیف اللہ محمود بچہ کو خرقہ میں لپیٹ کر ایک صوفی منش بزرگ کے پاس لے گئے جنھوں نے بچہ کو دیکھتے ہی فرمایا: "قیامت تک اس کا نام زندہ رہے گا اور خاقانی (خیسوانی) سے دو قدم آگے بڑھ جائے گا۔"

خسرو زمانۂ طفولیت سے ہی شعر موزوں کر لیتے تھے۔ اور بقول خسرو جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد بزرگوار نے انھیں مکتب میں بٹھایا۔ اور خوش نویسی کی مشق کے لئے خطاط زمانہ قاضی اسد الدین کے سپرد کیا۔ خسرو کی طبیعت کی روانی اور ان کی شاعری کا ملکہ دیکھ کر انھیں ان کے استاد خواجہ عز الدین کے پاس لے گئے۔ اور کہا کہ یہ میرا شاگرد ہے لیکن خطاطی سے زیادہ شاعری کا ذوق رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب نے پہلے خسرو سے پڑھنے کے لئے کہا خسرو نے چند شعر خوش الحانی سے پڑھے۔ خواجہ صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اور کہا کہ مو، بیضہ، تیر اور خربزہ ان چار بے جوڑ چیزوں کو موزوں کرو۔ خسرو نے برجستہ عرض کیا ؎

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است | صد بیضۂ عنبریں بر آں موئے ضم است
چوں تیر بدان راست دلش راز برا | چوں خربزہ دندانش میان شکم است

خسرو کی یہ رباعی سن کر خواجہ صاحب بہت متحیر ہوئے۔ تعریف کی اور گلے سے لگالیا تمہارا تخلص "سلطانی" ہونا چاہیئے۔ یہ تخلص تمہارے لئے فال نیک ہوگا" اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائی کلام میں خسرو اسی تخلص کے نام سے نظر آتے ہیں۔

خسرو نے کبھی بھی استادوں کی استادی سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ وہ تمام اساتذۂ فن کا احترام کرتے تھے۔ البتہ اپنے کلام کے بارے میں فخر کرتے ہیں کہ میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور نہ ہی میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر ہے۔ تاہم ان کی غزلیں سوز و گداز اور والہانہ محبت کا پیکر ہیں۔ اور ان کی مثنویاں فطرت نگاری اور منظر کشی کا مظہر ہیں۔ ان کے قصیدے معنی خیز اور نازک خیالی کا مرقع ہیں۔ اور ان کے مرثیے درد و الم اور غم و اندوہ کا مخزن ہیں۔ خسرو اس بات کا اعتراف کرنے سے دریغ نہیں کرتے کہ غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی، قصیدے میں خاقانی اور اخلاقیات میں سنائی جیسے شعرائے قدیم کے مقلد و پیرو ہیں۔

خسرو نے اپنی بہتر سالہ زندگی میں ہندوستان کے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے۔ اور انھیں اپنے معاصرین میں ایک خاص حیثیت اور مرتبہ حاصل تھا۔ ایک طرف خسرو دربار شاہی

سے تعلق رکھتے تھے تو دوسری جانب حضرت نظام الدین اولیاء کے معتقد تھے۔ امارت اور ولایت کے غیر معمولی اتحاد کے باوجود خسرو کے کلام کو بسنر خوبیوں نے ان کے کلام کے بیشتر اور قابل قدر حصے کو زمانے کی دستبرد سے بچالیا۔ خسرو نے اپنے کلام کے بیشتر حصے کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کرلیا تھا۔ اور اپنی تالیفات کے دیباچوں میں اشعار کی تعداد، سن تصنیف اور موقع تدوین و ترتیب جیسی بہت سی قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ نظم میں پانچ دیوان، نو مثنویاں اور غزلیات کے متفرق مجموعے موجود ہیں۔ نثر میں اعجاز خسروی، خزائن الفتوح اور افضل الفوائد قابل قدر تصانیف ہیں۔

تحفۃ الصغر خسرو کا پہلا دیوان ہے جو انھوں نے ۶۷۱ھ میں مرتب کیا۔ اس میں تقریباً ان کے جوانی کا کلام شامل ہے۔ جو انھوں نے سولہ سال سے انیس سال کی عمر تک لکھا ہے۔ ابتدا میں خسرو نے خاقانی، انوری اور سنائی جیسے مسلم الثبوت اساتذۂ فارسی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ گو انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ دیباچہ میں خسرو نے اپنی زندگی کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ ہر ایک قصیدہ کے شروع میں ایک شعر ہوتا ہے جو قصیدہ کے مفہوم کو واضح کرتا ہے ان تمام شعروں کو یکجا کرنے سے ایک قصیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ خسرو کی ایجاد ہے۔ قصائد زیادہ تر سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کے بیٹے شہزادہ نصرت الدین محمد کی مدح میں ہیں۔ ایک ترکیب بند میں خسرو نے اپنے نانا عماد الملک کا مرثیہ لکھا ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن کے مقربین میں سے تھے۔ اس دیوان میں خسرو اپنا تخلص "سلطانی" کرتے ہیں۔

وسط الحیات کو خسرو نے ۶۸۴ھ میں ترتیب دیا۔ اس میں بیس سے چوبیس اور تیس سے تینتیس سال کی عمر کا کلام ملتا ہے۔ اس میں خسرو نے اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور دیگر تین دیوان مرتب کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زیادہ تر قصیدے سلطان نصرت الدین محمد کی مدح میں ہیں۔ اور ایک ان کا مرثیہ ہے۔ تاریخی اعتبار اور فنی لحاظ سے اس دیوان کے قصیدے زیادہ دلچسپ ہیں۔ ان قصیدوں میں انھوں نے کبھی خاقانی شیروانی کی پیروی کی ہے تو کبھی کمال اصفہانی کے انداز کلام کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

غرۃ الکمال خسرو کا تیسرا دیوان ہے۔ جو انھوں نے ۶۹۳ھ میں تمام کیا۔ اس میں چونتیس سے چینتالیس سال کی عمر تک کا کلام شامل ہے۔ اس کے مقدمہ میں خسرو نے ہندوستان کی فارسی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ اور عربی شاعری پر اس کی فوقیت کو واضح کیا ہے۔ یہ سب سے بڑا دیوان ہے۔ اس میں قدیم شعرائے ایران کی پیروی کی ہے۔ خسرو کے مشہور قصیدے، جنات النجات، مرآت الصفا اور دریائے ابرار اسی دیوان میں پائے جاتے ہیں۔ قصیدوں کے علاوہ اس میں ترجیع بند اور قطعے بھی ہیں۔

بقیہ نقیہ خسرو کا چوتھا دیوان ہے۔ اس کو ۷۱۶ھ میں ترتیب دیا ہے۔ اس میں زیادہ تر بڑھاپے کا کلام ہے۔ اور قصیدے بھی قدیم اساتذۂ ایران کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ سلطان علاء الدین خلجی کا بھی ہے۔

نہایت الکمال کو خسرو نے سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال اور سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی اور ان کے انتقال سے کچھ پہلے تالیف کیا ہے۔ یہ دیوان نادر ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدح ہیں چند قصائد میں تصوف اور حقائق و معارف کے مسائل بیان کئے ہیں۔ یہ پانچواں دیوان خسرو کے آخری دنوں کا ہے۔

نہ سپہر کو خسرو نے ۷۱۸ھ میں مکمل کیا۔ یہ مثنوی نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ معاشرتی اعتبار سے بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں نو باب ہیں۔ اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام نہ سپہر رکھا گیا۔ مختلف بحروں کا ایک ہی مثنوی میں استعمال کرنے کا طریقہ خسرو کی جدت ہے۔ ایک باب ہندوستان سے متعلق ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں علم و فن نے تمام ملکوں سے زیادہ وسعت حاصل کرلی ہے۔ ہندوستان میں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان نے اور ملکوں کے مقابلے میں فن موسیقی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ ہندوستان کی ایجادوں میں "شطرنج" اور "صفر" بھی ہیں۔ ہندوستان میں وید جیسی قابل قدر تالیف ملتی ہے۔ جو مذہب، سیاست، سنگیت اور معاشرت کا مرقع ہے۔ ہندوستان کی تخلیقات میں پنچ تنترہ بھی ہے جس کا ترجمہ عربی، فارسی، ترکی کے علاوہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہوا ہے۔ اور ہندوستان ہی میں خسرو جیسے سحر البیان اور جادو قلم پیدا ہوئے ہیں۔ سلطان قطب الدین مبارک نے اس مثنوی کی تکمیل پر ہاتھی برابر تول کر روپے دیئے۔ خسرو لکھتے ہیں ؎

چو میراث شند پیل زر دادنم ۔۔۔ نہ زیباست زیں سہل تر دادنم
شہا گنج بخشا کرم گسترا ۔۔۔ معانی شناسا سخن اورا
چنیں بخشش کز توہم یافتم ۔۔۔ درایام پیشینہ کم یافتم

سلطان غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات کا تفصیلی ذکر ایک تاریخی مثنوی تغلق نامہ میں کیا ہے۔ یہ تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ جس کو خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے مرتب کیا۔ یہ مثنوی تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے۔ اس میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی بھی تاریخ میں درج نہیں ہیں۔ دراصل تغلق نامہ عہد تغلق کی مفصل تاریخ ہے۔

نظامی گنجوی کے خمسۂ نظامی کا جواب انھوں نے خمسۂ خسرو کے نام سے ۶۹۸ھ اور ۷۰۱ھ کے درمیانی عرصہ میں تکمیل کیا۔ بقول خسرو ان مثنویوں کی تالیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے۔ جو خسرو کی قادر الکلامی اور پُرگوئی کا حیرت انگیز معجزہ ہے۔ مولانا جامی بجا فرماتے ہیں کہ "خمسۂ نظامی را بہ ازوی کسی در جواب نگفتہ"۔

خمسۂ خسروی کے سلسلہ کی پہلی مثنوی "مطلع الانوار" ہے۔ جو نظامی کے "مخزن الاسرار" کا جواب ہے۔ اس مثنوی کو خسرو نے ۶۹۸ھ میں ترتیب دیا۔ اور یہ بیشتر دینی اور اخلاقی نکات پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کو صرف دو ہفتے میں لکھا ہے۔ دوسری مثنوی شیریں و خسرو ہے جو نظامی کے خسرو شیریں کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا سن تالیف ۶۹۸ھ ہے اور اس میں خسرو نے ہر قسم کی شاعری کے مواقع پیدا کئے اور کمال دکھلایا ہے۔ تاہم نظامی گنجوی کے سامنے خاکساری سے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے ؎

مرا داد چہ نظم نادر گرا ۔۔۔ باقی نگذاشت بہر ما ہیچ

• "مجنوں و لیلیٰ" کو خسرو نے ۶۹۹ھ میں نظامی کی لیلیٰ مجنوں کے نمونہ پر تالیف کیا۔ اس مثنوی کا سب سے پُر اثر حصہ وہ شعر ہیں جس میں خسرو نے اپنے بھائی اور ماں کی وفات کا ماتم کیا ہے

امسال دو نور ز اختـرم رفت
هم مادرم و هم برادرم رفت

چوتھی مثنوی "آئینہ سکندری" کو خسرو نے نظامی کے "سکندر نامہ" کے جواب میں لکھا ہے۔ اس مثنوی کو بھی ۶۹۹ھ میں مکمل کر لیا ہے۔ اس میں خسرو نظامی کے دوش بدوش ہیں۔ اس سلسلہ کی آخری مثنوی "ہشت بہشت" ہے۔ جو نظامی کے "ہفت پیکر" کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا سن تالیف ۷۰۱ھ ہے اور اس میں بہرام کی حکایت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں خسرو کی شاعری پختگی اور پرکاری کی آخری حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے خاتمے میں ایک بات کی صراحت کی ہے کہ خمسہ تین سال کی مدت میں لکھا گیا ہے۔ اور اس زمانے کے ایک عالم و فاضل قاضی شہاب الدین نے ان پانچوں مثنویوں کا مطالعہ کر کے تصحیح کی ہے

ے یارب او چوں ز پیچ نامۂ من   بر دو بیرون خطائی خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد   رقیامت خط امانش باد

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ شہاب نے پانچوں مثنویوں کو اصلاح دی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ خسرو نرے مقلد نہ تھے۔ جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں استاد کی رائے کو تسلیم نہیں کرتے تھے اگرچہ ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

ے عیب آں بر من است نہ بر وی

خسرو کی طبیعت کی جولانی اور فکر رسا نے جہاں اقسام شاعری میں وہ جوہر دکھائے ہیں جن کا مقابلہ آج تک کوئی نہ کر سکا، وہاں نثر نگاری میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ اعجاز خسروی وہ نثری کارنامہ ہے جس میں خسرو نے زبان و بیان کے اصول منضبط کر دیئے ہیں اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں۔ یہ تین جلدوں میں ہے اور اس کو انھوں نے ۷۱۹ھ میں تالیف کیا۔ خزائن الفتوح جو تاریخ علائی کے نام سے بھی موسوم ہے خسرو نے ۷۱۱ھ میں مکمل کی۔ اس میں سلطان علاء الدین کی فتوحات اور اس زمانے کے پس منظر اور حالات کو نفیس پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ یہ تاریخی اعتبار سے بڑی اہم تصنیف ہے۔ سلطان علاء الدین نے اس تاریخی تالیف پر خسرو کے لئے ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ ایک اور نثری کارنامہ "افضل الفوائد" کے نام سے مشہور ہے جس میں خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات شامل کئے ہیں۔ اس کے ایک حصہ کو خسرو نے ۷۱۹ھ میں اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے پسند کیا۔

خسرو نے جس قدر فارسی میں لکھا ہے اسی قدر بھاشا (ہندی) میں بھی ہے۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں خسرو لکھتے ہیں "جزوی از نظم ہندی نیز نذر دوستان کردہ ام" خسرو ترکی بھی جانتے تھے اور عربی میں ادبائے عرب کے ہم پلہ تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا۔ سنسکرت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ نہ سپہر میں اپنی سنسکرت دانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ے من قدر بسر ایں کار شدم۔ بہرکیف سیر الاولیاء کے مؤلف امیر خورد کے مطابق خسرو نے ننانوے کتابیں تالیف کی ہیں۔ نفحات الانس کے مصنف مولانا جامی کی رائے میں خسرو ننانوے کتابوں کے مؤلف ہیں۔

خسرو کی تالیفات کا مطالعہ ہندوستان کی تیرھویں صدی عیسوی کی وہ تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملی جلی تہذیب و تمدن کے نقوش نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خسرو کی تصانیف نہ صرف اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہیں بلکہ اس زمانے کے ہندوستان کے مزاج و ذہنیت کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ خسرو کی ذات ہندوستان کے لئے قران السعدین تھی جس میں دو تہذیبوں، دو معاشرتوں اور دو تقاضوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ مختصراً خسرو اپنے عہد کے اساتذۂ ایران کے معاصر ہونے کے باوجود ہند و ایران کے مابین ثقافتی سفیر کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی تالیفات ایک طرف قوم و ملک کو اپنے شاندار ماضی کی یاد دلانے کا ذریعہ ہیں تو دوسری جانب ان کی تخلیقات ہند و ایران کے تعلقات کو مستحکم کرنے کا ایک ثبوت ہیں۔

گوری سووے سیج پے، مکھ پے ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒء نے حضرت امیر خسرو کو ترک اللہ کا لقب دیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"روز حشر امید دارم کہ "با سوز سینۂ ایں ترک، مرا بہ بخشند"

اور ان اشعار کو بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

خسرو کہ بہ شاعری نظیرش کم خاست
در ملک سخن وری حقی خسرو است
ایں خسرو ماست، نام خسرو نیست
زیرا کہ خدائے نام خسرو ماست

امیر حسن عابدی

امیر خسرو بحیثیت فارسی غزل گو

حضرت امیر خسرو دہلوی[1] جیسی جامع اور رنگا رنگ شخصیت فارسی ادب میں شاید ہی کوئی دوسری نظر آتی ہو۔ آپ ایک زبردست شاعر، ایک بلند مرتبہ نثر نگار ایک عظیم الشان صوفی، ایک قابل قدر درباری، ایک اچھے دوست، ایک وسیع المشرب اور رند انسان، ایک بڑے موسیقی دان، ایک وطن پرست ہندوستانی، ایک بڑے مفکر، سبک ہندی کے بنیاد گزار، ہندی کے شاعر، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے نمایندہ اور علمبردار، صاحب رزم و بزم اور مالک سیف و قلم رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے"[2]

اس تنوع اور ہمہ گیری کے باوجود آپ کا خاص میدان فارسی شاعری ہے اور آپ ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی کے شاعر مانے گئے ہیں۔ آپ کے اشعار کی تعداد لاکھوں تک بتائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کہتے ہیں "امیر خسرو فارسی کے پرکارترین شعرا میں سے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ خود امیر خسرو کے قول کے مطابق ان کے اشعار چار لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے کم ہیں۔ شاہرخ کے بیٹے مرزا بایسنقر نے ان میں سے ایک لاکھ بائیس ہزار اشعار کو جمع کیا تھا۔ بغیر کسی تردید کے خسرو دہلوی ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی کے شاعر اور فارسی کے شیریں سخن اور زبردست شعرا میں سے ہیں۔ امیر خسرو اپنی طبع رواں، خدا داد ذوق اور ذہن کی تیزی کی مدد سے، نیز اس وجہ سے کہ انھوں نے فارسی ادب کے نئے ماحول میں تربیت پائی تھی اور ایک نیا لہجہ، تازہ ترکیبیں اور خاص قسم کے افکار ان کے حصہ میں آتے تھے، طبعاً ان کے اشعار میں بہت سی تازگیاں پائی جاتی ہیں اور بہت سے نئے مضامین اور منتخب اشعار ان کے آثار میں دکھائی دیتے ہیں اور مسلماً یہی وجہ ہے کہ بعد کے آنے والے شعرا اور لکھنے والوں نے ان کو استاد کبیر کر یاد کیا ہے۔ مثلاً جامی ان کو داستان سرائی میں نظامی کے بعد رکھتے ہیں۔ نیز نظامی کے کلام کو "گوہر" اور خسرو کے کلام کو "زر دہی" سے تشبیہ دی ہے"[3] شبلی کہتے ہیں "فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم ہیں، لیکن ان کے حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا سعدی قصیدے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین مستزاد، اور صنایع بدایع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں"[4]

امیر خسرو نے مثنویوں میں نظامی کی پیروی کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر چہ اس درجہ تک نہ پہنچ سکے، مگر اس صنف سخن میں نظامی کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو آپ کا ہے۔ اس کے علاوہ کثرت سے قصیدے قطعے اور رباعیاں کہی ہیں شبلی لکھتے ہیں "یہ مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں، غزل میں سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے قصائد لے کر دیکھ لو، کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں"[5] اس میں شک نہیں کہ علامہ شبلی نے امیر خسرو کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے، مگر اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ ان جلیل القدر شعرا کے بعد ان صنفوں میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

---

[1] ۶۵۱ - ۷۲۵ ہجری / ۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ عیسوی [2] شعرالعجم، جلد دوم، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء، ص ۱۱۸

[3] تاریخ ادبیات در ایران، جلد سوم بخش دوم، دانشگاہ تہران ۱۳۶۳ ہجری شمسی، ص ۷۷۵ - ۷۸۸

[4] شعرالعجم، جلد دوم، ص ۱۱۸ - ۱۱۹ [5] شعرالعجم، جلد دوم، ص ۱۱۸ - ۱۱۹

امیر خسرو کے اشعار اور کلام کا مطالعہ صرف شعری خوبیوں کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان سے ہمیں ہندوستان کی اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے، نیز اس عہد کی ایک اچھی خاصی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ مرحوم ڈاکٹر تارا چند صاحب نے ان کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرھویں اور چودھویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی طول و عرض تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور ادیب اس زمانہ میں کیسے جذبے، کیسے خیال رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں سے جس میں اسلامی ملک شامل تھے، ترجیح دیتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی نغمہ کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ خسرو کے قران السعدین تھی جس میں دونوں تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ خسرو صوفی منش درویش انسان تھے، ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت تھی۔ شاعری بھی ان صفتوں کی حامل ہے۔ ان کے کلام میں تیرھویں چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا ستھرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاست کی روشن تصویریں ہیں، اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں، راہ عشق کے پیچ و خم محبت کے مستانوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں، آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے اور ناکامیوں کا المیہ، پند و نصیحت، حکمت و تدبیر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے جو خسرو سخن کے قلمرو سے باہر ہے۔ خسرو کا کلام ہندوستان کی محبت سے لبریز ہے۔ چھ سو سال گذرنے پر بھی خسرو کا کلام ہمارے لئے وہ مشعل ہدایت ہے جو منزل مقصود کی طرف ہماری راہبری کرتا ہے"[1]

فارسی شاعری کی سب سے بڑی صنف غزل ہے جو عشق و عاشقی کے مضامین کے لئے مخصوص ہے۔ شبلی لکھتے ہیں "عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اور چونکہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتی، لیکن ایران اس خصوصیت میں اور تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے"[2] یوں تو حضرت امیر خسرو نے تمام اصناف سخن میں قدرت کلام کا اظہار کیا ہے، مگر ان کا خاص میدان غزل ہے جو فارسی اور اردو شاعری کی جان ہے۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں "امیر خسرو کی غزلیں معمولی غزل کی حد سے باہر نہیں نکل سکی ہیں اور ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہیں۔ ان میں آرزوئے دیدار، ہجران یار، نرگس بیمار، سوزش شمع، یار کرشمہ ساز، زلف کمند انداز، سیل اشک، خدنگ نرگس مست، کمان جیسے ابرو اور کبک خوش گام سے بحث کی گئی ہے اور خرقہ پوشوں کے زہد کا دردنوشوں کے پیر سے مقابلہ کیا گیا ہے، نیز چشم زیبا اور ان کے حالات اور شکلوں کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے"[3] مگر میرا خیال ہے کہ انھوں نے امیر خسرو کی غزل گوئی کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا ہے اور ایک چلتا ہوا اوپری نظریہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں تقی محمد خاں خورجوی فرماتے ہیں "آج خسرو کی تمام شہرت کا زیادہ تر دار و مدار ان کی غزلوں کی وجہ سے ہے اور اہل دل آج بھی اسی طرح سر دھنتے ہیں جیسے کہ ان کے زمانے میں"[4]۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے سب سے زیادہ امیر خسرو کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "خسرو کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ان کے زمانے سے لے کر آج چھ سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں لیکن سماع اور قوالی کی محفلوں میں غالباً اب بھی سب سے زیادہ ان ہی کی غزلیں مقبول اور رائج ہیں اور اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ ان کا کوئی بہت ہی پر درد شعر سن کر بعض لوگوں پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ جان سے گذر گئے"[5]

تصوف کو فارسی شاعری کی جان کہا گیا ہے جس کے بغیر فارسی شاعری کا قالب بے روح ہے۔ معمولی عشق و محبت اور دنیاوی اور مادی عشق بازیوں سے غزل میں وہ گہرائی کہاں پیدا ہو سکتی تھی جو روحانی اور حقیقی عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بڑے بڑے غزل گو شعرا کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی عظمت کا راز ان کی صوفیانہ اور روحانی شاعری اور عشق و محبت میں پوشیدہ ہے۔ غزل اگرچہ رودکی سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ابتدا میں اس میں وہ کشش نہ تھی جو بعد میں تصوف کی ملاوٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ غزل کی ترقی تاریخ تصوف سے شروع ہوتی ہے، تصوف کی ابتدا اگرچہ تیسری صدی کے آغاز میں ہو ئی ہے، لیکن پانچویں صدی اس کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہی غزل کی ترقی کا نوروز ہے"[6]

حضرت امیر خسرو کی غزلوں کی جاذبیت اور دلکشی کا راز بھی اسی میں ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری تصوف سے اور صوفیانہ شاعری عشق و محبت کے رموز اور معرفت کی باریکیوں سے لبریز ہے، نیز اس میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں کا بہتر سے بہتر تناسب موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی غزلیں قوالوں کی زبان سے سنی جاتی ہیں اور محفل سماع کو آج بھی گرما رہی ہیں، نیز صاحبان دل و جگر کو آج بھی مجاز سے حقیقت تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں۔

بہرحال حضرت امیر خسرو نے شیخ سعدیؒ جیسے عظیم غزل گو کے بعد اور لسان الغیب حافظ شیرازیؒ جیسے بزرگ ترین غزل گو سے پہلے محفل سخن میں قدم رکھا تھا۔ شبلی، سعدی اور خسرو کا اس طرح ذکر کرتے ہیں "شیخ سعدی ایک مدت تک عشق و عاشقی میں بسر کر چکے تھے۔ اخیر اخیر تصوف کے حلقے میں آئے۔ وہ فطرتاً شاعر تھے، زبان خداداد تھی، ان باتوں نے مل کر ان کی غزل میں یہ اثر پیدا کر دیا کہ تمام ایران میں آگ لگ گئی۔ ان کے بعد خسرو اور حسن نے اس شراب کو اور تیز کر دیا"[7] شبلی نے امیر خسرو کی غزلوں کی خصوصیات میں بحروں کی موزونی، سوز و گداز، جدت اسلوب، واقعہ گوئی اور معاملہ بندی، روزمرہ

---

[1] امیر خسرو اور ہندوستان، امیر خسرو اکیڈمی، نئی دہلی، ص ۱۰۶، ۱۱، ۱۲ [2] شعر العجم جلد پنجم ص ۳۴ [3] تاریخ ادبیات ایران (چاپ پنجم)، پیروز) ص ۲۹ [4] حیات امیر خسرو (کتاب منزل کشمیری بازار لاہور) ص ۱۰ [5] امیر خسرو (ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۴۹ء) ص ۲۲۶۔۲۳ [6] وفات: ۳۲۹ ہجری / ۹۴۱ عیسوی [6] شعر العجم جلد پنجم ص ۳۶ [7] ۶۰۶۔ ۶۹۱ ہجری / ۱۲۰۹۔۱۲۹۲ عیسوی [8] ۷۲۹۔۷۹۱ ہجری / ۱۳۲۹۔۱۳۸۹ عیسوی [9] شعر العجم، جلد پنجم، ص ۳۸۔

اور عام بول چال، جدت مضمون آفرینی کو شمار کیا ہے۔ نیز وہ لکھتے ہیں "غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز۔ اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی کوئی الجھاؤ نہ ہو، قریب الفہم خیالات ہوں۔ اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات و اختراعات کے چمن کھلا دیئے۔"

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے سعدی اور امیر خسرو نیز امیر خسرو اور حافظ کے شعروں کا مقابلہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں [۱]

سعدی کہتے ہیں۔

فراق دوستانش باد یاراں   کہ مارا دور کرد از دوستاراں
بکہ در منظر تو حیرانم   صورتت را صفت نمی دانم
شکست عہد مودت نگار دلبندم   برید عہد وفا یار سست پیوندم
کس نگذشت در دلم تا آنجا کہ مرا   یک نفس از درون جا خیمہ برون نمی زنی

اور امیر خسرو کہتے ہیں۔

ہمی ریزی بہ بازی خون یاراں   ہمی باشد سزای دوستداراں
ای وجود تو دیدۂ جانم   جسم پیدا و جان پنہانم
چوں من از دست بداغ ورد نجیندم   زدہ ستی بر دل از دل بہ مرہمی بندم
ای زعنا زخنگ تو یافتہ دیدہ روشنی   چند بہ شوخی و جفا قصد ہلاک من کنی

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں۔

عزم آں دارم کہ از دل نقد جان بیرون کنم
آرمت در پیش و خود را از میان بیرون کنم
حال خود باز بر آئین دگری بینم
باز کار دل خود زیر و زبر می بینم

اور حافظ شیرازی اپنے خاص انداز میں کہتے ہیں۔

دوش سودای رخت گفتم ز دل بیرون کنم
گفت کو زنجیر تا تدبیر این مجنون کنم
این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

ویسے تو حضرت امیر خسرو نے پانچ دیوان تیار کئے تھے اور ان کا نام تحفۃ الصغر وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال رکھا تھا، نیز ان پر مقدمے لکھے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم دیوان غرۃ الکمال ہے۔ مگر بدقسمتی سے ابھی تک یہ دیوان ٹھیک سے نہ چھپ سکے اور نہ اب تک کوئی منتخب دیوان ایڈٹ ہو کر منظر عام پر آ سکا۔ ایک بات یہ بھی کہہ دی جائے کہ اگرچہ خود امیر خسرو نے ان دیوانوں کو الگ الگ مرتب کیا تھا مگر لوگوں نے خاص کر کاتبوں نے اس ترتیب اور حد بندی کا خیال نہیں رکھا اور عام طور سے دیوان امیر خسرو کے نام سے بکثرت قلمی نسخے ملتے ہیں جو در حقیقت تمام دیوانوں سے انتخاب ہوتے ہیں۔ یوں تو دیوان میں قصیدے رباعیاں، قطعے اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہوتی ہیں، مگر دیوان کی خاص چیز غزلیں ہوتی ہیں اور اکثر دیوان ایسے بھی ملتے ہیں جن میں سوائے غزل کے اور صنف سخن نہیں ہوتی۔

فارسی نثر و نظم میں تین سبک ہیں جن کو سبک خراسانی، سبک عراقی اور سبک ہندی سے یاد کیا گیا ہے۔ سبک ہندی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آورد ہوتی ہے، تصنع سے کام لیا جاتا ہے، دور از کار اور مصنوعی خیالات و افکار کو جگہ دی جاتی ہے، تشبیہیں، استعارے وغیرہ بھی غیر طبعی ہوتے ہیں۔ حضرت امیر خسرو کو سبک ہندی کا بانی کہا گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نثریں سبک ہندی کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہیں جن میں ثقل زبان و بیان بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے اور آورد ہی آورد ہے۔ بلکہ آپ نے بہت سی صنعتوں کا ایجاد کیا تھا اور نثر میں ان کو صرف بھی کیا گیا ہے۔ مگر نظم خاص کر غزل میں یہ بات نہیں ہے۔ ان کی غزلیں انتہائی رواں دواں ہوتی ہیں، نیز ان میں آمد ہی آمد دکھائی پڑتی ہے اور غزل کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا ایران کے بہت بڑے استادوں اور محققوں میں سے ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے فارسی ادب کی بڑی مفصل تاریخ لکھی ہے جس کی بہت سی جلدیں تہران یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں اور کچھ شائع ہونے والی ہیں۔ بہرحال یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کتاب کی تیسری جلد کا بخش دوم ابھی حال ہی میں منتشر ہوا ہے کہ اس میں ساتویں صدی ہجری کی ابتدا سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے آخر تک کے فارسی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے[۲] نیز اس جلد میں آپ نے حضرت امیر خسرو کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ستائیس صفحے ان کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ آپ نے امیر خسرو کے دیوانوں کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے نیز ان کے دیوان وسط الحیات، بقیہ نقیہ اور غرۃ الکمال سے چند غزلیں منتخب کر کے نقل کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا انتخاب خود اس قابل ہے کہ حضرت امیر خسرو کی بہترین تخلیقات میں شمار کیا جائے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ امیر خسرو کی غزلوں یا اشعار کا اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کر کے پیش کیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ انھیں کی منتخب کردہ غزلوں کو یہاں نقل کیا جائے۔ تاکہ اس سے حضرت کی عظمت اور سبک کا اندازہ ہو سکے، نیز ایرانی ذوق کا پتہ چل سکے۔ اب یہاں تاریخ ادبیات در ایران سے حسب ذیل غزلیں نقل کی جا رہی ہیں جو ہم ہندوستانیوں کے لئے بھی سند کا کام کریں گی۔

---

[۱] شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۵۲ [۲] بزم مملوکیہ (مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء) ص ۳۱۶ - ۳۱۷

بسی شب با مهی بودم کجا شد یارب آن شبها
کنون هم هست شب اما سیه از دود یاربها

خوش آن شبها که یادی بود می گشت و گر خوش
جهان بر من شود تاریک چون یاد آرم آن شبها

همی کردم حدیث ابرو و مژگان او هر دم
چو طفلان سورهٔ نون والقلم خوانان بمکتبها

چه باشد گر کسی پرسد که در شبهای تنهائی
غریبی زیر دیوارش چگونه می کشد تبها

مرنج از بهر جانی خسرو اگر کشد یارت
که باشد خوبرویان را بسی زینگونه مکتبها

ای باد بر قع بر فگن آن روی آتشناک را
دی دیده گر صفرا کنم آبی بزن این خاک را

ریزی تو خون بر آستان شویم من از اشک روان
تا آن دیدن چون توان آن آستان پاک را

زان غمزه عزم کین مکن تاراج عقل و دین مکن
تاراج دین تلقین مکن آن هندوی بی باک را

سرهای سرداران دین بستی چو بر فتراک زین
زینسان میفگن بر زمین دنبالهٔ فتراک را

تا شمع حسن افروختی پروانه وارم سوختی
پر دره وری آموختی آن دامن صد چاک را

جانم چو رفت از تن برون دیلم چه کار آید کنون
این زهر بگذشت از فسون منایع مکن تریاک را

گویی برآمدگاه خواب اندر دل شب آفتاب
آمدم کز آه صبح تاب آتش زنم افلاک را

تا بر سر بازار بمستی قدمش رفت
بس خرمن مردان که بباد ستمش رفت

هر صبر و سلامت که دل سوخته را بود
اندر شکن سلسلهٔ خم بخمش رفت

یوسف چو گذر کرد ببازار جمالش
هر مایه که او داشت بجده درمش رفت

یک روز بشادی وصالش نرسانید
آن عمر گرانمایه که ما را بغمش رفت

آلوده نشد هیچگهی دامن نازش
زان خون عزیزان که بزیر قدمش رفت

بسیار سر افگنده بشمشیر سیاست
ای دولت آن سر که بتیغ کرمش رفت

رفت از قلم حکم که در عشق رود جان
القصه همان رفت که اندر قلمش رفت

بر یاد وی امشب شب خسرو بدرازی
کوتاه نشد گرچه همی بیش و کمش رفت

نه مرا خواب بچشم و نه مرا دل در دست
چشم و دل هر دو برخسار تو آشفته و مست

پرده بدرید کس این راز نخواهد پوشید
غنچه بشکافت سرش باز نخواهد پیوست

ای که از سحر دو چشم تو پری بسته شود
آدمی نیست که چشم از تو تواند بربست

تا بگلزار جهان سرو بلندت برخاست
هر نهالی که نشانند ببستان بنشست

بهر خون ریز مرا دست چه مالی چندین
خون من به که بریزی و بمالی بر دست

هر که جان در ره جانان ندهد مرده بود
مرده هم به بود اگر در تن او جانی هست

چشم خسرو نتوان بست که در خواب ببین
منع هندو نتوان کرد که صورت پرست

دل رفت و آرزوی تو از دل نمی شود
دل پاره گشت و درد تو زایل نمی شود

مه می شود مقابل روی تو هر شبی
یک روز با رخ تو مقابل نمی شود

رویم ز راست و بر در تو خاک می کنم
وصل تو کیمیاست که حاصل نمی شود

شد اشک من حمایل گردون ز دست تو
دستم بگردن تو حمایل نمی شود

دل منزل غم آمد و از رهزنان هجر
یک کاروان صبر بمنزل نمی شود

خسرو در اوفتاد بغرقاب آرزو
چون کشتی مراد بساحل نمی شود

کجا بودم من مدهوش را حد رخنه باز
که کنج کعبه ز دیر مغان ندانم باز

چو صوفی از من صافی همی کند پرهیز
مباش منکر دردی کشان شاهباز

بس است مطرب مفلس نوای سینه زنان
چو بلبل سحری می کند سماع آغاز

بدان طمع که کند مرغ وصل خوبان صید
دو دیده ام شده از شام تا سحرگه باز

خیال زلف دراز تو گر نگیرد دست
که بر سر آرد ازین ظلمت شبان دراز

تو در تنعم و نازی زماک اندیشی
که ناز ما به نیاز است و نازش تو بناز

اگر ز خط تو چون موی سر بگردانم
ببند در چون سر زلفم بر آفتاب انداز

گذشت شعر ز شعری و سوزش از گردون
چرا که از پی آوازه می رود آواز

خود بجوی ز خسرو که اهل معنی را
نظر بعشق حقیقت بود نه عقل مجاز

جان ز تن بردی و در جانی هنوز
دردها دادی و درمانی هنوز

آشکارا سینه ام بشکافتی
همچنان در سینه پنهانی هنوز

ملک دل کردی خراب از تیغ کین
واندرین ویرانه سلطانی هنوز

هر دو عالم قیمت خود گفته ای
نرخ بالا کن که ارزانی هنوز

من ز گریه چون نمک بگداختم
تو ز خنده شکر ستانی هنوز

جان ز بند کالبد آزاد گشت
دل بگیسوی تو زندانی هنوز

پیری و شاهد پرستی ناخوش است
خسروا تا کی پریشانی هنوز

تن پیر گشت و آرزوی دل جوان هنوز
دل خون شد و حدیث بتان بر زبان هنوز

عمرم بآخر و روزم بشب رسید
مستی و بت پرستی من همچنان هنوز

عالم تمام پر ز شهیدان فتنه گشت
ترک مرا خدنگ بلا در کمان هنوز

بیدار مانده شب همه خلق از نفیر من
و آن چشم نیم مست بخواب گران هنوز

هر دم کرشمه های وی افزون و آنگهی
خسرو ز بند او بامید امان هنوز

کج کلها ستمگرا تنگ قبای کیستی
حب گرا و دلبرا عشوه نمای کیستی

زیر کلاه جعد تو بر کمرت کشیده سر
بسته بجا بجا گرهست قبای کیستی

مرکب ناز کرده زین داده بغمزه تیغ کین
ساخته آمده چنین باز برای کیستی

سینه بنده جای تو دیده بزیر پای تو
ما همه در هوای تو تو بهوای کیستی

تا رخ خود نموده ای جان ز تنم ربوده ای
آتش من فزوده ای مهرفزای کیستی

خانه جان همی بری دانه دل همی خوری
نیک بلند می پری مرغ هوای کیستی

خسرو خسته را سخن بسته شد از تو در دهن
طوطی شکرین من نغمه سرای کیستی

حسن الدین احمد

امیر خسرو کا عوامی لب و لہجہ

خسرو کا لب و لہجہ خود وہ اس بولی کے لحاظ سے ہو جو خسرو کے زمانہ میں دہلی اور اس کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ یا ان کے مزاج۔ طرز فکر اور رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے ہو اس کا انداز یکسر عوامی تھا۔

جب قدرت کو انسانیت کے مفید مطلب اور تاریخ ساز کام لینا ہوتا ہے تو حکمران اور محکوم طبقوں کے درمیان کے فاصلوں کو کم کرنے کے لئے خاص اہتمام ہوتے ہیں۔

امیر خسرو بھی حکمراں طبقہ کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے عوام سے قربت حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو مقام حاصل کیا اس کے مضمرات کو اچھی طرح محسوس کرنے کے لئے ہم کو پچھلی تاریخ میں ایک واضح مثال ملتی ہے اور وہ ہے حضرت موسیٰ کی۔

موسیٰ یہودی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو اس وقت محکوم تھی۔ ملک میں قہار و جبار فرعونوں کی حکومت تھی۔ موسیٰ اپنا تاریخی کام انجام نہ دے سکتے تھے اگر معجزانہ طریقہ پر ان کی پرورش خود فرعون کے محل میں نہ ہوتی۔ موسیٰ حکمراں طبقہ کے نمائندہ۔ اقتدار کے مالک اور اہرام کی تعمیر کے نگراں تھے۔ وہ یہ جان گئے تھے کہ وہ یہودی النسل ہیں۔ اور کی تعمیر میں حصہ لینے والے بیشتر مزدوران کے ہم نسل ہیں۔ یہی خاص احساس تھا جو بجائے آجر و مزدور کی کش مکش کے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار مزدوروں کے لئے اوقات کار کے تعین یعنی ہفتہ میں چھ دن کام کرنے کے فارمولے کو وجود میں لانے کا باعث بنا۔

کچھ ایسی ہی بات امیر خسرو کے ساتھ رہی۔ خسرو اس نو وارد حکمراں طبقہ کے نمائندہ تھے جس نے کچھ ہی عرصہ قبل اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ لیکن اپنی والدہ کی طرف سے جو عماد الملک کی صاحبزادی تھیں وہ ہندی الاصل تھے۔ اس طرح ان کے لئے جذباتی سطح پر حکمراں اور محکوم طبقوں کے درمیانی فاصلہ کو عبور کرنا مشکل نہ تھا۔ اس صورت حال کو خود ان کی طبیعت کے انداز سے اور صوفی طریقت کے سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات سے کافی بڑھاوا ملا اور امیر خسرو نے ایسا عوامی لب و لہجہ اختیار کیا جو آج سات سو سال گزرنے کے بعد بھی اپنی آپ مثال ہے۔

جہاں تک بولی کا تعلق ہے امیر خسرو کی مادری زبان مغربی ہندی تھی جس پر ان کے زمانہ میں علاقائی زبانوں کے اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی بارہ زبانیں گنوائی ہیں اور ان سب کو ہندی کہا ہے۔ انھوں نے سندھی۔ لاہوری۔ کشمیری۔ ڈوگری۔ تامل۔ تلنگی۔ گجراتی۔ گھاٹی پہاڑی۔ بنگالی اودھی اور دہلوی زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح خود امیر خسرو کی مادری زبان کو ہم دہلوی ہندوی کہہ سکتے ہیں جو امیر خسرو کو اپنی والدہ اور نانا عماد الملک سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ بول چال کی زبان تھی جو انبالہ سے آگرہ تک خفیف سی علاقائی تبدیلیوں کے ساتھ رائج تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں دلی کی زبان کھڑی بولی کی پیش رو آگرہ کی زبان برج کی پیش رو تھی قیاس چاہتا ہے کہ اس دور میں دہلی اور آگرہ کی زبان کم و بیش ایک طرح کی رہی ہوگی۔ خسرو کا ہندوی کلام ان ہی دو زبانوں پر مشتمل ہے۔

امیر خسرو نے کھڑی بولی کے الفاظ اور فقرے فارسی کلام کے بیچ میں شامل کئے ہیں جیسے۔

رفتم بہ تماشائے کنار جوئے
دیدم بہ لب آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود
فریاد برآورد کہ در در موئے

آخری فقرہ کی خوبی یہ ہے کہ یہ بیک وقت فارسی کا بھی ہے اور کھڑی بولی کا بھی۔ فارسی کلام میں ہندوی اجزا کو پیوند کرنے کے تعلق سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ اس کا مقصد ظرافت کا سامان مہیا کرنا تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ امیر خسرو نے عوامی بولی کی قدر افزائی کرتے اور اس کی توجہ خاص کا مرکز بنانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور یہ تجربہ کیا جس کو دنیا کی ادبی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ کوشش شعوری تھی اور بامقصد۔

اسی طرح امیر خسرو نے خالص کھڑی بولی میں بھی خاصا کلام لکھا اور اپنے دوستوں میں تقسیم کیا۔ خسرو ہندوی میں شعر کہنے کو شان نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس پر انھیں فخر تھا۔ یہ کلام خود خسرو کی زندگی میں عوام میں مقبول تھا۔ افسوس کہ امتداد زمانہ کے باعث یہ کلام اب ناپید ہے اور جو چیدہ چیدہ کلام سینہ بہ سینہ ہم تک آیا ہے اس میں زبان کی تبدیلی کا بھی امکان ہے اور اس کا بڑا حصہ الحاقی بھی سمجھا جاتا ہے۔

خسرو کے دور کی عوامی بولی کے مقابل ایک طرف تو ملک کی زبان سنسکرت تھی جو ہندی عالموں۔ پنڈتوں اور اعلیٰ ذات والوں کی زبان تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں سنسکرت کے پنڈت بھی اس دیسی بولی کو حقارت سے دیکھتے تھے اور فارسی کے عالم بھی۔ خسرو نے ہندوی میں شاعری کی اور فارسی شاعری میں ہندوی الفاظ

کا استعمال کیا اور اس طرح اس زبان کے بولنے والوں میں جو احساس کمتری پیدا ہوا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس عوامی بولی کے دلنواز گیت دوہے، پہیلیاں لکھ کر اس کو بڑھاوا دیا انھوں نے اس زبان کے گیسوؤں کو سنوارا۔ اس کی شاعری میں فارسی کے اوزان استعمال کئے۔ اور اس طرح اس زبان کے ارتقاء میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ آج اہل ہندی ہوں یا اہل اردو ہر دو امیر خسرو کو ہر دو زبانوں کا محسن اول مانتے ہیں۔

امیر خسرو کو درباری اور سپاہی کی حیثیت سے ملک میں سفر کرنے کے کافی مواقع ملے انھوں نے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں بولی جانے والی مختلف بولیوں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے ملک کے عوامی لٹریچر سے خواہ وہ تحریری ہو یا زبانی بھرپور استفادہ کیا اس کے الفاظ۔ خیالات اور محاوروں کو اپنے کلام میں استعمال کیا۔

یہ تو اس بولی کی بات تھی جو ان کی مادری زبان تھی۔ لیکن جو شاعری انھوں نے فارسی میں کی ہے اور جس کے ذریعہ ایران کے اہل زبان سے بھی اپنا سکہ منوایا ہے اس کا لب و لہجہ بھی عوامی ہے۔ اپنی شاعری میں انھوں نے اپنے عہد کے عوام کی زندگی اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی نمائندگی کی ہے۔ ان کے تخلیقی کارنامے ان کے اپنے وطن کے عوام سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لئے بیشتر موضوعات عوامی زندگی سے لئے اور اپنی شاعری میں انسانی جذبات اور احساسات کو پیش کیا ہے انھوں نے عام آدمی کی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے کلام میں ہم کو مختلف پیشہ وروں اور اپنے اپنے فن کے ماہر کاریگروں کا ذکر ملتا ہے۔

خسرو کے عوامی لب و لہجہ پر سب سے زیادہ اثر صوفی طریقت کے چشتیہ سلسلہ کا پڑا۔

تصوف کا رجحان ہمیشہ سے جمہوری رہا۔ تصوف مخلوق خدا کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے! ان صوفیاء کا بنیادی خیال یہ ہے کہ خدا سے بھی محبت کرنے والا اس کی مخلوق خصوصاً انسان سے بلا امتیاز مذہب و نسل محبت کرتا ہے۔ تصوف میں بھی دوسرے سلسلوں کے اور خصوصاً سہروردی سلسلہ کے مقابلہ میں چشتیہ سلسلہ اپنے رجحانات کے اعتبار سے جمہوری رہا اور جمہوری روایات چشتیہ سلسلہ میں برقرار رہیں۔ جس کا ثبوت ان کی تمام تعلیمات سے فراہم ہوتا ہے حضرت نظام الدین اولیاء کا عوام پر کافی اثر تھا انھوں نے بھی کوئی سرکاری ملازمت یا جاگیر قبول نہیں کی۔ شیخ فرید نے اپنی خانقاہ میں کام کی تقسیم کر رکھی تھی۔ اور کھانا سب میں مساوی طور پر تقسیم ہوتا۔ چشتی بزرگوں کی تعلیمات کے بموجب ذاتی محنت سے کمائی ہوئی آمدنی ہی جائز سمجھی جاتی تھی۔ چشتیہ سلسلہ کا خاص مشن تھا کہ وہ مسلمانوں اور ان نومسلموں میں تال میل اور یکجہتی پیدا کریں اور ان کو پاکیزہ اور سچا مسلمان بنا کر مذہبی علماء کی احساس برتری اور ترک سرداروں کے غرور اور نسلی برتری کے جذبات سے بڑی حد تک محفوظ کر دیں یہی وجہ تھی کہ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پسماندہ طبقہ کے لئے کشش اور جاذبیت رکھتی تھیں۔ امیر خسرو نے تصوف کو اپنا لیا اور اس کے رنگ و روپ سے اپنی فارسی شاعری کو آب و تاب دی۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ چشتیہ سلسلہ کی انسان دوستی کے خیالات کی ترویج کا ذریعہ تھا۔ خسرو نے اپنی عملی زندگی اور شاعری دونوں میں مخلوق خدا سے محبت کا ثبوت دیا۔ وہ ہر مذہب کے پیروؤں سے خلوص اور محبت کا اظہار کرتے۔ وہ مخلوق خدا سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انھوں نے حکمرانوں کو ہمیشہ انصاف سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ تم اقتدار حاصل کرنے کے خواہشمند ہو تو تمہیں عوام اور رعیت سے اچھا سلوک کرنا ہوگا۔ اس طرح خسرو نے تمام عمر اپنے عوامی لب و لہجہ کو برقرار رکھا۔ اور اپنے مرشد کے مزار پر ان کے جس آخری دوہے کے بول انکی زبان پر آئے وہ بھی اس عوامی زبان کے تھے جس کو انھوں نے اپنا لیا تھا۔

بقیہ۔ امیر خسرو اور عصر جدید

محاربات کے بیان کی بات اور ہے کہ ایسے مواقع پر خسرو بھی اپنے ہم عصر مؤرخین کے محاورے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ان کا قلم کف در دہاں نہیں ہوتا ایک مورخ کے لئے امیر خسرو اطلاعات و معلومات کا بے پناہ ذخیرہ پیش کر سکتے ہیں منگولوں کے غولوں کا سراپا اور سلاطین دہلی کی دفاع اور سرکوبی کی کوششیں، عہد بلبن میں بنگال کے حاکم کی بغاوت اور اس کا فرکرنا، عہد خلجی میں راجپوتانہ گجرات اور دکن کی مہمات، علاء الدین کی اصلاحات، مبارک شاہ خلجی کا قتل، ... غیاث الدین تغلق کے معرکے اور تخت نشینی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کے بارے میں امیر خسرو کے بیانات حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ امیر خسرو اپنے عہد کے پہلے مؤرخ ہیں جنھوں نے مروجہ رسوم و رواج، صنعت و حرفت، معیشت و معاشرت، علوم و فنون اور عقائد و مسالک پر توجہ کی اور بیش قیمت معلومات ہمارے لئے چھوڑیں اس عہد کے بعض اہم واقعات کی تاریخوں کا تعین امیر خسرو کی اعانت کے بغیر ناممکن تھا۔

امیر خسرو کے سوانح نگار ڈاکٹر وحید مرزا ان کی بذلہ سنجی اور شستہ لطیف کو، ان کی رواداری اور وسیع المشربی کو، سخاوت کو، صاف گوئی اور غیر منافقانہ رویہ کو، ان کی ہمہ گیر شہرت و مقبولیت کے اسباب میں شمار کرتے ہیں۔

امیر خسرو کی اہمیت اور معنویت اس وقت ختم نہ ہوگی جب تک کہ انسان، اس کی تاریخ اور اس کے احساس و اظہار کے تجربات میں ہماری دلچسپی ختم نہ ہو جائے۔ اپنے عہد کے سب سے بڑے سیاسی سربراہ یعنی بادشاہ کے مصاحب، اپنے عہد کے سب سے بڑے ولی کامل یعنی حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے مرید اور اپنے عہد کے سب سے بڑے فن میں یکتا و یگانہ شاعر، حضرت امیر خسرو بیک وقت متناقض و متخالف جہتوں میں سفر کرنے کے سلسلے میں ایسے چراغ راہ ہیں جسے بدلنے والے ادوار بجھا نہیں سکتے۔

یک بیت را ز من نتواند خرید کس
زیرا کہ کس بہشت بریں را بہانہ کرد

تقی محمد خاں خورجوی

واقعات سے ظاہر ہے کہ امیر کے زمانے میں ہندوستانی موسیقی پربند، چھند وغیرہ تک گانوں تک محدود تھی جو سنسکرت اور برج بھاشا میں گائے جاتے تھے امیر نے سب سے پہلے عجمی موسیقی کے انداز پر ترانہ، قول، نقش و نگار، گل وغیرہ گانے ایجاد کئے۔

باوجودیکہ اسلام میں علماء نے موسیقی کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن ایک گروہ صوفیوں کا ہر زمانے میں ایسا ہی رہا ہے جو صوفیانہ غزلیں گا کر روحانی سرور حاصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ شمس الدین التمش کے زمانے میں ان کے قاضی سعد الدین صادق اور منہاج السراج کے اثرات سے موسیقی غیر اسلامی شعار قرار دے دی گئی تھی۔ لیکن چشتیہ قاضی حمید الدین ناگوری کی تبلیغ اور راثر سے دہلی کے لوگوں میں دوبارہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بلکہ ایک زمانے میں تو وہ صحبت ہائے سماع کے رکن تھے۔

شمس الدین التمش نے بھی پابندی کے حکم کو منسوخ کر دیا تھا۔ اور دربار میں بھی اس کی اجازت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ان کا بڑا بیٹا فیروز شاہ بھی موسیقی کا بےحد دلدادہ تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۷ء یعنی ایک ہی سال میں اپنی سلطنت اس شوق پر قربان کر دی۔

شاہ بلبن کے دور میں بھی موسیقی مقبول رہی۔ اس کے دربار میں عبداللہ ترکی ایک مشہور رگویا بھی تھا۔ اور شیخ بہاء الدین ذکریا کے مریدوں میں سے تھا وہی زمانہ امیر خسرو کا تھا جنھوں نے اپنی "قران السعدین" میں کیقباد کی موسیقی کے حالات درج کئے ہیں۔

اس کے پچاس کے بعد ۶۸۶ھ میں جب کہ معز الدین کیقباد تخت نشین ہوا اس کے زمانے میں موسیقی کا عروج تھا اور تمام ہندوستان سے گانے والے اور گانے والیاں سمٹ کر دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔

جلال الدین فیروز خلجی کے زمانے ۶۸۹ھ میں نامور مغنی محمد شاہ چنگی فتوحا، نصرت خاتون اور مہرو زوغیرہ موسیقار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

علاؤ الدین خلجی کے زمانے ۶۹۵ھ میں زیادہ تو نہیں لیکن کچھ سلسلہ موسیقی کا جاری رہا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ محمد تغلق کے دربار کا سب سے بڑا گویا اور اس کا داروغہ ارباب نشاط امیر شمس الدین تبریز تھا۔ الغرض اس زمانے میں دکن اور خصوصاً دولت آباد فن موسیقی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس طرح تمام ہندی موسیقی پر عجمی موسیقی کا کافی اثر پڑا۔ اور جس طرح بخارق اور یہ نے عربی کی دھنیں فارسی گانوں میں منتقل کر دیں اسی طرح بادشاہوں کے مغنیوں نے اپنے ممالک کی دھنیں ہندوستان میں آن کر گائیں اور نئے نئے راگوں کی بنیادیں قائم ہونا شروع ہو گئیں یہ اسی میل جول کی برکت ہے کہ عجمی موسیقی کے عام پسند راگوں میں رنگ و جس کو اب جنگلہ اور حجاز کو نیچ اور رفو رچکا کہتے ہیں۔ اسی طرح زیلف، ایمن، درباری، عشاق، سرپردہ، کھماچ وغیرہ اسی موسیقی کی پیدا شدہ یادگاریں ہیں، جو آج مقبول عام ہیں۔

بحر اور اوزان

چونکہ گانے کا تعلق نظم سے ہے اور نظم بلا کسی بحر کے نظم نہیں کہی جا سکتی اور بحر کے واسطے اوزان کا ہونا ضروری ہے کیونکہ بلا اس کے تال اور رسم کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے امیر خسرو نے بحر اوزان اور تال سم کے بھی قواعد مقرر کئے ہندی گانوں کا دارومدار سُر، لے اور تال سم پر ہے۔ فارسی میں اسی کو نغمہ، ادائرہ اور اوزان کہتے ہیں اور تمام عجمی گانوں کا دارومدار دائرہ اور نغمہ پر ہے۔

ہندی تالوں میں ساڑھے بارہ تالیں بتلائی جاتی ہیں۔ اور امیر نے چوبیس بحر میں تالیں ایجاد کی ہیں جن کے اقسام حسبِ ذیل ہیں۔

بحر ہزج، بحر ترکی، بحر دوبک، بحر دور، بحر ثقیل، بحر خفیف، بحر چہار ضرب، بحر دوازدہ، بحر ابین، بحر ضرب الفتح، بحر فاختہ، بحر رمل، بحر متقارب، بحر طویل، بحر رجز، بحر کامل، بحر بسیط، بحر تصریع، بحر منسرح، بحر سریع، بحر مجتث، بحر مرتفع، بحر مقتضب، بحر وافر۔

قواعد تقطیع

تقطیع کو زیادہ سریع الفہم بنانے کی غرض سے نیز بحر کا تعلق اوزان اور موسیقی سے بتلانے کی غرض سے ذیل کا طریقہ پیش کیا جاتا ہے تقطیع اوّل متقارب المثمن کو طبلہ کے ایک تالا ٹھیکہ کے ساتھ سمجھئے۔

کریما بہ بخشائے بر حال ما کہ ہستم اسیر کمند ہوا

یہ تو ہے شعر۔ بحر اس کی فعولن فعولن فعولن فعول ہے۔ اس بحر کے گویا چار حصے ہیں۔

موسیقی سے ان ٹکڑوں کی یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے ایک تالا ٹھیکہ

مقرر فرمایا ہے۔ یعنی دھی۔ ترکٹ۔ دھنا۔ دہا۔ تو۔ تا۔ ستا۔ گانے میں اس تال کی ضرب برابر چلی جاتی ہے۔ اور دوسری دگی پر صورت سم کی ہے۔ اور بحر ہذا میں لفظ فول رکن چہارم پر ظاہر ہوتا ہے اور آٹھویں بحر المثمن السالم میں بھی کہ جس کے چار حصے برابر ہیں۔ ٹھیکہ ایک تالا نہایت موزوں ہے اور ٹھیکہ جھپ تالے میں بھی یہ وزن صحیح ہوتا ہے۔ ضرب کے علاوہ دونوں تالوں کی ایک صورت ہے۔ چنانچہ چوتالا دھرپد کا ایک ہی طرح ایک تالے میں گانا بجانا ممکن ہے۔

حضرت امیر خسرو نے بحر رمل المثمن المحذوف کا وزن تالا تال فارسی میں موزوں کیا ہے۔ یہ تالا چار ضرب کا ہے یعنی تین بھری اور ایک خالی۔ اور ان تین میں سے دوسری یعنی دگی کی ضرب پر سم ہے۔ اس طرح پر چار رکن بحر مذکور کے ہیں مثلاً فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن۔

تقطیع بحر ہذا ملاحظہ ہو۔ مصرع یہ ہے۔

"اے پیارے کہ میانت بچھو موتے در کمر"

اے پیارے	کے میانت	بچھو موتے	ور کمـــر (خالی)
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن (خالی)
تادھن دہا دہا	دھن دہا دہا	دھن دہا دہا	تن تا (خالی)

غور فرمائیے کہ تن تا کا درجہ خالی رہا اور فاعلن آخری رکن خالی پر پڑا اور لفظ در کمر کے مقابلہ میں خالی دگی اور دوسرے رکن کے فاعلاتن پر سم ہے اور اس سے پہلے لفظ کے اوپر سم ا اور اس سے مقابلہ میں دوسری دگی پر سم ہے۔

یہ تال چار ضرب کی کہلاتی ہے جن میں تین ضرب بھری اور ایک خالی ہے۔ بحر خفیف المسدس المحذوف جس کا وزن تال سول فاختہ پر ہے۔ اس میں چپک تال ہے اور یہ دونوں تین تین ضرب کی ہیں۔

اے مطلت رشک مشک تاتارے ذوقی بحر خفیف گردآرے

سول فاختہ میں دو ضرب اوّل کی برابر ہیں اور ایک ضرب آخر میں وقفہ دے کر پڑتی ہے۔ پہلی ضرب فا پر اور دوسری ضرب لا پر اور تیسری ضرب مفاعلن کا مد چھوڑ کر بطور وقفہ حصہ سوم کے لفظ لن پر پڑتی ہے۔ مذکورہ بالا شعر کا وزن اور ٹھیکہ یہ ہوگا۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن۔ یہ ٹھیکہ سات لفظ کا ہے۔ یعنی دہ دہ تکت دہد۔ دہ نہ تکت۔ اس کی اوّل ضرب خود سم ہے۔ پہلی دہ پر اور دوسری تک پر اور تیسری ضرب دوسری تکت پر اور تیسری ضرب دوسری تکت پر ہونی چاہئے اور تال چپک میں ضرب اول کے حرف فا پر اور دو ضرب برابر رکن دوم فاعلن کی ضرب کا آخری حصہ دوسرے رکن سوم کی طرف فا پر اور تیسرے لفظ لن پر پڑنا چاہئے ضرب اسی قدر فرق سول فاختہ اور چپک میں پایا جاتا ہے البتہ منقلب کرنے سے تال تبدیل ہو جاتی ہے۔

امیر کی ایجاد تال سم

اس ایجاد کے سلسلے میں ماہر موسیقی دولت شاہ اور حکیم محمد کرم خاں وغیرہ نے لکھا ہے کہ امیر نے پکھاوج کی بجائے ڈھولک اور طبلہ ایجاد کیا۔ اور ان کے بجانے کے قواعد مقرر کر کے امیر نے سترہ تالیں قائم کیں۔ جن میں فارسی کے قواعد کو بھی ملحوظ رکھا۔ یعنی اوّل خمسہ پانچ تال سواری چار تال، فرودست پانچ تال، پہلوان چار تال، چپت تین تال، زنانی سواری پانچ تال اور سات تال، پشتو ایک تان اور اگر ضرب کی دم دی جائے تو تین تال کی ہیچ ہے۔ آڑا چوتالا چار تال، قوالی تین تال، زود بجر تین تال، جھومرا تین سال (روپک تال ہندی ہے) سول فاختہ تین تال (یہ مثابہ ہے ہندی کی چپک تال سے) جس کے معکوس کرنے سے سول چپک اور چپک سول ہو جاتی ہے۔

فارسی ترانہ مع تال اور سم

تنّم درنانا در در نم — تنہ در نانا در در نم

دوبیک — دوارویہ
وشش وشش لو ن — وش وش لون وش وش لون

روانی — بسیت
وش تکہ وشش لو ن — وشش لون وش وش لو ن

نیم دور — چپ انداز
وش لو ن تکہ وشش — وشش نہ وشش لون
وش وش لون

نالہ — نیم ثقیل
وشش نہ وشش لو ن — تکہ تکہ تکاوش تکاوش تکہ تکہ
نکاوش تکاوش وش لو ن

خنجر — مخمس
وش لون تکہ وشش وشش — تکہ تکہ تکاوشش تکاوشش
لون وش وش لو ن لو ن — لون وش وش تکہ تکہ تکہاوش

سماعی — دور حقیقی
وش وش لون تکہ وش لو ن — وش لون لون وش لو ن
وشش وشش ــــ لون — لون وش لون وش لو ن
وش وش لو ن وشش لون

تنگ ضرب — وشش تکہ وشش تکہ
تکہ تکہ تکاوشش — ضرب فاختہ
وش وش لون لون وش وش — وشش وش لو ن

قلبانہ

قلبانہ کی اصل قلبہ ہے۔ امیر خسرو نے زبان عربی کو ہندی میں ملایا ہے۔ تال سواری اور تتارا استائی بول ہیں۔ نقد صدق قربہ تعالیٰ "انترا" امیر خسرو چل چل جاویں حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار گاویں۔

قلبانہ اور قول کہ جس کی اصل قول ہے کچھ عربی اور کچھ الفاظ ترانے کے ملا کر

ایجاد کیا ہے۔ استائی تال تتالہ ۔ حیٰ دررورتالالالے ۔

حسن و نظام الدین اولیاء دیم ذیم وردرودرتے۔ تان یہ ہے تلے تھناناناناناناانترایہ ہے فایما تولوفثم وجہ اللہ درتم ۔ ذرتم توم توم تتانانانا۔ در دے تلے تلے دراجانم ذیم ذیم وردرودرتلے تان تلے ناناناا س کے بھی انترے سے تال بدلتی ہے اور نقشِ گل میں تال نہیں بدلتی ہے ۔ اکثر یہ تال پشتو اور قوالی میں گائی بجائی جاتی ہے ۔

نقش سے مراد رباعی اور گل سے بیت ہے گویا مختصر سا ایک شعر ہے۔ بقیہ اوروں میں تالیں بدلتی ہیں اور دہرپد کی بجائے کہ اس میں چار پانچ چرن ہوتے ہیں (اور بعض میں دو چرن بھی ہوتے ہیں) امیر نے خیال مقرر کیا ۔ جس میں صرف دو ہی چرن ہیں ۔ لیکن تانیں اس میں بحر او مجھی زمزمہ پر رکھیں جس کو آج زمانہ گٹکری کہتے ہیں ۔

اصلیت یہ ہے کہ ہندی میں پہلے گٹکری نہ تھی اور اب بھی اس میں دانے کا پڑ جانا عیب میں داخل ہے ۔ اسی وجہ سے امیر نے اس کی بجائے پربند کا ترانہ بنایا اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ سننے والوں کے علاوہ خود گانے والے بھی محو حیرت رہ گئے ۔

ڈھولک اور طبلہ بھی پکھاوج پر غالب آگئے ۔ اسی طرح ستار کے بولوں نے بین کے بولوں کو شرما دیا ۔ اس زمانے میں بھی قوال تقریباً ہر جگہ موجود ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں جو قول اور قلبانہ سے بخوبی واقف ہوں ۔ ورنہ عام طور پر جو خیال وغیرہ گاتے ہیں وہ بھی قوال کہلاتے ہیں ۔

جیسا کہ شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ امیر نے دہرو، دھوا، ماتھا، چندو، پربند، گیت، دہرپد، کی بجائے خیال، قول، قلبانہ، نقش گل اور ترانہ ایجاد کئے اور جس طرح پرکر دھوا، ماتھا اور چندو کی تالیں بدلتی ہیں اسی طرح قول قلبانہ وغیرہ میں بھی تالیں بدلتی ہیں ۔

قدرتی طور پر جوش اور جذبہ کی حالت جو الفاظ باتے ہو وغیرہ کے نکلتے ہیں ۔ ان کو حضرت امیر نے ان الفاظ میں منتقل فرمایا ۔

تاتو ن بروزن تو ۔ وان بروزن جان وایں مقرر کر کے الاپ بروزن کباب مقرر کیا ۔ اس سے زیادہ الاپ اس چھ قسم کی قوالی یعنی خیال، قول، قلبانہ، نقش گل اور ترانے میں نہیں ہیں اگر ہیں تو معیوب ہیں ۔

یہ راگ گویا امیر کی امانت ہیں ۔ ان میں ترمیم تنسیخ اور اس امانت میں خیانت نازیبا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے رفتہ رفتہ یہ رنگ معدوم ہو جائیں گے یا ان کی شکل تبدیل ہو جائے گی ۔ الاپ یا مُرکی اور گٹکری ایک جداگانہ چیز ہے جو گانے کو پُر لطف بناتی ہیں ۔ لیکن ان سے اشعار کے الفاظ کٹ جائیں اور ناقابل فہم ہو جائیں تو وہ عیب میں داخل ہے ۔ اس کے گانے میں جو تان لی جائے وہ بھی اسی راگ کی ہونی چاہیے جس میں وہ غزل گائی جا رہی ہو ۔ اگر ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا گیا تو قوالی بے لطف ہو جاتی ہے ۔

ترانہ

ترانہ بہ وزن فسانہ ولفظ تتا بروزن ثنا، سیم و زر بروزن سر اور نا بروزن جا اور توم بروزن موم، تتا بروزن فنا، اس کے علاوہ اور حروف معزوات مثلاً تا، دال، نون، الف، یا، میم، را، واؤ یہ آٹھ حروف ہیں ۔ ان کے علاوہ ہر کٹ تر کٹ بروزن سلوٹ مستعمل ہیں اگر آٹھ حروف سے زیادہ ہوتے تو ترانے کے شمار سے باہر ہو جاتے ہیں ۔

امیر نے ترانہ بزبان فارسی ایجاد کیا یعنی در آ ۔ در آ ۔ در تنم ۔ در آ جان من در آ ۔ در آ ۔

تنگ آمدہ ام چند انتظار کشم
بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم

ترانہ سوہے کا اور تال فرودست کی ہے ۔ دراصل اس کی تال خسہ کی ہے ترانہ یہ ہے ۔ دا دراتیلے ۔ دردانے ما اشل لایتے ۔ اشل لایتے تلایلے ۔ پہلے کی خالی سے شروع ہے ۔

بہ ہندی دلشوخی ہم چو خسرو
ہزاراں خاناں برکندہ باشی

ستار

امیر نے بین کی بجائے ستار ایجاد کیا ۔ بین میں سات تار دو تونبی اور مضرابیں ہوتی ہیں اور دو مضرابوں کو چھنگلیا انگلی میں پہن کر بجائی جاتی ہے وہ باز جن میں تار ہوتے ہیں ان کے بجانے کے صرف دو ہی طریقے ہیں یا تو مضراب سے یا بالوں کے کمانچہ سے ۔ مضراب کو تت اور کمانچہ کو تبت کہتے ہیں ۔ اور لکڑی کے ٹکڑے کو جس سے بجاتے ہیں ۔ اس کو گھن کہتے ہیں ۔

ستار کا اصلی ابتدائی نام سہ تارہ اور سرود کا سہ رود ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان دونوں باجوں میں پہلے صرف تین تار تھے اور تین تانت تھیں ۔ امیر نے ستار میں ایک تار آہنی اور دو برنجی لگا کر نصف تونبہ سے بین کی مشابہ بنا دیا ۔

ستار میں ایک سبتک کامل اور دو سبتکیں ناقص ہیں ۔ یعنی سبتک اول مدھم سے سبتک میانہ تک اور سبتک دوم) سبتک میانہ سے گندھار تک ۔ ایک سبتک زائد چڑھی ہوئی مع گندھار تک ہوتی ہے جس کو امیری سبتک کہتے ہیں ۔ البتہ بیچ کی سبتک کامل ہے ۔

حضرت امیر نے جو قواعد مقرر کئے وہ یہ ہیں ۔

بیچ کی سبتک کو کامل کیا، جب یہ تین سبتکیں مقرر ہو گئیں تو ترتیب کے ساتھ اس میں چھ تار اس طرح پر رکھے کہ ۔

اول تار باج کا، دو تار برنجی کھرج کے، ایک تار آہنی پنچم کا، ایک برنجی گنگو اور پھر ایک تار آہنی اس کے برابر جس کو چکاری کہتے ہیں، جو تار برنجی ہیں وہ کھرج کہلاتے ہیں، جو باج ہیں ان کو یہ حساب مدھم کوک کہتے ہیں سیدھے ہاتھ کی طرف کھرج آہنی اور برنجی ہوتی ہے، پنچم اور چکاری ہم وزن مدھم ہوتے یا سُر کے مطابق ہوتے ہیں اور سبتک دوسری اور تیسری میں کام آتی ہے ۔

امیر کے ایجاد کردہ راگ

امیر کے گانے اور ان کی ترکیب

مرتبہ۔ سید بڑے آغا۔

گانے سمجھنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ حلق سے آواز نکال اس کے اتار چڑھاؤ کو سمجھایا جائے۔ یا آوازوں کے ایسے نشانات اور علامات مقرر کئے گئیں جن سے ان کی شناخت ہو سکے۔ ایسے علامات کو نوٹیشن کہتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) سرگم۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔
یہ بیچ کی سپتک کے چڑھے سُر ہیں۔ جو تیور ہیں۔

(۲) سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ ان میں جو حروف کٹے ہوئے ہیں وہ بیچ کی سپتک کے اترے ہوئے سُر ہیں۔ جو کومل ہیں۔

(۳) سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔
یہ اوپر کی سپتک کے چڑھے ہوئے سُر ہیں۔ جو تیور ہیں۔

(۴) سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ دھا۔ نی۔
جو حروف کٹے ہوتے ہیں وہ اوپر کی سپتک کے اترے سُر ہیں جو کومل ہیں۔ علامات زیر کی ہیں۔

(۵) سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ گا۔ رے۔ سا۔
ان زیر کی علامات کی وجہ سے یہ نیچے کی سپتک کے چڑھے سُر ہوتے جو تیور ہیں۔

(۶) سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ گا۔ رے۔ سا۔
ان علامات کی وجہ سے یہ کومل ہوتے۔

راگ مجیب یا مجیر

یہ راگ کافی ٹھاٹ کا ہے اور شاڈو سمپورن ہے۔ آروہی میں گا ورجت ہے۔ (یعنی معدوم) اور امروہی میں وکرت ہے، جس میں ٹیڑھا گا ما رے ما ہے۔ اس میں رے پا گا ما رے سا کی تان آتی ہے جس سے ملار کا رنگ یعنی صورت کا شبہ ہوتا ہے۔ اس میں سموت وادی اور گندھار سم وادی ہے۔ اس وجہ سے دن کے وقت گانا چاہئے۔ اس میں امیر خسرو کی قوالی کا رنگ بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ زیادہ تر درگاہوں میں گایا جاتا ہے اور خاندانی قوالوں کے گھرانے کا خیال کہلایا جاتا ہے۔

یہ راگ مخر میل یعنی ایک سے زیادہ راگوں سے مرکب ہے۔ آروہی اس کی سا رے ما پا دھا نی سا ہے۔ اور امروہی اس کی سا نی دھا پا ما پا نی گا ما رے سا اور بول اس کے یہ ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء پیر مشائخ نور
آن پڑے دربار تمہارے عشر و پر کرپا
کرو ہراتے انبیاء پیر مشائخ نور
راگ سازگری

یہ مارو ا ٹھاٹ کا سمپورن راگ ہے۔ اس کا سروپ یعنی شکل نہ تو گا اس کا وادی سُر ہے۔ اس میں دونوں دھیوتوں کا رواج ہے، جانے میں تیور اور آنے میں کومل ہے۔ اس میں نکھاد اور رکھم کی سنگیت ہے۔ شدھ مدھم کی لگائی جاتی ہے، گانے کا وقت شام کا ہے۔ یہ راگ پوریا اور پوربی کے ملنے سے پیدا ہوا ہے، چونکہ رنگ پوریا کا ہے لہٰذا اس کو مندر اور مدھ استھان سے گانا چاہئے۔

آروہی اس کی نی۔ رے۔ سا۔ نی۔ دھا۔ نی۔ رے۔ گا ما گا ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا ہے۔

امروہی۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ دھا۔ ما۔ گا۔ رے۔ سا۔

خیال ایک تالہ الفاظ یہ ہیں۔

چنگے کام ہووے آسان۔ نت چین پر بیٹھے ہی۔ دربار ہووے اپن آرام۔
اولیا کے چرن پر ہووے شام تت چین مثت دلدر دہام۔

راگ ایمن کلیان

کلیان ٹھاٹ کا پہلا راگ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ "معارف النغمات" صفحہ ۱۱۹ میں ہے۔ اس راگ میں گندھار گرہ انش اور نیاس کا سُر ہے۔ راگ کا وقت شام، شام کے گانے کا ہے۔ بعض پرانے پنڈتوں نے بھی اپنی کتابوں میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ یہ راگ ملک ایران کا ہے۔ صوبہ دکن کی پرانی سنگیتوں میں بھی یہ راگ موجود ہے اور ان میں گانے کا وقت بھی شام ہی کا درج ہے۔

تان سین کی مت میں ہے کہ شدھ کلیان ایمن اور بلاول ملا کر ایمن کلیان راگ بنایا گیا ہے اس لئے گانے وقت ان تینوں راگوں کا ثبوت ملنا چاہئے۔ یہ راگ سمپورن ہے اور آنے جانے میں ساتوں سُر لگتے ہیں۔ اور دونوں مدھم سے گایا جاتا ہے۔ گاما پا رے سا۔ شدھ کلیان کا ثبوت ہے باقی سُر ایمن کے ہیں۔

آروہی۔ سا رے گا ما پا دھا نی سا۔
امروہی۔ سا نی دھا پا ما گا ما گا رے سا۔
وادی۔ نی سمواد ی گا ہے۔ گانے کا وقت غروب آفتاب کے بعد ہے۔

گانے کے الفاظ یہ ہیں۔

گنی جانو گنی سچا نو گنی بین سو برا و گنی گنی نہ کر وچیت دہر دھیان کرو۔ مورکھ باورے۔ جب کرتار کی مہر عنایت ہو۔ تب گنی لے ساچی تان۔

طبلہ کے بول۔ تا دھن دھن نانا۔ تن تن نانا۔ دھن دھن نا۔ کلیان ٹھاٹ تین تال۔

راگ عشاق

یہ راگ بسنت سارنگ اور نوا سے مرکب ہے۔ شاڈو یعنی چھ سُر جاتے ہیں اور چھ آتے ہیں۔ اس میں گندھار نہیں لگتی۔ سا سے اور پا تک سارنگ کی چال ہے اور پا سے سا تک بسنت کی چال ہے۔ یہ راگ گانے میں آسان ہے۔ اس کا

وادی سُر ما ہے اور سم وادی سا ہے۔ دن کے وقت گایا جاتا ہے۔
آروہی۔ اس کی سا۔ رے۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔ ہے۔
امروہی۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ رے۔ سا۔ ہے۔
خیال۔ اس راگ کا ایک تال کا ہے، الفاظ یہ ہیں۔
سانچی دہرن سانچی پورن، سانچو راگ سانچی تان
جو کوئی گاوے تال سرن میں واکو گنی مان
تال سُرن بھید جانے کال اکالی پہچانے
جو آپ کو جانو خسترو واکو بڑو گیان

راگ موافق

یہ راگ گوڑتی مالتی اور ذوگاہ سے بنایا ہے۔ آخر الذکر فارس کا راگ ہے۔ پا اس کا وادی ہے اور سا سم وادی ہے۔ صبح کا وقت گانے میں مزا دیتا ہے۔ گوڑتی میں دھا وادی ہے۔ اور مالوتی میں رے۔
آروہی۔ اس کی سا رے گا پا دھا سا۔
امروہی۔ سا دھا پا گا رے سا۔
خیال۔ تین تال۔
بن کے پنچھی بھئے باورے ایسی بین بجائی سانورے۔
تار تار کی تان نرالی جھوم رہیں سب بن کی ڈاری۔
پن گھٹ کی پنہاری ٹھاڑی بھول گئیں خسرو پنہیا بھرن کو

راگ غنم

یہ راگ اوڈو اوڈو یعنی پانچ سُر کا ہے۔ پوربی اور ترینی جس کو ترون کہتے ہیں، ان سے بہت مشابہ ہے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ امیر نے پوربی راگ میں تھوڑا سا تغیر کر دیا ہے۔ یعنی پوربی میں کڑی مدھم ہے اور اس میں مدھم نہیں ہے۔ بھیروں میں اتری رکھب وادی ہے۔ اور اس میں پا وادی ہے پوربی میں سرگا۔ وادی کے ہیں۔ یہی فرق ہے ترون شری راگ کے مانند گایا جاتا ہے۔ اور اس کی طرز پوربی راگ کی طرح پر ہے۔ گانے کا وقت شام کا ہے۔
آروہی۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔
امروہی۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ گا۔ رے۔ رے۔ سا۔
خیال راگ غنم تال تین تال۔ الفاظ یہ ہیں۔
ارج سنو موری آج پیر مورے۔ چرن چھوئے
کی لاج راکھو مورے پیارے۔ تمہیں تو سدھاؤ
دھیر مورے پیر

راگ زیلف

یہ بھیروں ٹھاٹ کا سمپورن راگ ہے۔ اور امیر کی عجیب ایجاد ہے۔ عام گویئے

اس کو کم گاتے ہیں۔ یہ راگ مشرمیل کا ہے اور کئی ٹھاٹ ملا کر بنا ہے، اسکی آرانگ میں کانڑے اور بھیروں کا رنگ دکھلایا ہے۔ امروہی میں رکھب ورجت ہے۔ دھیوت کا سُر وادی اور گندھار کا سُر سموادی ہے۔ گانے کا وقت پہلا پہر دن ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ اس میں جونپوری اور رکھٹ بھی شامل ہے۔ اس لئے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ اس راگ کو بھیروں سے الگ کرنے کے لئے رکھب کا سُر بہت کمی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔
"سرمایۂ عشرت" میں لکھا ہے کہ اس راگ کا ٹھاٹ کانگڑے کی طرح پر ہے یعنی کھرج پنجم، اچل رکھب مدھم اور دھیوت کومل ہیں۔ گندھار اور نکھاد تیور ہیں اور ادچار اس کا دھیوت کم سے ہوتا ہے۔ اسی لئے گانے کا وقت آخر شب ہو سکتا ہے۔
آروہی۔ سا۔ رے۔ گا ما پا دھا نی سا
امروہی۔ سا نی دھا پا دھا ما گا ما سا
ترانہ ٹھاٹ آساوری۔

تال جھپ تال

درود رتوم نادر در توم نادے رے نانا
نادا رے دانی تا آتوم تانانے تے نانا
تے دارے دانی
پائے سگ بوسیدہ مجنوں خلق پرسید یتی
گفت ایں سگ گاہے گاہے کوئے لیلیٰ رفتہ بود
خیال۔ ٹھاٹ بھیروں، تال تین تال۔ بول یہ ہیں۔
سب نگر آنند بدھاوا الاری مالنیاں
پھولن دے ہار اسب جگ میں بھیو اجیارا
جب حضرت جنم پایو سب منگل گایو

راگ فرغانہ

یہ راگ دیس کار، دیو سالکہ، گوجری، گونکر، سرکھی، سندھوی، سندھو، ونتی، ساونت، ترون، بھوپالی، اشٹ منگل، بھیروں، ماروا اور بنگال، وغیرہ اقسام کے راگوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ گوڑا اور گن کلی سے یہ راگ مرکب ہے۔
آروہی۔ گن کلی بھیروں ٹھاٹ۔ سا۔ رے۔ ما۔ پا۔ دھا سا۔
امروہی۔ سا دھا۔ پا ما رے سا۔
بھیروں ٹھاٹ کی گوڑی آروہی۔ سا رے گا ما پا ما دھا نی سا۔
امروہی۔ سا نی دھا پا ما گا رے سا۔
فرغانہ تین تال بھیروں ٹھاٹ
آروہی۔ سا رے سا۔ ما۔ گا۔ پا۔ نی۔
امروہی۔ دھا۔ نی۔ سا۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ پا گا۔ ما۔

وادی ۔ سنسو ۔ ما۔
سموادی ۔ ما ۔
گانے کا وقت دن کا ہے ۔

بول

جے جے نظام الدین جگ تارن ۔ تاپر نین پران کردارن
خسرو کے پربھو احمد کے پوت تن من اور دھن کردوں نثارن

راگ سرپردہ

یہ بلاول ٹھاٹ کا سمپورن راگ اور بلاول کی ایک قسم ہے ۔ گانے کا وقت پہلا پہر دن ہے ۔ بعض اس میں گندھار کو وادی مانتے ہیں اور بعض دھیوت کو ۔ کیوں کہ یہ راگ صبح کا مانا گیا ہے ، اس میں تو رگندھار کا وادی ہونا صحیح نہیں ہے ۔ کھرج اور پنچم وادی سموادی سُر ہیں ۔

امروہی میں بلاول کی شکل کا ظاہر ہونا ضروری ہے ۔ بیہاگ کی بھی شکل نظر آتی ہے ۔ لیکن بیہاگ میں نکھب دربل یعنی کمزور ہے اور اس میں صاف ہے ۔
بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ راگ ایمن اپیا اور گونڈ سے مرکب ہے ۔
آروہی ۔ سارے گا ما دھا پا دھانی سا ہے ۔
امروہی ۔ سانی دھا پانی دھا پا ما گا مارے سا ہے ۔
خیال راگ سرپردہ تال تین تال ۔ بول یہ ہیں ۔
" سلطان جی صاحب نجام الدین اولیا تو ہے
بل بل جاؤں ، موہے پیر تو سوں دیا چرن تیرے
گئے خسرو پایا میں نے اپنا الیسو پیر مورے تم نجام الدین اولیاء "

راگ باغرو

اس میں ایک راگ فارسی شامل ہے ۔ جس کے نام کا پتہ نہیں چلا ۔ اس میں گا وادی اور دھا سموادی ہے ۔ گانا آسان ہے ۔ اس راگ کا کوئی خاص وقت معین نہیں ہے ۔ راگ سمپورن ہے ۔
آروہی ۔ سارے گا ما پانی تا ، ہے ۔
امروہی ۔ سانی دھا پا ماگا رے سا ہے ۔
خیال راگ باغرو تین تال الفاظ یہ ہیں ۔
دل من دل من دل من ایں آوارہ ۔ دل من
پارہ پارہ دل من ، ایں بے چارہ ۔ دل من
دل من دل من دل من ایں دیوانہ دل من عاشق
جاناں دل من ، ایں پروانہ دل من
خسرو در عشق خراب ، ہم چو ماہی بہ سراب ہو تے
دل من بہ شتاب ۔ ایں دیوانہ دل من

راگ صنم

یہ راگ کلیان اور بلاول کو ملا کر بنایا گیا ہے ۔ بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ ایمن کلیان اور ایک فارسی راگ ہے جس کو نوروز اور نور چکا بھی کہتے ہیں یہ راگ آسان بھی ہے اور رنگدار بھی ۔ سدھ سارنگ اور شام کلیان سے مشابہ ہے ۔ مگر آج کل جو سدھ سارنگ مروج ہے اس میں کومل نی یعنی نکھاد اور تیور گندھار نہیں ہے ۔ کافی ٹھاٹ کی نشانی کومل گندھار اور کومل نکھاد ہے پس ان دونوں سروں کا سدھ سارنگ میں نہ ہونا اس راگ کو قاعدہ میں نہیں رہنے دیتا ہے ۔ سدھ سارنگ میں گندھار نہیں ہے اور صنم میں گندھار بدرجہ اتم موجود ہے ۔ سدھ سارنگ میں کومل نکھاد انوادی سُر ہے صنم راگ میں یہ سُر برائے نام ہے ۔ سدھ سارنگ کا نیاس یعنی خاتمہ (نی) پر ہے اور اس میں (رے) پر ہے شام کلیان اور سدھ سارنگ میں دونوں مدھیم ہیں اور نہ اس میں بھی دونوں مدھیم ہیں ۔ اس طرح پر آروہی میں تیور اور امروہی میں کومل ہے ، سدھ سارنگ اوڈو ، اوڈو یعنی پانچ پانچ سُر کا راگ ہے اور صنم شاڈو سمپورن ہے ۔ یعنی چھ سات کا ۔
آروہی ۔ سارے ما پا دھانی سا ۔
امروہی ۔ سانی دھا پا گا مارے سا ۔
گانے کا وقت رات کا ہے ۔
خیال صنم ایک تال ۔ الفاظ یہ ہیں ۔
" اندھیری گھٹا کالی حسن چراغ علاج دل ماکن خسرو کنج باغ "
خیال دیگر صنم تین تال الفاظ یہ ہیں ۔
نجام الدین پیر اولیا نجام الدین شان انبیا خسرو
آن پڑے چرنن میں کرپا کرو بہر کبریا

راگ زنگولہ

اس راگ کا تعلق دو راگوں سے ہے یعنی بھیروں اور آساوری اس لئے اس میں دونوں دھیوتیں لگائی جاتی ہیں ۔ مگر شدھ دھیوت کمی کے ساتھ لگتی ہے جس میں بلاول کی صورت نظر آتی ہے مگر اصلی رنگ بھیروں ہی کا رہتا ہے ۔ گانے کا وقت صبح کا ہے ۔ اس میں دھا وادی ہے اور رے سموادی ۔
آروہی ۔ سارے گا ما پا دھانی سا ۔
امروہی ۔ سانی دھا پا ما گا رے سا ۔
خیال ۔ ایک تال بھیروں ٹھاٹ
من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
دوہرہ راگ زنگولہ آساوری ٹھاٹ تال ایک تال
محبوب پیکری ل کا ہے ، کو کرت نت آنکھ چورا چائی رے ۔ سات سکھی ل بنگل گاوین ہو ورن چوک پرایو رچایو رے ۔
انترہ دیگر نیمالی متان مین رے تم بھو نا ایک خسرو کرت آستی گن گایو رے "
من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی ۔ سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

ماہرؔ القادری

اے شہنشاہِ تغزل، اے امامِ فکر و فن — تیرے شعروں کی روانی موجۂ گنگ و جمن

اللہ اللہ تیری غزلوں کا مزاجِ رنگ و بو — جس طرحِ غنچے کنول کے، جیسے گلہائے سمن

تیرا لہجہ نغمگی کی روح، موسیقی کی جان — لفظ و معنیٰ کی جوانی تیرا اندازِ سخن

سعدی و حافظ کی صف کے شاعرِ شیریں نوا — تو کہ اپنی ذات سے تھا فارسی کی انجمن

بس ترے خوانِ کمالِ شعر کے زلّہ ربا — رند ہو یا پارسا ہو، شیخ ہو یا برہمن

امتزاجِ شعر و نغمہ، ربطِ آہنگ و نوا — ہے اسی فن کی بدولت اتحادِ جان و تن

کہہ مکرنی ہو پہیلی ہو کہ ہوں وہ لوگ گیت — طفلِ اُردو کو پہنایا تو نے پہلا پیرہن

تو ہے خود اپنی جگہ شعر و سخن کی روشنی — جگمگا اٹھے ترے افکار سے کوہ و دمن

ندرتِ لفظ و بیاں بھی، جدّتِ تخئیل بھی — ہے سلاست میں نزاکت سادگی میں بانکپن

موجدِ عشاق اے نغمہ نواز و نغمہ گر — راگنی دیوی نے خود آکر چھوئے تیرے چرن

صاحبِ فکرِ رسا اے شاعرِ شیریں نوا — ہر غزل کا تیری مطلع صبح کی پہلی کرن

تیری پرگوئی کی مل سکتی نہیں شاید مثال — شعر خود ہوتے تھے موزوں ارتجالاً دفعتن

بحرِ عرفاں کے شناور، صاحبِ حال و مقام — تیرے دم سے لہلہا اٹھا طریقت کا چمن

آمدم در بارگاہت نغمہ سنج و مدح خواں
ہدیۂ ازمن بگیر اے خسروِ ملکِ سخن

جمیل مظہری

○

یہ کس کے ذہنِ رسا کے سائے میں پل رہے ہیں نئے تصور
یہ کس کے جوشِ عمل کے سانچے میں ڈھل رہا ہے نیا زمانہ
یہ کس کے افسونِ ادعا نے طلسم صدیوں کے توڑ ڈالے
اجڑ گئیں ساری بارگاہیں، پلٹ گیا سارا کارخانہ
نہ وہ سیاست کے آشیانے، نہ وہ شریعت کے آستانے
نہ وہ ہوس کے قمار خانے، نہ وہ خرد کا نگارخانہ
تصورِ رنگ و بو بھی بدلا، طبیعت آب و گِل بھی بدلی
فسانے بننے لگے حقیقت حقیقتیں بن گئیں فسانہ
جو راکھ کے ڈھیر رہ گئے ہیں وہ اب اٹھیں گرد راہ بن کر
ہوا کی رفتار کہہ رہی ہے کہ قافلہ ہو چکا روانہ
بجھے چراغوں میں روشنی ہے، نشیلی آنکھوں کی نیند اڑی ہے
جمیل کی بانسری نے چھیڑا ہے شام سے صبح کا ترانہ

ساغر نظامی

ادب اے جہانِ حاضر یہ ہے بزمِ خسروانہ
ہے یہاں ازل ترنم، ہے ابد یہاں ترانہ
ہے ہر اک گدا کو حاصل غمِ عشق کا خزانہ
کہ رموزِ فقر سمجھے مرا خود غرض زمانہ
ترا نقشِ پا جہاں تھا وہیں اک آستانہ
کہ اگل دیا زمیں نے کوئی گمشدہ خزانہ
کبھی آہِ صبح گاہی کبھی نالۂ شبانہ
ہے وظیفۂ مسلسل ترا سوزِ عاشقانہ
تری انگلیوں میں بربط تری جنبشوں میں نغمے
ترا ہر نفس ترنم، ترا ہر نفس ترانہ
نہ یہاں ہے کوئی ہندو، نہ یہاں کوئی مسلماں
کہ ہے کعبۂ محبت ترا سنگِ آستانہ
ہو مبارک آسماں کو یہ فروغِ ماہ و انجم
کہ ہے کہکشاں سے بڑھ کر تری خاکِ آستانہ
نہ ٹھہر سکا جبیں میں مری بندگی کا طوفاں
جو فضا میں جگمگایا ترا سنگِ آستانہ

مظفرالدین خاں

(۱)

اے ہند کی اقلیمِ سخن کے مختار
حافظ نے کئے تھے حفظ تیرے اشعار
تو طوطیِ ہند ہے امیرِ خسرو
آتی ہے ترے نام سے گلشن میں بہار

(۲)

تو ہند میں ہے ملکِ سخن کا بانی
ہے زیب تجھے خسروی و سلطانی
ایران میں سکّے کا چلن ہے تیرے
تھا تیرا لقب مہد میں بھی خاقانی

(۳)

ہے عشق ترے خاتمِ ہستی کا نگین
دیپک کی طرح سانس ہے آتش آگیں
تو شیخ میں اس طرح فنا ہے خسرو
ہیں تجھ میں فنا جیسے نظامؔ حق ہیں

جگن ناتھ آزاد

اَلسّلام اے شاعرِ روشن دل و روشن ضمیر
اَلسّلام اے کاروانِ عشق و مستی کے امیر

اے امیرِ ملکِ معنی، خسروِ دنیائے شعر
تیرے سوزِ دل سے تاباں چہرۂ زیبائے شعر

تاجدارِ کشورِ الفاظ و اسلوب و بیاں
دل ترا گنجینۂ معنی ہے لب گوہر فشاں

سرزمینِ ہند کے اے نے نوازِ پاک زاد
آج بھی تیری غزل میں ہے نہاں دل کی کشاد

اے بہارِ رنگ و بوئے بوستاں تجھ پر سلام
اے وقارِ کشورِ ہندوستاں تجھ پر سلام

ذات تیری بہرِ دیں مال و دولت کی کفیل
"نعم مال صالح" ہے گفتۂ پاکِ رسول

عام اہلِ زر سے اونچا تھا کہیں پایہ ترا
درحقیقت فقر کی دولت تھا سرمایہ ترا

فقر یعنی اک نگاہِ راہ بیں، اک زندہ دل
روح آزاد و علائق، جسم اسیرِ آب و گِل

فقر یعنی مستیِ کردار و تسلیم و رضا
دوسرے الفاظ میں گویا متاعِ مصطفےٰ

بسکہ مبنی فقر ہی پر تھی تری تطہیرِ فکر
نور کا پیکر غزل میں ہے تری تعمیرِ فکر

آشنائے رازِ ہستی، واقفِ ہر خیر و شر
دل کی دنیا ہے ترے افکار سے زیر و زبر

صبر کا شیشہ تری ضربِ سخن سے ریز ریز
تیرے نغمے سے گریبانوں میں پیدا رستخیز

جب تڑپ اٹھتا ہے تیرے شعر پر جذبِ دروں
کم نظر اس کو سمجھتے ہیں فقط جوشِ جنوں

فلسفے والے نہ سمجھیں گے کبھی یہ رازِ دل
گوشِ ظاہر تک پہنچتی ہے کہاں آوازِ دل

خاکِ تیرہ کو سراپا نور کر دیتا ہے تو
پردۂ انوار میں مستور کر دیتا ہے تو

روح یوں پاتی ہے تیرے فیض سے سوزِ دروں
مہر سے جس طرح پاتی ہے رگِ گل موجِ خوں

سید غلام سمنانی

ترے ہی ذکر سے، یہ نظم و اہتمامِ سخن — ترے ہی حرف سے، شیریں ہوا ہے کامِ سخن
سپہرِ شعر ہوا، تجھ سے مطلعِ انوار — تو شمعِ بزمِ سخن ہے، تو مہرِ بامِ سخن
کہا ہے ژرف شناسانِ شعر نے تجھ کو — خدیوِ مملکتِ شاعری، امامِ سخن
ترے خیال سے، آرائشِ رخ و گیسو — تجھی سے صبحِ سخن ہے، تجھی سے شامِ سخن
ہے ترے ذکر سے معمور، محفلِ شیراز — بلند تجھ سے ہوا کس قدر مقامِ سخن
کسی کا فیض نظر ہے شریک حال ترا — ملی ہے تجھ کو جو یہ دولتِ دوامِ سخن
تری بہارِ سخن، گل فروشِ دشت و چمن — ہر اک دیار پہ برسا، ترا غمامِ سخن
ہے تری بزم میں، پاکوب، شاہدِ معنی — ہے ترے قدموں میں، محبوبِ لالہ فامِ سخن

وہ

ہر ایک تار ہے سازِ سخن کا، زخمہ فریب — نہ اعتبارِ سخن ہے، نہ احترامِ سخن
ہیں جرعہ خوار ترے کب سے تشنہ و محروم — نہیں ہے کوئی جو گردش میں لائے جامِ سخن

اُٹھ اور اپنے اس اعجازِ خسروی سے ذرا
درست، از سرِ نو، کر دے تو نظامِ سخن

سلام مچھلی شہری

O

زمیں پر اگر دیوتا کچھ نہ ہوتے تو انساں شاید پریشان ہی رہتا
نظارے تو ہوتے بہاریں تو ہوتیں مگر گلشن فکر ویران ہی رہتا

حقیقت کا مفہوم واضح نہ ہوتا اگر دلنشیں کلپنائیں نہ ہوتیں
کوئی خاص منظر نکھر ہی نہ پاتا جو اس کے لئے کچھ فضائیں نہ ہوتیں

حقیقت کی ان ضوفشاں منزلوں میں، حسین خواب اب مسکرانے لگے ہیں
بزرگوں نے جو دیپ روشن کئے تھے وہی دیپ پھر جگمگانے لگے ہیں

کلا اور سنگیت کے دیپ پھر سے مقدس فضاؤں میں جلنے لگے ہیں
زہے عہد حاضر کہ حافظ کے بربط پہ میرا کے نغمے مچلنے لگے ہیں

مبارک کہ وادیٔ گنگ و جمن میں کلا کو نئی زندگی مل رہی ہے
مبارک کہ پھر طوطیٔ ہند خسرو کے افکار کی روشنی مل رہی ہے

نئی روشنی میں نئے تاج محلوں، اجنتاؤں کا جنم ہونے لگا ہے
ہمارے کلا مندروں سے قریب آج پھر پیار کا دھرم ہونے لگا ہے

ملی ہے ضیاء بار تعبیر جس کی وہی خواب پہلے بھی دیکھا گیا تھا
مبارک وطن کی سحر کہہ رہی ہے کہ آفتابوں کا اک سلسلہ تھا

شمیم کرہانی

○

مرحبا، خسروِ نواگستر — طوطیِ ہند، نغمہ سنجِ بہار
ذہنِ خلاق کا ہر ایک عمل — فکر و معنی کا قافلہ سالار
رزم میں بے عدیل ترکِ جری — بزم میں بے نظیر موسیقار
مصحفِ نظم، رونقِ گلشن — صفحۂ نثر، غیرتِ گلزار
اس کی ہر بیت، اک شگوفۂ زر — اُس کا ہر شعر، اک دُرِ شہوار
ہر رباعی میں زندگی کے رموز — ہر پہیلی میں ذہن کے اسرار
غزل اس کی لطیف تر ایسی — جیسے پھولوں کی نرمیِ رخسار
کافرِ عشق و صوفیِ صافی — بندۂ حق پرست و سجدہ گزار
عارضِ فن پہ غازہ و تابش — چہرۂ زندگی پہ گرد و غبار
بزمِ حرف و سخن میں نغمہ سرا — عشقِ محبوبِ حق میں سینہ فگار
اہلِ ایراں کو اعتبار آیا — ایسا محکم زبان کا معیار
بند راحت کے راستے لیکن — منکشف دو جہان کے اسرار
سرزمینِ وطن میں جذب ہوا — ایسا رکھتا تھا خاکِ ہند سے پیار

تجھ پہ اربابِ فکر و فن کا سلام
قصرِ اُردو کے اوّلیں معمار

بشیرالنساء بیگم بشیر

○

اے عندلیب خوش نوا پروانۂ نظامِ دیں روحانیت نواز ہے تیرا کلامِ دل نشیں
سلسلۂ نظامیہ ہے داستانِ خسروی

مردِ حقیقت آشنا تھا آستاں پہ ہر گماں اور وارداتِ قلب تھے شیخِ طریق پر عیاں
کس درجہ ناز آفریں تھا امتحانِ خسروی

دل ایک ہی نگاہ میں محرمِ راز بن گیا اور اک کبوترِ حزیں دم بھر میں باز بن گیا
عشق کی ایک جست میں بدلا جہانِ خسروی

درویشِ بے مثال تو شاعرِ بے نظیر تو نازشِ خانقاہ تو نورِ نگاہِ پیر تو
فقر کی آن بان پر قائم ہے شانِ خسروی

ہند و تتار و پارس کو شیر و شکر بنا دیا سب کی زباں سے تو نے اک جادو نیا جگا دیا
اردو زباں کی جان ہے اب تک زبانِ خسروی

فرما رہا ہے پیر ہی شان میں یہ مرید کی من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
محبوبِ حق کی جان تھی لاریب جانِ خسروی

دامودر زکی

○

خوبی و خلق کا حسیں پیکر — علم و فن کے کمال کا منظر
شاعرِ بے مثال، شیریں سخن — خوش گلو راگ، تال کا ماہر
ڈھولک اور جلترنگ اور ستار — ان کا موجد "خیال" کا ماہر
عاشقِ دیں و صاحبِ عرفاں — تھا دلِ اولیا میں جن کا گھر
مہرباں جن پہ تھے نظام الدینؒ — اور شکستوں کا تھا یہاں نہ گذر
حسنِ الفت، خلوص کی تصویر — دین و ایماں کی روح کا منظر
گو دیں جس کی گر ریاست کے — ہو رہے تھے جوان پل پل کر
زینتِ کیف و آبروئے سپاہ — زینتِ بزم و آبروئے ہنر
سب کی نظروں میں قدر کے قابل — سب کے دل میں بنا ہے جن کا گھر
ایک اوجِ مزاج دانی وہ — جس سے واقف تھے سارے اہلِ نظر
اور درباریاں دن رات — جن پہ کرتی رہی تھیں فخر اکثر
جن پہ ہر دل عزیزیاں تھیں نثار — اور محبت کو ناز تھا جن پر
وضع داری کو عشق تھا جن سے — پیار خودداریوں کو تھا یکسر

فیض پاتے تھے سب بقدرِ ظرف
ایک جا جمع تھے بہت سے ہنر

شہباز صدیقی امروہوی

O

اے امیرِ نامور اے خسروِ عالی وقار صدرِ بزمِ عارفاں، ملکِ سخن کے شہریار
علم و عرفاں کا ہے تو دریائے ناپیدا کنار حکمت و دانش کو تیری ذات پر ہے افتخار
تیرا ثانی کم ہی دیکھے گی یہ دنیا اب کہیں
"عمرہا باید کہ خسرو روزگار آید چنیں"

گرم ہے تیرے نفس سے محفلِ شعر و سخن شاعروں کی مجلسوں میں تو ہے صدرِ انجمن
زمزموں میں ہے ترے وہ طرفگی و بانکپن دم بخود ہے جن کو سن کر طوطیٔ شکر شکن
چہکے بلبل کیا تری رنگیں بیانی دیکھ کر
خوش نوائی، نغز گوئی، نغمہ خوانی دیکھ کر

جملہ اصنافِ سخن پر ہے ترا انعام عام مرثیہ، قطعہ، رباعی میں ہے نامی تیرا نام
انوری کا تجھ کو حاصل ہے قصیدہ میں مقام عطر آگیں ہے غزل سے تیری سعدی کا مشام
تیرا خمسہ جو نظامی کے ہے خمسہ کا جواب
آج تک ہے بے ہمال ولاعدیل ولاجواب

ہر پہیلی ہے تری طبعِ رسا کا شاہ کار تیرے دوسخنے ہیں گویا زعفراں کے کشت زار
تیری انملیاں دکھاتی ہیں جدا اپنی بہار کہہ مکرنی کا تری کہہ کر مکرنا ہے شعار
کس قدر دل چسپ ہے پنگھٹ پہ تیرا وہ ڈھول
جس میں باہم ہیں جتن سے چرخا، کتا، کھیر، ڈھول

مرثیہ قاآن کا تو نے لکھا وہ درد ناک — قلبِ بلبن ہوگیا فرطِ الم سے چاک چاک
پھاڑ کر جیب و گریباں ڈالی فرق و رخ پہ خاک — ہوگیا آخر جواں فرزند کے غم میں ہلاک
واہ وا گفتار میں تیری اثر کا یہ کمال
راست تو یہ ہے اسی کا نام ہے سحر حلال

شاعری پر تیری کیوں نازاں نہ ہو ہندوستاں — ذات سامی ہے تری معروف و مشہورِ جہاں
مستند اس درجہ تیری فارسی ہے بے گماں — لیتے ہیں اشعار سے تیرے سند اہلِ زباں
مرزا غالب جو کسی ہندی کا قائل ہی نہیں
خاک پر گھستا ہے تیرے روبرو لوحِ جبیں

تو نے فلکِ ہند میں اردو کی ڈالی داغ بیل — فارسی، ہندی کا آپس میں کرایا خوب میل
ابتدا میں شغل تیرا گو نظر آتا تھا کھیل — لیکن آخر میں منڈھے چڑھ ہی گئی بولی کی بیل
ہندوی و ریختہ بنتی ہوئی اردو بنی
جو کرے ہر قلب کو تسخیر وہ جادو بنی

گائکی کے فن میں اپنے عہد کا ہے تو امام — مطربانِ دہر لیتے ہیں ادب سے تیرا نام
اللہ اللہ قصرِ موسیقی میں تیرا یہ مقام — راگنی لونڈی ہے تیری راگ ہے تیرا غلام
باابد بھی تیرے آگے بار پا سکتا نہیں
تان کوئی تان سین اپنی لگا سکتا نہیں

مختلف آلات موسیقی ہیں تیری یادگار — تیری ہی ایجاد کا ثمرہ ہے طبلہ اور ستار
آئی تیری سعی سے نغمہ نوازی میں بہار — تیرے ممنونِ کرم ہیں مطربانِ روزگار
سرنگوں تھے راگ کے طائر جو فرشِ خاک پر
پر سے سم اور تال کے اڑنے لگے افلاک پر

سینۂ شفاف تیرا "مخزنِ اسرار" ہے — روئے جاں افروز تیرا مطلع انوار ہے
قلب تیرا نورِ ایماں سے تجلی زار ہے — چشم تیری بادۂ دیدار سے سرشار ہے
نورِ حق سے سربسر معمور ہے تیرا دماغ
خانۂ عرفاں کا تو ہے ایک تابندہ چراغ

گوناگوں اوصاف کا ہے ذات میں تیری قرآں فقر کا انداز ہے شانِ امارت سے عیاں
مرحبا یہ عسرت و عشرت کا دوگونہ سماں دلقِ درویشی بھی ہے ملبوس شاہی میں نہاں
بارگاہوں میں کبھی شاہوں کا تو دمساز ہے
خانقاہوں میں کبھی ولیوں کا تو ہمراز ہے

جب ہوئی صحبت نظام الدین کی تجھکو نصیب جاگ اٹھے برکت سے انکی تیرے خوابیدہ نصیب
رفتہ رفتہ ہوگیا مرشد سے تو اتنا قریب تجھ کو محبوب الٰہی نے کہا اپنا حبیب
شیر و شکر پھر تو ں مطلوب اور طالب ہوئے
اہل باطن کہہ اٹھے یکجان دو قالب ہوئے

جرأت وہمت یہ تیری حبذا اصلِ علاٰ دین کی خدمت بھی کی دنیا سے مطلب بھی رکھا
معرفت کی راہ میں ہر مرحلہ بھی طے کیا شغل میں تصنیف کے بھی محو روز و شب رہا
کام لے کر آخر اپنے خسروی اعجاز سے
لکھے ملفوظاتِ مرشد دل ربا انداز سے

بزم اہل حال میں ہوتا ہے جب تو نغمہ زن وجد کے عالم میں آجاتی ہے ساری انجمن
نشہ ہوجاتا ہے دنیا کی محبت کا ھرن دل کو لگ جاتی ہے معشوقِ حقیقی کی لگن
تیرا نغمہ اس لئے تاثیر سے خالی نہیں
شرع کے حلقہ سے باہر تیری قوالی نہیں

الفت پیر طریقت میں نہ تھا تیرا جواب مرگ مرشد کی خبر سن کر نہ آئی تجھ کو تاب
چل کے بنگالہ سے پہنچا شہر دہلی میں شتاب تربت محبوب پر گریاں رہا مثلِ سحاب
چھ مہینے شور وشیون کر کے ساکت ہوگیا
چادر خاکی میں اپنا منہ چھپا کر سوگیا

مصوّر سبزواری

○

یہ کون شمعِ تصوّف جلا کے چھوڑ گیا — کہ جگمگا گئی شاموں کو شام پٹیالی
دیا تو ایک سرِ رہگذر جلا تھا مگر — سمیٹ لایا تھا صدیوں کی دیوالی
مہک مہک گئے تاریخ کے ورق جس سے — نہ تھا وہ ظلِ سلاطینِ تغلق و خلجی
وہ کوئی نکہتِ بے قید بوئے آوارہ — چلی تو ساری ہوائیں بنا دیں سودائی
چراغِ گل کہ گل روشنی کہو اُس کو — وہ رنگ و نور ہی اک دن امیر خسرو بنا
رہِ سلوک و طریقت میں اس کا پہلا قدم — تمام بیتی ہوئی منزلوں سے آگے تھا
جو دن میں بنتا تھا عکسِ جلالِ سلطانی — وہ شب میں گیسوئے سلطان الاولیا بھی رہا
بہ ایں جمالِ بصیرت بہ حُسنِ دامنِ شوق — بہت کٹھن تھی ڈگر اس کے حق میں پنگھٹ کی
اسی حبیب کی خاطر کئے تھے سولہ سنگھار — اسی نظام نے رکھی تھی لاج گھونگٹ کی
وہ شاعری تھی کہ شیراز و اصفہان کا دل — جبینِ ہند پہ سجدے ہیں اہلِ فارس کے
وہ ہندی دوہے پہیلی وہ کہہ مکرنی کا فن — ہزار جھانکتے آنچل سے چاند اماوس کے
وہ بھیرویں وہ حسیں راگنی وہ سُر سرگم — کہ رستے دھارے گلے سے نکلتے سب رس کے
کلام چارۂ سفاکیٔ جہاں اس کا — خموشی پردۂ دشتِ سکونِ جاں اُس کا
حریمِ نیم شبی میں وہ شعلۂ آواز — نوائے سوزِ جگر شمع اور دھواں اس کا

ادب تصوّف و نغمہ یہ احترام کریں
کہ آستانۂ خسرو کو سب سلام کریں

سید مرغوب امین کاظمی امروہوی

O

وہ ترکستان کے لاچینی قبیلہ کا دُر یکتا
بلخ کی دل کشا بستی ہزارہ میں ہوا پیدا

تھا نام اُس کا امیر سیف الدین محمود نیک اختر
سیاست میں، تدبّر میں نہ تھا اس کا کوئی ہمسر

بہالایا اسے ہندوستاں میں سیل تاتاری
سکونت کو ضلع ایٹہ میں پٹیالی پسند آئی

یہ شمس الدین التمش کا دورِ حکمرانی تھا
یہ دورِ اہلِ ہنر کے حق میں دورِ دُر فشانی تھا

ہوا اس کے تدبّر کا جو چرچا بزمِ یاراں میں
رسائی ہو گئی موصوف کی دربارِ سلطاں میں

ملا سلطانِ عالیجاہ کو جب گوہرِ یکتا
لیا دامانِ رحمت میں بڑھایا مرتبہ اس کا

مدد کی ہر طرح سلطاں کی توسیعِ ریاست میں
ترقی مملکت نے خوب کی اس کی معیت میں

ولیٔ باصفا حضرت عماد الملک کی دختر
امیر سیف الدین کے عقد میں آئی جواں ہو کر

ہوئے اس کے بطن سے تین لڑکے نیک خو پیدا
وہ عز الدین، یمین الدین، حسام الدین گلِ رعنا

ہوئے پیدا یمین الدین چھ سو اکاون میں
مطابق عیسوی سن کے وہ بارہ سو ترپن میں

محلہ میں قریب ان کے کوئی مجذوب رہتے تھے
جناب سیف اس ہستی سے بیحد انس رکھتے تھے

ہوئے پیدا یمین الدین تو ان کو گود میں لے کر
چلے حضرت کی خدمت میں دعائے خیر کی خاطر

لیا آغوش میں، دے کر دعائے خیر فرمایا
"یہ خاقانی سے آگے شاعری میں دو قدم ہوگا"

یہی بچہّ، یمین الدین، امیر خسرو کہلایا
سخن گوئی و موسیقی میں اعلیٰ مرتبہ پایا

تھے چار ہی سال کے خسرو کہ انکے والدِ اطہر
پئے تعلیم اپنے ساتھ دھلی لے گئے اکثر

طلب کے ساتھ ہی ذوقِ حصولِ علم تھا کامل
اسی باعث اوائل عمر ہی میں ہو گئے فاضل

شغف تھا شعر و موسیقی سے زیادہ فطرتاً ان کو
کہے اشعار موزوں سات سالہ عمر میں دیکھو

ابھی نو سال ہی کے تھے کہ والد نے لڑائی میں
بڑی مردانگی سے جان دی شہ کی حمایت میں

عمادالملک نے لی اپنے ذمہ تربیت ان کی
یہاں حضرت نظام الدین کی صحبت ملی ان کو
عمادالملک بارہ سو تہتر میں ہوئے واصل
وہ ہمدرد مساکیں، منکسر، صوفی منش خسرو
رفاقت میں، حمایت میں، سخاوت میں، مروت میں
خوشش اخلاقی و ہمدردی، مساوات وصلح جوئی
ان اوصاف حمیدہ سے رہا متصف ایدل
انھیں اوصاف کے باعث امیر و شاہ و شہزادے
رہے دو سال تک خسرو ملک چھجو کے درباری
کیا بارہ سو چوراسی میں منگولوں نے اک حملہ
محمد کی شہادت پر لکھا اک مرثیہ ایسا
پھر اس کے بعد سرجاندار نے ان کو بلا بھیجا
اسی کے نام پر تخلیق کی ہے اسپ نامہ کی
ہوا رونق فزا جب کیقباد اورنگ شاہی پر
نوازش کی، ملک الشعرا کا بخشا خطاب ان کو
وزاں پس قتل کیقباد، شمس الدین کیومرث
مربی و اتالیقی میں اس کمبخت کو لے کر
دیا خسرو کو اس نے پہلے مصحف دار کا عہدہ
جلال الدین کے جنگی کارناموں پر یہ چھوٹی سی
ہے جسکی حیثیت اب تک بھی تاریخ و سیاست میں
علاؤالدین و قطب الدین مبارک شاہ نے پیہم
دلیل بے ضمیری پیشۂ دربار داری تھا
نظر دربار کے ماحول پر رکھتے تھے اکثر
انھیں الفت تھی ہر دم زیست کے اقدار اعلیٰ سے

علوم ظاہری کے ساتھ دی تعلیم باطن بھی
بالآخر بیعت کر کے دیدیا دل پیر کامل کو
اور اس کے بعد خسرو کو ہوئی فکر معاش ایدل
تعصب سے بری حضرت نظام الدینؒ کے پیرو
وہ یکتائے زمانہ تھے شجاعت میں، سیاست میں
ذہانت، دینداری، بذلہ سنجی، نغمہ آرائی
عوام و خاص میں ہوتی نہ کیوں مقبولیت حاصل
مصاحب، میر خسرو کو بنا لینے کے خواہاں تھے
کرلی، بعد اس کے بغرا و محمد کی مصحف داری
شہادت پائی شہزادہ محمد نے سبحان اللہ
ہوا جس کا جہانِ علم و فن میں ہر طرف چرچا
بڑھائی عزت و حرمت، ندیم خاص فرمایا
فقید المثل یہ تصنیف ہے اپنے زمانہ کی
لکھائی "قران السعدین" مثنوی خسرو سے خوش ہوکر
ندیم خاص فرمایا، نوازا بے حساب ان کو
برائے نام تھا سلطان و تخت و تاج کا وارث
جلال الدین خلجی نے سنبھالا اقتدار آخر
پھر اس کے بعد امارت دے کے اونچا کر دیا درجہ
لکھی ہے مثنوی خسرو نے مفتاح الفتوح ایسی
ادب میں خوب تر ہے یہ تولاثانی صداقت میں
جناب میر خسرو کی رکھی وہ حیثیت قائم
ملی عزت کہ خسرو کا رویہ بردباری تھا
نہ تھے وابستگی یک رخہ کے قائل و خوگر
اسی باعث تو ان کی زندگانی میں تنوع ہے

رکھی شاہانِ دہلی نے عنایت کی نظران پر ۔۔۔ وجہ یہ تھی کہ وہ پہچانتے تھے شاہ کے تیور
نہ رکھتے تھے کبھی باہر قدم حدِ امارت سے ۔۔۔ ابھرنا جانتے تھے ڈوب کر بحرِ سیاست میں
بظاہر منہمک دربار داری میں رہے خسرو ۔۔۔ مگر تھے اصل میں وہ معرفت کی راہ کے رہرو
سلاطین کو فرائض سے کیا کرتے تھے وہ آگاہ ۔۔۔ نمائندہ تھے وہ حضرت نظام الدین کے درگاہ
سلاطیں سے عوام الناس کی حاجت روائی کو ۔۔۔ روا مرشد کے کہنے پر رکھا مدحت سرائی کو
مشن حضرت نظام الدین کا پورا کیا جس نے ۔۔۔ سلاطین کو غریبوں کا کیا حاجت روا جس نے
بہت ہی ناز تھا حضرت کو ان کی ذات والا پر ۔۔۔ بہت مسرور ہو ہو کر کہا کرتے تھے اکثر
جو پوچھے گا خدا روزِ جزا لایا ہے کیا تحفہ ۔۔۔ تو کہہ دوں گا یہ خسرو ہے مرے اعمال کا ثمرہ
ہوئی تیرہ سوپچیس میں نظام الدینؒ کی رحلت ۔۔۔ سیہ پوشی میاں خسرو کی آخر ہو گئی قسمت
نہ تھی تابِ جدائی چھ مہینہ بعد ہی آخر ۔۔۔ چلا سوئے عدم وہ فارسی کا بے بدل شاعر
تھی ان کو جملہ اصنافِ سخن پر دسترس حاصل ۔۔۔ مگر غزلیں ہیں ان کی بے پناہ تاثیر کی حامل
زباں ہے مستند، طرزِ ادا ہے دلکش و زیبا ۔۔۔ سلاست اور روانی میں ہیں اک بہتا ہوا دریا
کلام حیران کن شہ کار ہے اوجِ تخیل کا ۔۔۔ جسے پڑھ کر پتہ چلتا ہے معراجِ تعقل کا
فقط وہ فارسی کے ہی نہیں تھے شاعرِ خوش گو ۔۔۔ وہ ہیں اردو کے خالق اور پہلے شاعرِ پر گو
کریں ہم جس قدر بھی ناز ان کی ذات والا پر ۔۔۔ بجا ہے، راست ہے، زیبا ہے اے مرغوب نیک اختر

سلام اے طوطیٔ ہندوستاں اے شاعرِ خوش گو
سلام اے خسروِ ملک صفا، اسلام کے پیرو

فضیلت مآب فخر الدین علی احمد صاحب
صدر جمہوریہ ہند بین الاقوامی امیر خسرو
سیمینار کے افتتاح کے لئے تشریف
لاتے ہوئے۔
امیر خسرو یادگار کمیٹی کے اراکین
جناب نورالحسن صاحب وزیر تعلیم صدر
جناب یونس سلیم صاحب۔ ایم۔ پی
نائب صدر اور جناب حسن الدین احمد
صاحب سکریٹری آپ کے ساتھ ہیں

نیچے
نذرِ خسرو کی رسمِ اجرا
پروفیسر ایس۔ ایس۔ ہانبہ اپنی
تالیف نذرِ خسرو کی جلد صدر جمہوریہ
کو پیش کرنے کے بعد مصافحہ
کر رہے ہیں۔

Punjab Wakf Board's Publication

The AUKAF Quarterly

50, Sardar Patel Marg, AMBALA Cantt.